

فکشن ہاؤس

لوگوں کو سوچنے دو

برٹرینڈرسل

ترجمہ: قاضی جاوید

لوگوں کو سوچنے دو

برٹرنڈ رسل

ترجمہ و تالیف: قاضی جاوید

فکشن ہاؤس
لاہور • حیدرآباد • کراچی •

نام کتاب	:	لوگوں کو سوچنے دو
مصنف	:	برٹرینڈ رسل
ترجمہ و تالیف	:	قاضی جاوید
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس، لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2015ء
قیمت	:	-/350 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ-68 مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-1-37249218

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

میرا ایمان

انسان فطرت کا حصہ ہے۔وہ کوئی ایسا وجود نہیں جو فطرت سے متصادم ہو۔اس کے خیالات اور جسمانی حرکات انہی قوانین کے پابند ہیں جو ستاروں اور ایٹموں کی حرکات کی توضیح کرتے ہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان کے مقابلے میں مادی دنیا بہت بڑی ہے......وہ اس سے بھی بڑی ہے جتنی کہ دانتے کے زمانے میں سمجھی جاتی تھی۔خیر وہ اتنی بڑی بھی نہیں جتنی کہ ڈیڑھ سو سال پہلے خیال کی جاتی تھی۔لگتا ہے کہ اس کو سمجھنے کی کوششوں میں سائنس اپنی حدود کو پہنچنے والی ہے۔یہ سمجھا جاتا ہے کہ کائنات لامتناہی نہیں بلکہ محدود ہے اور چند کروڑ برسوں میں روشنی اس کے گرد چکر مکمل کر سکتی ہے۔یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ مادہ الیکٹرونز اور پروٹونز پر مبنی ہے۔ان کا حجم محدود ہے اور دنیا میں ان کی تعداد متناہی ہے۔غالباً ان کی تبدیلیاں اس طرح مسلسل نہیں ہیں جس طرح پہلے سمجھا جاتا تھا۔ان کی پیش رفت جھٹکوں کی صورت میں ہوتی ہے اور ان کی ہر جست ایک خاص حد تک کم از کم جست سے کم نہیں ہوتی۔بظاہر ان تبدیلیوں کے قوانین کو چند ایک بہت عمومی اصولوں کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔جب دنیا کی تاریخ کا کوئی مختصر حصہ علم میں آجائے تو پھر یہ عمومی اصول اس کے ماضی اور مستقبل کا تعین کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے طبعی سائنس اس مرحلے کو پہنچ رہی ہے جب وہ مکمل ہو جائے گی اور یوں غیر دلچسپ ہو کر رہ جائے گی۔الیکٹرونز اور پروٹونز کی حرکت کے قوانین ہم کو معلوم ہو جائیں تو باقی صرف مقام نگاری ہی رہ جاتی ہے.....اس سے مراد خصوصی واقعات کا مجموعہ ہے جو دنیا کی تاریخ کے کسی حصے میں ان کی [illegible] کیفیت سے آگاہ کرتی ہے۔دنیا کی تاریخ کا تعین کرنے کے لئے درکار مقام نگاری کے واقعات کی مجموعی تعداد غالباً محدود ہے۔کم از کم نظری طور پر ان سب کو ایک بڑی کتاب میں درج کیا جاسکتا ہے۔اگر ہم حسابی مشین کو اس سے منسلک کر دیں تو محض اس کا

ہینڈل گھمانے سے وہ حقائق بھی معلوم ہو جائیں گے جو ریکارڈ میں نہ آ سکے تھے۔اس سے زیادہ بے لطف یا نامکمل دریافت کی جوشیلی مسرت سے زیادہ مختلف شے کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔یہ تو ایسے ہی ہے کہ کسی اونچے پہاڑ پر چڑھا جائے اور اس کی چوٹی پر ادرک بیئر فروخت کرنے والے ایک ریسٹورنٹ کے سوا کچھ نہ ملے اور یہ ریسٹورنٹ دھند میں گھرا ہو مگر وہاں وائرلیس بھی موجود ہو۔

یہ طبعی دنیا غیر دلچسپ ہے اور انسان اس کا حصہ ہے۔دوسرے مادے کی طرح انسانی جسم بھی الیکٹرونز اور پروٹونز پر مشتمل ہے اور وہ مادے کی دوسری صورتوں کا تعین کرنے والے قوانین کا پابند بھی ہے۔بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ عضویات کے علم کو کبھی بھی طبیعیات میں ضم نہیں کیا جا سکتا۔مگر ان کے دلائل زیادہ متاثر کن نہیں ہیں۔یہ فرض کرنا زیادہ معقول لگتا ہے کہ وہ لوگ غلطی پر ہیں۔جس شے کو ہم اپنے ''خیالات'' قرار دیتے ہیں وہ دماغ کی راہوں کی تنظیم پر ویسے ہی منحصر ہوتے ہیں جس طرح سفر سڑکوں اور ریلویز پر منحصر ہوا کرتے ہیں۔لگتا ہے کہ سوچ کے عمل میں استعمال ہونے والی توانائی کیمیائی قسم کی ہوتی ہے۔چنانچہ مثال کے طور پر، جسم میں آئیوڈین کی کمی واقع ہو جائے تو اچھا بھلا ہوشیار آدمی بھی احمق بن جاتا ہے۔ذہنی مظاہر جسمانی ڈھانچے سے بندھے ہوتے ہیں۔اگر واقعی ایسا ہے تو پھر ہم یہ فرض نہیں کر سکتے کہ کوئی اکیلا الیکٹرون یا پروٹون ''سوچ'' سکتا ہے۔یہ تو ویسے ہی ہے جیسے ہم یہ توقع کریں کہ کوئی تنہا شخص فٹ بال کا میچ کھیل سکتا ہے۔اسی طرح ہم یہ بھی فرض نہیں کر سکتے کہ کسی شخص کی سوچ کا عمل اس کی موت کے بعد بھی جاری رہ سکتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ موت دماغ کی تنظیم و ترتیب کو برباد کر دیتی ہے۔اس سے وہ توانائی بھی منتشر ہو جاتی ہے جو سوچ کے لیے دماغ کی راہوں کو بروئے کار لاتی ہے۔

خدا اور بقا مذہب کے دو بنیادی عقائد ہیں۔سائنس میں ان دونوں کی کوئی تائید نہیں ملتی۔اچھا، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں عقائد مذہب کے لیے ناگزیر ہیں۔بدھ مت کی مثال ہمارے سامنے ہے۔اس مذہب میں یہ دونوں عقائد نہیں پائے جاتے۔(جہاں تک بقا کا تعلق ہے غیر مشروط انداز میں یہ بیان مغالطہ آمیز ہو سکتا ہے مگر حتمی تجزیئے میں یہ درست ہے۔) بہر حال مغرب میں ہم لوگ ان عقائد سے دست بردار نہ ہوں گے کیونکہ یہ دونوں عقائد خوشگوار ہیں۔یہ ویسے ہی خوشگوار ہیں جیسے کہ ہم اپنے آپ کو نیک اور پارسال خیال کرتے ہیں اور اپنے دشمنوں

کے بارے میں ہماری رائے یہ ہوتی ہے کہ وہ سراسر بدی کا مجسمہ ہیں۔لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے ان کا کوئی جواز دکھائی نہیں دیتا۔میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میں یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔بالکل اسی طرح میں یہ بھی ثابت نہیں کرسکتا کہ شیطان محض ایک افسانہ ہے۔ممکن ہے کہ مسیحی خدا وجود رکھتا ہو۔اولمپس،قدیم مصر یا بابل کے دیوتا بھی وجود رکھ سکتے ہیں۔یہ سب ایک جیسے مفروضے ہیں۔ان میں سے کوئی بھی دوسرے سے زیادہ قابل یقین نہیں ہے۔بات یہ ہے کہ یہ سب امکانی علم کی حد سے خارج ہیں۔میں اس موضوع پر زیادہ کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ میں پہلے ہی اپنی کتاب ''لائبنیز کا فلسفہ'' میں اس پر بحث کرچکا ہوں۔

انفرادی بقا کا مسئلہ قدرے مختلف نوعیت کا حامل ہے۔اس کی تائید یا مخالفت دونوں طرف کی شہادت سے ممکن ہوسکتی ہے۔افراد روزمرہ کی دنیا کا حصہ ہیں۔سائنس کا تعلق اسی دنیا سے ہے۔علاوہ ازیں ان کے وجود کا تعین کرنے والی شرائط قابل دریافت ہیں۔پانی کا کوئی قطرہ لافانی نہیں۔اس کو آکسیجن یا ہائیڈروجن میں تحلیل کیا جاسکتا ہے۔لہٰذا اگر کوئی قطرہ یہ دعویٰ کرے کہ اس میں پانی پن کی کوئی ایسی صفت ہے جو اس کے تحلیل ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے تو پھر ہم کو شک میں مبتلا ہو جانا چاہیے۔اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ دماغ لافانی نہیں ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی زندہ جسم کو منظم توانائی موت کے ہاتھوں غیر متحرک اور جامد ہو جاتی ہے۔لہٰذا وہ اجتماعی عمل کے لیے دستیاب نہیں رہتی۔تمام شہادتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ جس شے کو ہم اپنی ذہنی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں وہ دماغ کے ڈھانچے اور منظم جسمانی توانائی کی محتاج ہے۔گویا معقول مفروضہ بس یہ ہے کہ جسمانی زندگی کے خاتمے سے ذہنی زندگی بھی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔یہ دلیل حتمی نہیں، محض احتمال ہے مگر ان دلائل جتنی مضبوط ضرور ہے جن پر اکثر سائنسی نتائج مبنی ہوتے ہیں۔

اس نتیجے پر کئی حوالوں سے انگلی اٹھائی جاسکتی ہے۔نفسی تحقیق کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس بقا کے حق میں حقیقی سائنسی شہادت موجود ہے۔اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک اصول کا تعلق ہے نفسی تحقیق کا طریقہ کار سائنسی طور پر درست ہے۔اس قسم کی شہادت اس قدر قوی ہوسکتی ہے کہ سائنسی مزاج رکھنے والا کوئی شخص اس کو مسترد نہ کر سکے۔تاہم شہادت کو دیا جانے والا وزن بقا کے مفروضے کے مقدم احتمال پر مبنی ہونا چاہیے۔مظاہر کے کسی بھی مجموعہ کی توضیح کئی مختلف حوالوں

سے ممکن ہوا کرتی ہے۔ ہم کو ان میں سے اس حوالے کو ترجیح دینی چاہیے جو مقدمی اعتبار سے سب سے کم غیر اغلب ہوتا ہے۔ جو لوگ یہ سوچنے کا میلان رکھتے ہیں کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے وہ اس نظریے کو نفسی مظاہر کی بہترین تشریح کے طور پر قبول کر لیں گے۔ بعض دوسری وجوہ کی بنا پر اس نظریے کو نا معتبر سمجھنے والے لوگ دیگر توضیحات کی تلاش شروع کر دیں گے۔ اچھا، جہاں تک میرا تعلق ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ نفسی تحقیق نے بقا کے حق میں اب تک جو شہادت اکٹھی کی ہے وہ فنا کے حق میں عضویاتی شہادت کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ پھر بھی میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ آئندہ کبھی نفسی شہادت زیادہ مضبوط ہو سکتی ہے، ایسا ہوا تو پھر موت کے بعد زندگی میں یقین نہ رکھنا غیر سائنسی طرز فکر قرار پائے گا۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جسمانی موت کے بعد بھی زندہ رہنا بقا یا ابدیت سے مختلف قسم کا معاملہ ہے۔ اس کا مطلب نفسی موت کی تاخیر بھی ہو سکتا ہے۔ گویا ایک فرد کی جسمانی موت کے بعد بھی، کچھ مدت کے لیے، اس کی نفسی سرگرمی جاری رہتی ہے۔ عام لوگوں کو اس قسم کے تصور میں دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بقا، یعنی موت کے بعد زندگی کی آرزو کرتے ہیں۔ بقا میں ایمان رکھنے والے لوگ اس قسم کے عضویاتی دلائل سے مطمئن نہ ہوں گے جیسے کہ میں نے یہاں استعمال کیے ہیں۔ وہ اس بنا پر اعتراض کریں گے کہ جسم اور روح مکمل طور پر مختلف النوع ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ روح جسمانی اظہار کے ذریعے ہونے والے اپنے اظہار سے بالکل مختلف قسم کی شے ہے۔ میں اس کو مابعد الطبیعیاتی تو ہم سمجھتا ہوں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ذہن اور مادہ دونوں حتمی حقیقتیں نہیں ہیں۔ وہ تو بس چند مقاصد کے لیے سہولت بخش اصطلاحیں ہیں۔ روح کی طرح الیکٹرونز اور پروٹونز منطقی فسانے ہیں۔ حقیقت میں وہ کوئی مستقل اشیاء نہیں بلکہ ایک تاریخ، یا یوں کہیے کہ واقعات کے سلسلوں کا عنوان ہیں۔ روح کے معاملے میں یہ بات نشوونما کے حقائق سے بالکل واضح ہے۔ حمل، رحمی نشوونما اور بالک پن پر غور کیا جائے تو پھر یہ ماننا محال ہو جاتا ہے کہ روح کوئی نا قابل تقسیم شے ہے جو نشوونما کے اس سارے عمل کے دوران کامل بھی رہتی ہے۔ تب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ جسم کی طرح نشوونما کے عمل سے گزرتی ہے۔ وہ نر اور مادہ تولیدی خلیوں کی مرہون منت ہے لہٰذا اس کو تقسیم نا پذیر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مادہ پرستی نہیں ہے۔

مابعد الطبیعیات پرستوں نے روح کو ابدی ثابت کرنے کی خاطر بے شمار دلائل دیئے

ہیں۔لیکن ایک سادہ سے ٹیسٹ کے ذریعے ان تمام دلائل کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام صاحبان یکساں طور پر ثابت یہ کرتے ہیں کہ روح ہر جگہ موجود ہے۔لیکن ہم سب طویل مدت تک زندہ رہنے کے لیے جس قدر بے چین ہیں، اس قدر موٹا ہونے کے لیے آرزومند نہیں ہیں۔لہٰذا ان تمام مابعد الطبیعیات پرستوں میں سے کسی ایک نے بھی اپنے دلائل کے اس اطلاق پر کبھی توجہ نہیں دی ہے۔اس سے خواہش کی اس حیران کن طاقت کا بھی پتا چلتا ہے کہ وہ قابل ترین افراد کو بھی ان حقائق سے اندھا کر دیتی ہے جو بصورت دیگر بالکل واضح ہوتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر ہم موت سے خوفزدہ نہ ہوتے تو لافانیت اور بقا کا تصور بھی کبھی پیدا نہ ہوتا۔

انسانی زندگی کے بہت سے دوسرے امور کی طرح مذہبی عقائد کی اساس بھی خوف ہے۔ انسانوں کا انفرادی یا اجتماعی خوف ہماری اکثر سماجی زندگی پر غالب رہتا ہے۔تاہم یہ فطرت کا خوف ہے جو مذہب کو جنم دیتا ہے۔جیسا کہ ہم نے دیکھا، روح اور مادے کا تضاد محض وہم ہے۔ تاہم ایک اور تضاد بھی ہے جو اس سے زیادہ اہم ہے۔ یہ تضاد دو قسم کی اشیاء کے درمیان ہے۔ ایک طرف وہ اشیاء ہیں جو ہماری خواہشات سے متاثر ہو سکتی ہیں اور دوسری طرف وہ اشیاء ہیں جو خواہشوں سے متاثر نہیں ہوتیں...سائنس کی پیش رفت کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ چیزیں انسانی کنٹرول میں چلی آ رہی ہیں۔ پھر بھی ایسی اشیاء موجود ہیں جو انسان کے بس سے باہر ہیں۔ ان میں ہماری دنیا کے تمام عظیم الشان حقائق شامل ہیں.....یعنی اس قسم کے حقائق جو فلکیات کے موضوع ہیں صرف سطح زمین یا اس کے نزدیکی حقائق کو ہی کو ہی ہم کسی حد تک اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سطح ذہن پر بھی ہمارے اختیارات بہت محدود ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ ہم موت کو عموماً موخر تو کر سکتے ہیں، لیکن اس کو روک نہیں سکتے۔

مذہب اس تضاد پر غالب آنے کی ایک کوشش ہے۔اگر دنیا خدا کے کنٹرول میں ہے اور ہم دعاؤں کے ذریعے خدا کو متاثر کر سکتے ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس کی قدرت مطلقہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ زمانوں میں دعاؤں کے نتیجے میں معجزے رونما ہوا کرتے تھے۔ کیتھولک چرچ سے تعلق رکھنے والوں کے نزدیک معجزوں کا وقت ختم نہیں ہوا۔ وہ اب بھی رونما ہوتے ہیں۔البتہ پروٹسٹنٹ فرقے نے یہ قوت کھو دی ہے۔ وہ ان باتوں میں یقین نہیں رکھتا۔ بہرحال معجزوں سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے، کیونکہ خدا کا کہنا یہ ہے کہ فطری قوانین کا عمل ممکنہ حد

تک بہترین نتائج پیدا کرے گا۔ گویا خدا میں ایمان اب بھی فطرت کی دنیا کو انسان کے بس میں لانے اور اس کو یہ محسوس کروانے میں مدد دیتا ہے کہ طبعی قوتیں اس سے بے نیاز نہیں ہیں بلکہ اس کی معاون و مددگار ہیں۔ اس طریقے سے بقا کا عقیدہ موت کی دہشت کو ختم کر دیتا ہے۔ جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ ابدی زندگی سے نوازے جائیں گے، وہ موت کے خوف سے نجات پا سکتے ہیں۔ تاہم یہ طبیبوں کی خوش قسمتی ہے کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ چنانچہ عام مشاہدے کی بات یہ ہے کہ حیات بعد الموت میں یقین رکھنے والے اکثر لوگ موت سے ڈرتے رہتے ہیں۔

مذہب چونکہ خوف سے جنم لیتا ہے، لہٰذا اس نے بعض قسم کے خوفوں کو توقیر بخشی ہے۔ اور ان کو سرفراز کیا ہے۔ اس لحاظ سے مذہب نے نسل انسانی کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر قسم کا خوف برا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ موت کے ساتھ ہی میں گل سڑ جاؤں گا۔ میری ذات، میری خودی کا کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔ میں جوان نہیں ہوں اور زندگی سے مجھے نفرت ہے۔ مسرت کو دیکھئے پائیدار نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ نہیں رہتی پھر بھی وہ مسرت ہی رہتی ہے۔ اس طرح تصور، فکر اور محبت کی قدر و قیمت محض اس لیے کم نہیں ہو جاتی کہ وہ عارضی ہیں۔ کتنے ہی انسان ہیں جو فخر و افتخار سے سولی چڑھ گئے۔ فخر کا یہی جذبہ ہمیں دنیا میں انسان کے مقام کو سچائی کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ وہ ہمیں سکھا سکتا ہے کہ زندگی عارضی ہے اور اس کے عارضی پن کو کھلے دل کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ سائنس کے حقوق اگر چہ پہلے پہل ہمیں اپنے روایتی سکون بخش عقیدوں اور قصے کہانیوں سے جدا ہونے پر مجبور کر کے ہمیں بے چین کر دیتے ہیں۔ لیکن سائنس کی کھڑکی کھلنے سے بالآخر ذہن کے بوسیدہ گوشوں میں توانائی بخش تازہ ہوا داخل ہوتی ہے۔ ہم حقائق کو دیکھنے اور ان کو قبول کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

فطرت کا فلسفہ ایک شے ہے اور قدر کا فلسفہ دوسری اور بالکل مختلف شے ہے۔ ان دونوں کو آپس میں گڈمڈ کرنے سے صرف نقصان ہی پہنچتا ہے۔ جس شے کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اور جس کو ہم پسند کرتے ہیں، اس کا اشیائے موجودہ کی دنیا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو کچھ موجود ہے وہ ''فلسفہ فطرت'' کا موضوع ہے۔ دوسری طرف ہم کو کسی شے کی قدر کرنے سے محض اس لیے نہیں روکا جا سکتا کہ غیر انسانی دنیا میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ نہ ہی ہم کو کسی شے کی محض اس لیے تعریف و توصیف کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ ''قانون فطرت'' ہے۔ بے شک ہم فطرت کا

حصہ ہیں اور وہی ان قوانین کی مطابقت میں ہماری خواہشیں، امیدیں اور خوف پیدا کرتی ہے جن کو ماہرین طبیعیات نے اب دریافت کرنا شروع کیا ہے۔ اس مفہوم میں ہم فطرت کا جزو ہیں۔ فلسفہ فطرت میں ہم فطرت کے تابع ہیں۔ فطری قوانین کا ماحصل ہیں اور بالآخر ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔

فلسفہ فطرت کو بے جا طور پر کرہ ارض تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زمین کہکشاں کے چھوٹے ستاروں میں سے ایک کا چھوٹا سیارہ ہے۔ کائناتی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ فلسفہ فطرت کو توڑ مروڑ کر اس غیر اہم سیارے کے حقیر کیڑوں مکوڑوں کو پسند آنے والے نتائج اخذ کرنا بہت ہی مضحکہ خیز حرکت ہوگی۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فلسفہ کے طور پر روحیت اور ارتقا پسندی حس تناسب اور منطقی موزونیت کے فقدان کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ فلسفے ہمارے لیے ذاتی اہمیت رکھنے والے زندگی کے حقائق کو کرہ ارض تک محدود رکھنے کے بجائے کائناتی اہمیت عطا کر دیتے ہیں۔ کائناتی فلسفوں کے طور پر امید پرستی اور قنوطیت پسندی بھی ایسی ہی سادہ لوح انسان نوازی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جہاں تک ہمیں فلسفہ فطرت سے معلوم ہوتا ہے، عظیم الشان دنیا اچھی ہے اور نہ بری ہے۔ وہ ہمیں خوش کرنے یا رنج پہنچانے سے بے نیاز ہے، وہ لاتعلق ہے۔ اس قسم کے تمام فلسفے اپنے آپ کو غیر ضروری اہمیت دینے کے رجحان سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ہم فلکیات کا تھوڑا بہت علم حاصل کر لیں تو اس رجحان سے نجات مل سکتی ہے۔ تب ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ اس عظیم الشان کائنات میں انسان کس قدر حقیر اور بے مایہ ہے۔

فلسفہ قدر میں البتہ صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس فلسفے کی رو سے جو کچھ ہمارے تخیل میں آسکتا ہے، فطرت اس کا محض ایک جزو ہے۔ ہم حقیقی اور خیالی شے کی قدر و قیمت طے کر سکتے ہیں اور کوئی ایسا خارجی معیار موجود نہیں جو ہمارے ان فیصلوں کو غلط ثابت کر سکے۔ ہم خود ہی اقدار کا حتمی اور ناقابلِ تنسیخ تعین کرنے والے ہیں اور اقدار کی دنیا میں فطرت کی حیثیت محض ایک جزو کی ہے۔ اقدار کی دنیا میں فطرت بذات خود غیر جانبدار ہے، وہ اچھی ہے اور نہ بُری ہے۔ وہ ہماری تعریف و توصیف کی مستحق ہے اور نہ ہی ملامت کی۔ ہم خود ہی قدر تخلیق کرتے ہیں۔ ہماری

خواہشیں بھی ہماری تخلیق ہیں اور وہی قدر عطا کرتی ہیں۔اس سلطنت میں ہم بادشاہ ہیں اور اگر ہم فطرت کے آگے سر جھکا دیں تو پھر ہم اپنے مقام و مرتبے کی بے ادبی کرتے ہیں۔اچھی زندگی کا تعین بھی ہم نے خود ہی کرنا ہے۔یہ تعین فطرت نے نہیں کرنا....چاہے وہ خدا کی صورت میں مجسم ہو۔

اچھی زندگی

مختلف زمانوں اور مختلف لوگوں میں اچھی زندگی کے تصورات مختلف رہے ہیں۔کسی حد تک یہ اختلافات استدلال کے پابند ہوتے ہیں۔یعنی اس وقت جب کہ انسان کسی مقررہ مقصد کو حاصل کرنے کے طریقوں پر اختلافات رکھتے ہوں۔مثال کے طور پر بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ قید و بند کی سزا جرائم کو روکنے کے لیے اچھی ہوتی ہے۔دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جرائم کو روکنے کے لیے مجرموں کو سزا دینے کے بجائے اگر ہم ان کو تعلیم دیں تو بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ اس قسم کے اختلاف کو کافی شہادت حاصل کر کے دور کیا جا سکتا ہے۔لیکن بعض اختلافات ایسے بھی ہیں کہ جن کو اس طریقے سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ٹالسٹائی کی مثال لیجیے۔اس نے ہر قسم کی جنگ کی مذمت کی تھی۔ظاہر ہے کہ سب لوگ اس سے متفق نہیں۔بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ حق کی خاطر تلوار اٹھانے والے سپاہی کی زندگی عظیم المرتبت ہوتی ہے۔اچھا آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ٹالسٹائی اور ان لوگوں کی رائے کے درمیان تضاد حقیقی ہے۔اس کا تعلق ذرائع کے بجائے مقاصد سے ہے۔ آپ نے یہ بھی غور کیا ہوگا کہ مجاہدوں اور لشکریوں کی تعریف کرنے والے لوگ گناہگاروں کو سزا دینے کے حق میں ہوتے ہیں۔ٹالسٹائی کا خیال یہ نہ تھا۔اس قسم کے معاملات میں کوئی استدلال ممکن نہیں۔آپ دلائل کے ذریعے کسی ایک فریق کو ٹھیک اور دوسرے کو غلط ثابت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا میں بھی دلائل کے ذریعے یہ ثابت نہیں کر سکتا ہوں کہ اچھی زندگی کے بارے میں میری رائے درست ہے۔میں بس یہ کر سکتا ہوں کہ اپنا نقطہ نظر بیان کر دوں اور امید رکھوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ میرے نقطہ نظر سے اتفاق کریں گے۔خیر، میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اچھی زندگی وہ ہوتی ہے جس کا محرک محبت ہو اور جس کے لیے رہنمائی علم سے حاصل کی جائے۔

علم اور محبت دونوں کی کوئی حد نہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی زندگی چاہے جتنی بھی اچھی

ہو، اس کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور اس سے بہتر زندگی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اچھی زندگی کے لیے محبت اور علم دونوں ضروری ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سے کام نہیں چل سکتا۔ چنانچہ نہ تو علم کے بغیر محبت اور نہ ہی محبت کے بغیر علم سے اچھی زندگی پیدا ہو سکتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں جب کسی علاقے میں طاعون پھوٹ پڑتی تو مقدس صاحبان لوگوں کو گرجا گھروں میں جمع ہو کر اس متعدی مرض سے نجات کے لیے دعائیں مانگنے کو کہتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان رحم طلب ہجوموں میں یہ مہلک بیماری غیر معمولی تیزی کے ساتھ پھیل جاتی۔ یہ علم کے بغیر محبت کی ایک مثال ہے۔ آج کے زمانے کی تباہ کن جنگیں محبت کے بغیر علم کی تباہ کاریوں کو سامنے لاتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں نتیجہ وسیع پیمانے پر ہلاکت و بربادی ہے۔

محبت اور علم دونوں ضروری ہے۔ تاہم ایک لحاظ سے محبت زیادہ بنیادی اور اہم ہے۔ سبب یہ ہے کہ محبت ذہین افراد کو ان کے محبوب انسانوں کے فائدے کے لیے علم حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ دوسری طرف اگر لوگ ذہین نہ ہوں تو وہ محض سنی سنائی پر یقین کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ حقیقی خیر اندیشی اور کریم النفسی کے باوجود دوسروں کے لیے نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔ شاید میری بات کی بہترین وضاحت طب کے حوالے سے ہو سکتی ہے۔ مریض کے لیے لائق طبیب اس کے سب سے زیادہ جانثار دوست سے بہتر ہوتا ہے۔ طبی علم میں ترقی معاشرے کی صحت کے لیے بے علم انسانی ہمدردی اور خلائق دوستی سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ بہرحال اس کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ اگر سائنسی دریافتوں سے صرف امیروں کو فائدہ پہنچانا مقصود نہیں ہوتا تو پھر یہاں بھی کریم النفسی اور خلائق دوستی کے عنصر کی موجودگی لازم ہے۔

محبت ایک ایسا لفظ ہے جو کئی قسم کے احساسات کو شامل حال رکھتا ہے۔ میں نے اس کو جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، کیونکہ میں ان تمام احساسات کو شامل رکھنا چاہتا ہوں۔ ایک جذبے کی حیثیت سے محبت۔۔۔ اور یہاں میں اسی مفہوم میں بات کر رہا ہوں کیونکہ "اصولی محبت" مجھے سچی نہیں لگتی۔۔۔ دو مخالف نکتوں کے درمیان حرکت کرتی ہے۔ ایک طرف غور و فکر کی خالص مسرت ہے اور دوسری طرف خالص ہمدردی ہے۔ جہاں تک بے جان اشیاء کا تعلق ہے ہم ان سے مسرت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم کسی منظر یا نغمے سے ہمدردی کا جذبہ وابستہ نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی محبت کو فن کا منبع خیال کیا جاتا ہے۔ عموماً یہ محبت بالغوں کے مقابلے میں نوجوان بچوں میں زیادہ

ہوتی ہے۔ بالغ لوگ چیزوں کو ان کی افادیت کے حوالے سے دیکھا کرتے ہیں۔انسانوں کے بارے میں ہمارے احساسات میں یہ محبت اس وقت اہم کردار ادا کرتی ہے جب ہم ان کو محض جمالیاتی نظر سے دیکھتے ہیں۔

محبت کا متضاد نکتہ یا اس کا دوسرا قطب خالص ہمدردی ہے۔انسانوں نے کوڑھیوں کی مدد کرتے ہوئے جانیں قربان کی ہیں۔ان کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے جذبے کے پیچھے کوئی جمالیاتی عامل کام کر رہا تھا۔والدین کی محبت وشفقت کو دیکھئے۔اس میں بچے کی شکل وصورت کے حوالے سے جمالیاتی لطف کا پہلو شامل ہوتا ہے۔مگر ہم سب جانتے ہیں کہ ماں باپ اپنے صرف خوبصورت بچوں کو ہی پیار نہیں کرتے۔ بدصورت اور بعض صورتوں میں کریہہ المنظر بچوں کے والدین کی محبت اور شفقت کم نہیں ہوتی۔ جب کوئی ماں بیمار بچے میں دلچسپی لیتی ہے تو ہم اس کو ہمدردی سے تعبیر نہیں کرتے۔وجہ یہ ہے کہ ہم یہ لفظ کمزور جذبے کے لیے استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔تاہم کسی دوسرے فرد کی بھلائی کی خواہش کے لیے کوئی اور لفظ تلاش کرنا دشوار ہے۔اس خواہش اور اس جذبے کے لیے ہم ہمدردی کا لفظ بھی نوک زبان پر لاتے ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ والدین کی اسی قسم کی خواہش شدت کے کسی بھی درجے تک پہنچ سکتی ہے۔دوسری صورتوں میں وہ کم شدید ہوتی ہے۔شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے انسانوں کے لیے ہمدردی کا سارا جذبہ والدینی احساس کی فراوانی سے چھلکتا ہے یا بسا اوقات اس کی بدلی ہوئی صورت ہوتا ہے۔کسی موزوں تر لفظ کے نہ ملنے کی وجہ سے میں اس جذبے کو ''ہمدردی'' کہا کرتا ہوں۔تاہم میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کسی اصول کا نہیں بلکہ ایک جذبے کا ذکر کر رہا ہوں۔علاوہ ازیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ میں اس میں برتری کا کوئی احساس شامل نہیں کرتا۔یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ بعض اوقات اس قسم کا کوئی احساس اس لفظ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔

بھرپور محبت دو ناقابل تحلیل عناصر کا ملاپ ہوتی ہے۔ان میں سے ایک مسرت اور دوسرا عنصر خیر خواہی ہے۔خوبصورت اور کامیاب بچے سے ماں باپ کو جو لطف آتا ہے اس میں یہ دونوں عناصر شامل ہوتے ہیں۔اسی طرح بہترین جنسی محبت میں بھی یہ دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔تاہم جنسی محبت میں ہمدردی صرف اسی وقت پائی جاتی ہے جب دونوں افراد کا باہمی رشتہ مضبوط اور محفوظ ہو۔ایسا نہیں ہے تو پھر رقابت اس کو تباہ کر دے گی۔خیر خواہی کے بغیر مسرت ظالمانہ

ہوسکتی ہے۔دوسری طرف مسرت کے بغیر خیر خواہی آسانی سے سرد ہوسکتی ہے۔اوراس میں برتری کاعنصر بھی شامل ہوسکتا ہے۔محبوب بننے کا خواہش مندفرد ایسی محبت حاصل کرنے کی آرزو کرتا ہے جس میں دونوں عناصر شامل ہوں ۔البتہ شدید کمزوری...... مثال کے طور پر طفولیت یا سخت بیماری...... کی حالت میں معاملہ مختلف ہوسکتا ہے ۔جب حالت یہ ہوتو پھر ہمدردی کی ضرورت ہوسکتی ہے ۔اس کے برعکس شدید قوت کی صورتوں میں ہمدردی کے بجائے تعریف وستائش کی زیادہ خواہش ہوتی ہے۔حکمرانوں اور حسینوں کی ذہنی کیفیت اسی قسم کی ہوتی ہے۔دوسرے لوگوں کی نیک خواہشات کی ہمیں اس قدر ضرورت ہوتی ہے جس قدر ہم خود کوضرورت مند سمجھتے ہیں یا دوسرے لوگوں سے خطرہ محسوس کرتے ہیں ۔صورتحال کی حیاتیاتی منطق ،کم از کم ،یہی دکھائی دیتی ہے۔تاہم زندگی کے معاملے میں یہ بات بالکل درست نہیں ہے ۔ہم تنہائی کے احساس سے محفوظ رہنے اور جیسا کہ ہم کہا کرتے ہیں''سمجھے جانے'' کے لیے ہم محبت کی آرزو کرتے ہیں ۔جوفرد ہمارا خیال رکھتا ہے اور جس کے دل میں ہمارے لیے اچھے جذبے ہیں ،اس کو نہ صرف ہمارا خیر خواہ ہونا چاہیے بلکہ اس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری خوشی کا دارومدار کس چیز پر ہے...اس کا تعلق اچھی زندگی کے ایک اور عنصر یعنی علم سے ہے۔

مثالی اور مکمل دنیا میں ہر شخص دوسروں سے بے پناہ محبت رکھے گا اوراس کی محبت میں مسرت ،دلنوازی،فیاضی اور افہام وتفہیم کے جذبے شامل ہوں گے ۔تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس حقیقی دنیا میں ہمیں تمام انسانوں کے لیے اس قسم کے جذبے رکھنے چاہئیں ۔اس دنیا میں بہت سے لوگ قابل نفرت ہیں اور ہم ان میں خوشی محسوس نہیں کر سکتے ۔اگر ہم اپنی فطرت پر جبر کر کے ان لوگوں میں حسن کی رعنائیاں دیکھنے کی کوشش کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم حقیقی حسن سے محظوظ ہونے کی اپنی صلاحیتیں کند کرلیں گے ۔اچھابات صرف نفرت انگیز انسانوں کی نہیں ۔ہمارے گردوپیش خون چوس کیڑے مکوڑوں ،مکھیاں اور پسو بھی تو ہیں ۔ان مخلوقات کی قربت اور مشاہدے سے خوشی حاصل کرنے کی خاطر ہم کو اپنی انسانی فطرت بالکل ہی برباد کرنی ہوتی ۔مجھے معلوم ہے کہ بعض ولیوں نے ان مکروہ مخلوقات کو''خدا کے موتی'' قرار دے رکھا ہے۔لیکن ان بزرگوں کو اپنے تقدس اوراعلیٰ ظرفی کی نمائش کے مواقع کی تلاش رہا کرتی تھی۔

ہمدردی کا دائرہ وسیع کرنا سہل ہے۔مگراس کی بھی حدود ہیں ۔اگر کوئی شخص ایک خاتون سے

شادی کرنا چاہتا ہے مگر یہ جان کر ارادہ بدل لیتا ہے کہ کوئی اور فرد بھی اسی خاتون سے بیاہ رچانے کا آرزومند ہے تو پھر اس شخص کے بارے میں ہماری رائے بہتر نہ ہو جانی چاہیے۔اس معاملے کو مقابلے کا کھلا میدان تصور کرنا چاہیے۔رقیب کے لیے اس شخص کے احساسات کو مکمل طور پر ہمدردی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔میرا خیال تو یہ ہے کہ اس دھرتی پر اچھی زندگی کے ہر تصور میں حیوانی جوش حیات اور حیوانی جبلت کا تھوڑا بہت عنصر لازمی طور پر موجود ہونا چاہیے۔اس کے بغیر زندگی روکھی پھیکی، بدمزہ اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو راہب اور تارک الدنیا درویش مکمل انسان نہیں قرار پاتے۔معاشرے میں ان کی تھوڑی بہت تعداد سے ممکن ہے کہ کوئی فائدہ پہنچ سکے۔لیکن دنیا میں صرف ولی اور درویش ہی رہ جائیں تو وہ ایک بدمزہ دنیا ہوگی۔

یہ بحث ہمیں بہترین محبت کے جزو ترکیبی کے طور پر مسرت کے عنصر پر خاص حد تک دور رہنے کی طرف لے جاتی ہے۔اس حقیقی دنیا میں مسرت ناگزیر طور پر انتخابی ہے اور ہمیں تمام انسانوں کے بارے میں یکساں احساسات رکھنے سے روکتی ہے۔جب مسرت اور ہمدردی کے درمیان تضادات ابھر آئیں تو ان دونوں میں سے کسی ایک کو مکمل طور پر ختم کرنے کے بجائے دونوں میں مفاہمت کے ذریعے معاملہ طے کرنا چاہیے۔جبلت کے اپنے حقوق ہیں۔ان پر ایک حد سے زیادہ دباؤ ڈالا جائے تو جبلت پرمکر طریقوں سے بدلہ لے لیتی ہے۔لہٰذا اچھی زندگی کے حصول کی کوششوں کے دوران انسانی امکان کی حدود کو لازمی طور پر ذہن میں رکھنا چاہیے۔یہاں ہم دوبارہ علم کی ضرورت کی طرف واپس آگئے ہیں۔

علم کو اچھی زندگی کا جزو ترکیبی قرار دیتے ہوئے میرے ذہن میں اخلاقی علم نہیں ہوتا۔ یہاں میری مراد سائنسی اور خصوصی حقائق کے علم سے ہے۔میرا نہیں خیال کہ صریح مفہوم میں اخلاقی علم جیسی کوئی شے موجود ہے۔جب ہم کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو علم ہمیں اس کے حصول کے طریقے بتاتا ہے۔اس علم کو ہم سرسری طور پر اخلاقی قرار دے سکتے ہیں۔تاہم میرے خیال میں ہم یہ طے نہیں کر سکتے کہ کس قسم کا طرز عمل صحیح یا غلط ہے۔یہ فیصلہ صرف اس کے امکانی مضمرات کی اساس پر ہی کیا جا سکتا ہے۔کسی مقصد کا تعین کرنے کے بعد صرف سائنس ہی بتا سکتی ہے۔کہ اس مقصد کو حاصل کس طرح کیا جائے۔جملہ اخلاقی اصولوں کی کسوٹی یہ ہونی چاہیے کہ آیا

وہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ براہ کرم توجہ فرمائیے کہ میں مطلوبہ نتائج کا ذکر کرر ہا ہوں۔ میں ان نتائج کی بات نہیں کرر ہا ہوں جو ہمیں مطلوب ہونے چاہئیں۔ ''جو کچھ ہمیں مطلوب ہونا چاہیے'' سے مراد محض وہ کچھ ہے جو کوئی اور چاہتا ہے کہ ہم اس کی خواہش کریں۔

عموماً اس سے مراد وہ کچھ ہے جو بالا دست افراد چاہتے ہیں کہ ہم پسند کریں۔ یہاں بالا دست افراد سے مراد والدین، سکول ٹیچر، پولیس اور جج صاحبان ہیں۔ چونکہ ہر قسم کے عمل کا منبع خواہش ہے لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہے کہ اخلاقی تصورات کی اہمیت صرف اس قدر ہے جس قدر وہ خواہش پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ یہ کام پسندیدگی کی آرزو اور ناپسندیدگی کے خوف کے ذریعے کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ ہم کو پسند کریں اور ہم ان کی ناپسندیدگی سے ڈرتے ہیں۔ یہ دونوں طاقتور سماجی قوتیں ہیں۔ کوئی سماجی مقصد حاصل کرتے ہوئے فطری طور پر ہماری خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوں قوتیں ہمارے حق میں رہیں۔ یعنی ہمیں دوسروں کی پسندیدگی حاصل رہے۔ اور وہ ہمیں رد نہ کریں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ طرز عمل کی اخلاقی حیثیت کا تعین اس کے امکانی مضمرات سے ہوتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے مطلوبہ سماجی مقاصد کو حاصل کرنے کے طریقہ کار کو پسند کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس کے متضاد طریقہ کار کو رد کر دیا جائے۔ فی زمانہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ ہمارے پاس چند روایتی اصول ہی جن کے مطابق منظوری یا نامنظوری دی جاتی ہے اور امکانی مضمرات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

سادہ مثالوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ نظری اخلاقیات فالتو اور غیر ضروری ہوا کرتی ہے۔ مثال کے طور فرض کیجئے کہ آپ کا بچہ بیمار ہے۔ بچے کی محبت کے سبب آپ اس کو صحت مند دیکھنا چاہتے ہیں۔ سائنس آپ کو اس کے علاج کا طریقہ کار بتا دے گی۔ کوئی اخلاقی نظریہ یہ نہیں بتاتا کہ آپ کے بچے کا صحت مند ہو جانا بہتر بات ہے۔ اس معاملے میں آپ کا عمل ایک مقصد کی آرزو اور اس مقصد کے حصول کے وسائل کا علم سے براہ راست نکلتا ہے۔ یہ بات تمام افعال کے بارے میں درست ہے، چاہے وہ اچھے ہوں یا برے۔ مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔ بعض صورتوں میں علم دیگر صورتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن کوئی ایسا قابل تصور طریقہ نہیں جس کے ذریعے لوگوں کو کچھ کرنے پر مجبور کیا جائے جو وہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہم جزا اور سزا

کے کسی نظام کے ذریعے لوگوں کی خواہشیں بھی بدل ڈالیں۔ سماجی پسندیدگی اور ناپسندیدگی بھی بہت طاقتور جزا اور سزا کی صورتیں ہیں۔ لہٰذا قانون ساز عامل اخلاق کے لیے سوال یہ ہے کہ قانون کی خواہش زیادہ سے زیادہ حد تک عمل کروانے کی خاطر سزاؤں اور جزاؤں کا نام کس طرح مرتب کیا جائے۔ اگر میں یہ کہوں کہ قانون ساز اتھارٹی کی خواہشیں بری ہیں تو میرا مطلب محض یہ ہو گا کہ اتھارٹی کی خواہشیں میری کمیونٹی کے کسی حصے کی خواہشوں سے متصادم ہیں۔ انسانی خواہشوں کے دائرے سے باہر کوئی اخلاقی معیار موجود نہیں ہے۔

اس ساری بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اخلاقیات کو سائنس سے ممتاز کرنے والی شے کوئی خاص قسم کا علم نہیں، بلکہ صرف خواہش ہے۔ اخلاقیات میں بھی اسی قسم کا علم درکار ہوتا ہے۔ جس قسم کا علم دیگر معاملات میں مطلوب ہوتا ہے۔ یہاں غیر معمولی بات البتہ یہ ہے کہ بعض مقاصد کی خواہش کی جاتی ہے اور یہ کہ درست طرز عمل وہ ہوتا ہے جو ان مقاصد کے حصول میں مددگار ہو۔ بلاشبہ اگر راست طرز عمل کی تعریف کو زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول بنانا مقصود ہے تو پھر ایسے مقاصد منتخب کرنے ہوں گے جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کی خواہش کے مطابق ہوں۔ اگر میں راست طرز عمل کی تعریف یہ کروں کہ اس سے مراد وہ طرز عمل ہے جو میری ذاتی آمدنی میں اضافے کا سبب بنے تو پھر قارئین کو مجھ سے اختلاف ہوگا۔ کسی اخلاقی دلیل کا سارا اثر اس کے سائنسی حصے میں مضمر ہوتا ہے...... یعنی اس ثبوت میں کہ دیگر طرز ہائے عمل کے مقابلے میں ایک خاص طرز عمل اس مقصد کو حاصل کرنے کا وسیلہ ہے جس کو وسیع پیمانے پر پسند کیا جاتا ہے۔ تاہم میں اخلاقی استدلال اور اخلاقی تعلیم میں فرق کرتا ہوں۔ اخلاقی تعلیم کا کام بعض خواہشات کو مضبوط بنانا اور بعض کو کمزور کرنا ہے۔ یہ ایک بالکل مختلف قسم کا علم ہے جس پر آگے چل کر علیحدہ سے بحث کریں گے۔

اب ہم اچھی زندگی کی تعریف کے معانی کو زیادہ صراحت کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ اچھی زندگی علم سے رہنمائی پانے والی محبت پر مشتمل ہوتی ہے تو اس کا محرک میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں خود زیادہ سے زیادہ حد تک اس قسم کی زندگی گزاروں اور دوسروں کو بھی گزارتے ہوئے دیکھوں۔ میرے اس بیان کا منطقی مشتملہ یہ ہے کہ اس قسم کی زندگی گزارنے

والے گروہ میں زیادہ خواہشات کی تکمیل ممکن ہوگی۔اس کے مقابلے میں جس گروہ میں محبت یا علم کی کمی ہوگی، اس میں نسبتاً کم خواہشیں تسکین پاسکیں گی۔ خیر، میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اس قسم کی زندگی ''پاک باز'' ہے اور یہ کہ اس کے برعکس زندگی ''گناہگار'' ہوتی ہے۔وجہ یہ ہے کہ مجھے اس قسم کے تصورات سائنسی جواز سے عاری محسوس ہوتے ہیں۔

اخلاقی اصول

اخلاقی اصولوں کی عملی ضرورت خواہشوں کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔یہ تصادم مختلف لوگوں کو خواہشوں میں ہوسکتا ہے اور مختلف اوقات پر ایک ہی فرد کی خواہشوں میں بھی ممکن ہے۔ ایک شخص شراب سے لطف اٹھانا چاہتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ اگلی صبح وہ اپنے فرائض کرنے کے لیے چاق و چوبند ہو۔اب اگر وہ شخص خواہش کی کمتر تسکین کرنے والی راہ اختیار ہے تو ہم اس کو غیر اخلاقی قرار دیں گے۔ہم ان لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے جو فضول خرچ اور عاقبت اندیش ہوں، چاہے وہ اپنے سوا کسی اور کے لیے نقصان کا باعث نہ بنتے ہوں۔ بینتھم کا خیال یہ کہ پوری اخلاقیات کو''روشن خیال ذاتی مفاد'' سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔اُن کا کہنا تھا کہ اگر کوئی شخص ہمیشہ اپنی زیادہ سے زیادہ تسکین کے حوالے سے عمل کرتا ہے تو وہ آخر کار راست طرز عمل کا حامل ہوگا۔ میں اس نظریے کو قبول نہیں کرسکتا۔تاریخ میں ایسے ظالم حکمران بھی گزرے ہیں جو دوسروں کو تشدد کا نشانہ بنتا دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ میں ایسے لوگوں کی تعریف نہیں کرسکتا جو مصلحت اندیشی سے کام لے کر اپنے ستم رسیدوں کو محض اس لیے زندہ چھوڑ دیتے تھے کہ وہ زندہ رہیں اور تڑپتے رہیں۔دانائی بہر حال اچھی زندگی کا حصہ ہے۔ یہاں تک کہ روبن سن کروسو جیسے آوارہ گرد کو بھی کبھی کبھار جفاکشی، ضبطِ نفس اور پیش بینی سے کام لینے کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ان تینوں صفات...... جفاکشی، ضبطِ نفس اور پیش بینی...... کو ہم اخلاقی قرار دے سکتے ہیں۔وجہ یہ ہے کہ یہ صفات دوسروں کو نقصان پہنچانے کا توڑ کیے بغیر روبن سن کروسو کی مکمل تسکین بڑھا دیتی تھیں۔اخلاقی تعلیم کا یہ حصہ ان نوجوانوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے جو مستقبل کے بارے میں سوچنے میں بہت کم دلچسپی رکھتے ہیں۔اگر بعد کی زندگی میں ان پر عمل کیا جائے تو ہماری دنیا فوراً ہی جنت میں تبدیل ہوجائے کیونکہ ان کی مدد سے جنگوں کی روک تھام ہوسکتی ہے۔یہ تو ہم جانتے ہیں

کہ جنگیں مصلحت اندیشی کا کام نہیں ہیں بلکہ جذبوں کا معاملہ ہیں ۔ خیر مصلحت اندیشی کی اہمیت اپنی جگہ ہے ۔ مگر اس کو اخلاقی اصولوں کا سب سے دلچسپ حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ نہ ہی یہ ذہنی مسائل اٹھانے والا حصہ ہے کیونکہ اس کا دائرہ کار ذاتی مفاد تک ہی محدود رہا کرتا ہے ۔

اخلاقیات کا جو حصہ مصلحت اندیشی کی ذیل میں نہیں آتا ۔ اس کی حیثیت قانون یا کلب کے قواعد و ضوابط جیسی ہے ۔ یہ لوگوں کی خواہشوں کے درمیان تصادم کے امکان کے باوجود ان کو معاشرے میں مل جل کر رہنے کے قابل بنانے کا طریقہ ہے ۔ تاہم یہاں دو بالکل مختلف قسم کے طریقے ممکن ہیں ۔ ایک تو جرم و سزا کا طریقہ ہے جو دوسرے لوگوں کی خواہشوں کی بعض طریقوں سے مزاحمت کرنے والے افعال سے ناگوار نتائج منسلک کر کے معاشرے کے افراد میں محض خارجی ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ سماجی مذمت کا طریقہ بھی یہی ہے ۔ معاشرہ کسی فرد کو برا سمجھتا ہے تو یہ اس کے لیے ایک قسم کی سزا ہے ۔ اس سے بچنے کے لیے اکثر لوگ احتیاط سے کام لیتے ہیں ۔ وہ دوسروں کو یہ جاننے نہیں دیتے کہ وہ سماجی ضابطوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں ۔

ابھی ہم نے دو طریقوں کا ذکر کیا تھا ۔ پہلے طریقے کی مختصر وضاحت کی جا چکی ہے ۔ دوسرا طریقہ اگر کامیابی سے ہمکنار ہو تو وہ زیادہ بنیادی اور تسلی بخش ثابت ہوتا ہے ۔ یہ طریقہ انسانوں کے کردار اور خواہشوں کو ایسے انداز میں بدلنے سے تعلق رکھتا ہے کہ جس سے ایک فرد کی خواہشوں کی کامیابی دوسروں کی خواہشوں کی کامیابی سے ممکنہ حد تک ہم آہنگ ہو جائے اور یوں ان کی خواہشوں کے باہمی تصادم کے امکانات کم سے کم رہ جائیں ۔ محبت نفرت سے اسی لیے بہتر ہے کہ وہ متعلقہ افراد کی خواہشوں کے مابین تضاد کے بجائے مطابقت پیدا کرتی ہے ۔ دو محبت کرنے والے افراد ایک ساتھ جیتتے یا ہارتے ہیں ۔ لیکن جب دو افراد آپس میں نفرت کر رہے ہوں تو ان میں سے ایک کی جیت اور دوسرے کی ہار ہوتی ہے ۔

اگر ہمارا یہ دعویٰ درست ہے کہ اچھی زندگی محبت سے تحریک اور علم سے رہنمائی حاصل کرتی ہے تو پھر یہ بات بالکل واضح ہے کہ کسی معاشرے کا اخلاقی ضابطہ نہ تو حتمی ہوتا ہے اور نہ ہی خود مکتفی ۔ اس کا جائزہ اس حوالے سے لینا چاہیے کہ آیا وہ دانائی اور نیکی کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے یا نہیں ۔ اخلاقی ضابطے ہمیشہ بے خطا نہیں ہوا کرتے ۔ وسطی میکسیکو کے پرانے انڈین باشندوں کا معاملہ ہی دیکھیے ۔ وہ بے چارے اس لیے انسانی گوشت کھانے پر مجبور تھے کہ کہیں سورج روشنی

سے محروم نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ان کا علم غلطی پر تھا۔ ان کے دل میں اپنے کشتگان کے لیے کوئی نرم گوشہ ہوتا تو شاید ان کو اس غلطی کا احساس بھی ہو جاتا۔ بعض قبائل اپنی دوشیزاؤں کو دس سے سترہ سال کی عمر تک اندھیرے میں قید رکھتے تھے۔ ان کو خدشہ لاحق رہتا تھا کہ سورج کی شعاعیں ان دوشیزاؤں کو حاملہ کر دیں گی۔ اچھا تو کیا ہم یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمارے جدید اخلاقی ضابطوں میں اس قسم کا کوئی وحشیانہ اور سفاک عنصر شامل نہیں؟ کیا ہم واقعی ان باتوں سے روکتے ہیں جو حقیقی طور پر نقصان دہ ہیں یا وہ اس قدر قابل نفرت ہیں کہ کوئی مہذب شخص ان کا دفاع نہیں کر سکتا؟ کم از کم میں اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

آج کے زمانے کی اخلاقیات، افادہ پرستی اور توہم پرستی کے انوکھے ملاپ سے پیدا ہوتی ہے۔ تاہم اس میں توہم پرستی کا پلہ بھاری ہے۔ یہ فطری امر ہے۔ کیونکہ اخلاقی اصولوں کا منبع توہم پرستی ہی ہے۔ ابتدا میں ہوتا یہ تھا کہ بعض افعال کو دیوتاؤں کے لیے ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان کو قانون کے ذریعے ممنوع قرار دے دیا جاتا۔ اس کا مقصد دیوتاؤں کے قہر اور غیظ و غضب سے محفوظ رہنا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر کسی فرد یا چند افراد نے دیوتاؤں کا ناپسندیدہ کوئی کام کیا تو ان کا قہر پورے معاشرے پر نازل ہوگا۔ اور اس کو تباہ کر ڈالے گا۔ اس سے گناہ کا تصور پیدا ہوا گناہ وہ کام ہے جو خدا کو ناگوار گزرتا ہے۔ اس امر کی کوئی دلیل نہیں دی جاتی کہ بعض افعال ناگوار کیوں ہیں۔ مثال کے طور پر یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ بچے کو ماں کے دودھ میں بھگونا خدا کو کیوں ناپسند ہے۔ تاہم انجیل میں یہی کہا گیا ہے۔ بعض اوقات خدائی احکامات کی توجیہ بڑی عجیب و غریب انداز میں کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم سے ہفتے کے روز کوئی کام نہ کرنے کو کہا جاتا ہے۔ لیکن پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگ اس حکم سے یہ مطلب اخذ کرتے ہیں کہ ہمیں اتوار کے دن کسی کھیل تماشے میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ اس قسم کی مثالوں میں نئی ممانعت کو بھی پرانی ممانعت جیسا تقدس عطا کر دیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ زندگی کے بارے میں سائنسی نقطہ نظر رکھنے والا کوئی شخص خود کو انجیل یا کلیسا کی تعلیمات سے خوفزدہ ہو کر ان کو قبول کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ وہ محض یہ کہنے سے مطمئن نہ ہوگا کہ "فلاں فلاں فعل گناہ کے زمرے میں داخل ہے اور معاملہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔" وہ یہ تحقیق کرنا چاہے گا آیا یہ فعل نقصان دہ ہے یا اس کو گناہ قرار دینے والا عقیدہ نقصان دہ ہے۔ وہ دیکھے گا کہ

''خاص طور پر'' جنس سے متعلقہ امور میں ہمارے موجودہ اخلاقی اصولوں کا بڑا حصہ محض توہم پرستی کی پیداوار ہے۔ وہ یہ بھی دیکھے گا کہ وسطی میکسیکو کے پرانے انڈین باشندوں کی توہم پرستی کی طرح آج کی توہم پرستی میں بھی غیر ضروری ظلم و جبر شامل ہے۔ اگر لوگ اپنے ہمسایوں سے محبت کرنے لگیں اور دوسرے انسانوں کے بارے میں خیر سگالی کے جذبات پیدا کر لیں تو یہ توہم پرستی خود بخود ختم ہو کر رہ جائے۔ لیکن روایتی اخلاق کے حامی شاذ و نادر ہی محبت بھرے دل رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کا اندازہ آپ مذہب کے علمبرداروں کی جنگ پرستی سے کر سکتے ہیں۔ ان کے طور طریقے دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ اخلاقی اصولوں کی حمایت محض اس لیے کرتے ہیں۔ تاکہ وہ دوسروں کو تکلیف پہنچانے کی اپنی خواہش کو جواز عطا کر سکیں۔ کسی کو گناہ گار قرار دے کر اس کو ایذا پہنچانے کی راہ کھل جاتی ہے۔ آیئے ہم حمل سے قبر تک ایک عام آدمی کی زندگی کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ توہم پرستی اس کو زندگی کے کس کس مرحلے پر غیر ضروری ایذا پہنچانے کا سبب بنتی ہے۔ میں حمل سے آغاز کرتا ہوں کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس مرحلے پر توہم پرستی کا اثر خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ ماں باپ کی شادی کے بغیر پیدا ہونے والا بچہ عمر بھر دوسروں کی پھبتیوں، نفرتوں اور عداوتوں کا شکار رہتا ہے، حالانکہ وہ کسی طور بھی ان کا مستحق نہیں ہوتا۔ ماں باپ میں سے اگر کوئی امراض خبیثہ کا شکار ہو تو بچہ بھی عموماً ان کی زد میں آ جاتا ہے۔ والدین کے بچے زیادہ ہوں اور آمدنی کم ہو تو پھر غربت، غذائی کمی اور جگہ کی کمی کے مصائب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس صورتحال میں زنائے محرم کے رجحانات بھی زور پکڑتے ہیں۔ اس کے باوجود معلمین اخلاق خاندانی منصوبہ بندی کی شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں اور علمائے مذہب اس کو خدا کے خلاف جنگ قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کے چند بے شعور لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر لاکھوں کروڑوں بدنصیب بچوں کو ناقابل برداشت مصائب سہنے کے لیے اس دنیا میں آنے کا موقع دے دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بدحال والدین کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ کسی آدم خور قبیلے کے پھندے میں اچانک پھنس کر اس کی خوراک بن جانے والے انسان کے مقابلے میں کہیں زیادہ بدقسمت ہوتا ہے۔ لیکن علمائے مذہب کو اس بدقسمتی اور اذیت کا کوئی احساس نہیں ہے۔ وہ اخلاقیات کے نام پر بدقسمتی کے اس منبع کو جاری رکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے دل میں بچوں اور انسانوں کی محبت کا ایک ذرہ بھی ہوتا تو وہ اس خونخوار ضابطۂ اخلاق کو فوراً مسترد کر دیتے۔

پیدائش اور شیر خواری کے ایام میں بچہ توہم پرستی سے زیادہ معاشی عوامل کے ہاتھوں دکھ اٹھاتا ہے۔ جب خوش حال گھرانوں کی عورتیں بچے جنتی ہیں تو ان کو بہترین ڈاکٹر، بہترین نرسیں بہترین آرام وآسائش، بہترین خوراک اور بہترین ورزش میسر ہوتی ہے۔ مزدور طبقے کی عورتوں کو یہ سب سہولتیں میسر نہیں ہوتیں اور ان کے بچے خوراک کی کمی کے باعث عموماً مر جاتے ہیں۔ ایسی ماؤں کی دیکھ بھال کے لیے حکام شاید ہی کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔ وہ کچھ کرتے ہیں تو بھی بادل نخواستہ ہی کرتے ہیں۔ بہت سے ملکوں میں جنونی حکمران ماؤں اور بچوں کی بھلائی کے بجائے صرف گولہ بارود جمع کرنے میں جتے رہتے ہیں۔ ان کو جاننا چاہیے کہ ان کے طرز عمل کی وجہ سے بے شمار غریب بچے موت کے منہ میں جارہے ہیں اور ان غریبوں کا قصور بس یہ ہے کہ وہ غریب اور نادار گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود علمائے دین ان حکمرانوں کے پرجوش حامی ہوتے ہیں اور ان کو جہاد تیز تر کرنے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ سماجی ناانصافی اور ظلم و جبر کو برقرار رکھنے کی خاطر دنیا بھر میں توہم پرستی کا غلبہ قائم رکھنے کے لیے مصروف کار رہتے ہیں۔

تعلیم کے تمام مرحلوں پر توہم پرستی کا اثر تباہ کن ہوتا ہے۔ بچوں کی خاصی تعداد غور وفکر کی عادی ہوتی ہے۔ تعلیم کا ایک مقصد یہ ہے کہ بچوں کی اس عادت کو کچل دیا جائے۔ ناگوار سوال پوچھنے پر زبان بندی کا حکم دیا جاتا ہے یا پھر اس قسم کے سوال اٹھانے پر دوسری سزائیں دی جاتی ہیں۔ بچوں کو خود غور وفکر کرنے اور نتائج اخذ کرنے کا رویہ ترک کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ان کے ذہنوں میں قومی اور مذہبی ''صداقتیں'' زبردستی ٹھونس دی جاتی ہیں۔ سرمایہ دار، جنگ باز اور علمائے مذہب اس قسم کے نظام تعلیم میں تعاون کرتے ہیں کیونکہ ان کو علم ہے کہ ان کی بالادستی کا دارومدار جذبات پرستی پر ہے۔ اگر لوگوں نے جذبات پرستی کو چھوڑ دیا اور وہ عقل وفہم سے کام لینے لگے تو ان معزز صاحبان کا تختہ الٹ جائے گا۔ کوئی ان کو پوچھنے والا نہ رہے گا اور ان کی ساری برتری خاک میں مل جائے گی۔

اساتذہ کے انتخاب کے حوالے سے بھی توہم پرستی تعلیم کو نقصان پہنچاتی ہے۔ معاشی اسباب کی بنا پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خاتون ٹیچر کو غیر شادی شدہ ہونا چاہیے۔ دوسری طرف اخلاقی وجوہ کے حوالے سے اصرار کیا جاتا ہے کہ وہ غیر ازدواجی جنسی تعلقات سے بالکل محفوظ ہو۔ اب حقیقت یہ ہے کہ ذہنی امراض کی نفسیات کی شد بد رکھنے والے ہر شخص کو بخوبی علم ہے کہ طویل کنوار

پن عورتوں کے لیے غیر معمولی طور پر نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ایسی دوشیزگی اس قدر ضرر رساں ہے کہ کسی صحت مند معاشرے میں ٹیچرز کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔تدریسی پیشے پر اس قدر پابندیاں عائد ہیں کہ مستعد، سرگرم اور پرعزم عورتیں اس پیشے سے دور ہوتی جارہی ہیں۔ یہ سب کچھ توہم پرستی پرمبنی بوسیدہ اخلاقی نظام کی وجہ سے ہے۔

تعلیمی اداروں پر مذہب کا اثر ورسوخ بڑھتا جارہا ہے۔طاقتور مذہبی تنظیمیں اپنے تیار کیے ہوئے نظریاتی کارکنوں کو جوق در جوق تعلیمی پیشے میں داخل کرتی ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر تنگ نظر، شدت پسند اور ثقافتی طور پر جاہل ہوتے ہیں۔توہم پرستی کے چکر میں الجھے ہوئے یہ لوگ بچوں اور نوجوانوں میں آزادانہ غور وفکر کا معمولی سا میلان بھی برداشت نہیں کرتے۔ان لوگوں نے تعلیم کا ستیاناس کر دیا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ درس گاہیں، شاہ دولہ کے چوہے تیار کرنے کی فیکٹریاں بن گئی ہیں اور ہر سال لاکھوں کی تعداد میں یہ ''چوہے'' معاشرے میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔

متوسط اور بالائی طبقوں کے سکولوں کی حالت ابتر ہے۔ ان میں باقاعدہ مذہبی عبادت کروائی جاتی ہے اور طالب علموں کے اخلاقی امور کی دیکھ بھال پادریوں کے ذمے ہوتی ہے۔ اخلاق کے اساتذہ کے طور پر مذہبی لوگ کم و بیش لازمی طور پر دو حوالوں سے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔پہلی بات یہ ہے کہ وہ بے ضرر افعال کی مذمت کرتے ہیں اور نقصان دہ افعال سے درگزر کرتے ہیں۔وہ سب کے سب نوجوانوں کی جنسی خواہشوں کو دبانے پر مجبور کرتے ہیں۔ان اساتذہ میں سے اکثر ضبط پیدائش کے مخالف ہوتے ہیں۔لیکن ان میں سے کوئی بھی اس شوہر کی بربریت کو برا نہیں سمجھتا جو مسلسل بچے پیدا کر کے بیوی کو موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ایک فیشن ایبل پادری کو تو میں بھی جانتا ہوں جس کی بیوی نے نو برسوں میں نو بچے جنے تھے۔ڈاکٹروں نے اس کو بتادیا تھا کہ اگر ایک اور بچہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ بچاری جان سے گزر جائے گی۔ پادری صاحب باز نہ آئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے برس ان کی بیوی نے ایک اور بچے کو جنم دیا اور خود پیوند خاک ہوگئی۔وہ اپنے کلیسائی عہدے پر فائز رہا اور دوبارہ شادی کر لی۔بات یہ ہے کہ جب تک ارباب مذہب ظلم و بربریت سے چشم پوشی کرتے رہیں گے تب تک نوجوانوں کے اخلاق کے محافظ کے طور پر وہ خرابی اور نقصان کا باعث ہی رہیں گے۔

تعلیم پر توہم پرستی کا ایک اور نقصان پہنچانے والا اثر یہ ہے کہ وہ جنسی حقائق کا درس دینے کی

اجازت نہیں دیتی۔ حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے چھوٹے بچوں کو جسمانی حقائق سادہ اور فطری انداز میں پڑھائے جائیں۔ اس زمانے میں یہ حقائق جذبات بھڑکانے والے نہیں ہوتے۔ عنفوان شباب میں توہمات سے پاک جنسی اخلاقیات کے عناصر کی تعلیم دینی چاہیے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ بتانا چاہیے کہ باہمی رغبت کے علاوہ کوئی شے بھی جنسی اختلاط کا جواز نہیں بن سکتی۔ یہ بات چرچ کی تعلیم کے خلاف ہے۔ چرچ کا کہنا یہ ہے کہ مجامعت صرف اس وقت جائز ہے جب کہ فریقین شادی شدہ ہوں اور مرد کو ایک اور بچے کی خواہش ہو۔ بیوی اس پر رضامندی نہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کی آزادی کے احترام کا درس دینا چاہیے۔ ان کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ کوئی شے بھی ایک انسان کو دوسرے انسان کا مالک نہیں بنا سکتی اور یہ کہ حسد اور دوسرے فرد کو اپنی گرفت میں لینے کی خواہش محبت کو تباہ کر دیتی ہے۔ نوجوانوں کو یہ درس دینا چاہیے کہ ایک اور انسان کو اس دنیا میں لانا بہت ہی سنجیدہ معاملہ ہے۔ یہ کام اس یقین کے بعد کرنا چاہیے کہ بچے کو معقول حد تک صحت، اچھا ماحول اور والدین کی دیکھ بھال میسر ہوگی۔ نوجوانوں کو ضبط پیدائش کے طریقے سکھانے چاہئیں اور ان سے متعلقہ سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جا سکے کہ بچے اس وقت پیدا ہوں گے جب ان کی ضرورت ہوگی۔ علاوہ ازیں ان کو امراض خبیثہ سے باخبر کرنا چاہیے اور ان سے محفوظ رہنے اور ان کا علاج کرنے کے طریقے بتانے چاہئیں۔ اس طرز کی جنسی تعلیم دینے سے انسانی مسرتوں میں بے پناہ اضافے کی امید کی جا سکتی ہے۔

یہ تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ بچوں کی عدم موجودگی کی صورت میں جنسی تعلقات خالص طور پر نجی معاملہ ہیں۔ ریاست یا ہمسایوں کو ان سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔ فوجداری قانون جنس کی بعض ایسی صورتوں کی اجازت نہیں دیتا جن میں حمل کا امکان نہیں ہوتا۔ یہ محض توہم پرستی ہے کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ جو فریقین کے سوا کسی اور پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ جہاں بچے ملوث ہوں وہاں یہ فرض کرنا غلط ہے کہ طلاق کو زیادہ سے زیادہ مشکل بنا کر ان کے مفادات کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ روزمرہ کی بدمستی، تشدد اور جنون ایسی بنیادیں ہیں کہ جن پر نہ صرف میاں بیوی بلکہ بچوں کے مفاد کی خاطر بھی طلاق ضروری ہوتی ہے۔ فی زمانہ ازدواجی بندھن کے بغیر جنسی تعلقات کو دی جانے والی اہمیت بالکل نامعقول ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ بدسلوکی کی گئی

صورتیں کبھی کبھار کی بے وفائی کے مقابلے میں ازدواجی مسرتوں کے لیے زیادہ غارت گر ثابت ہوتی ہیں۔ ازدواجی مسرتوں کے لیے سب سے تباہ کن بات مرد کا ہر سال نیا بچہ حاصل کرنے کا جنون ہے۔

اخلاقی اصول ایسے نہ ہونے چاہییں کہ وہ جبلی مسرت کو ناممکن بنا دیں۔ جس معاشرے میں عورتوں اور مردوں کی تعداد میں زیادہ فرق ہو اس میں یک زوجی پر اصرار کرنے سے جبلی مسرتوں کی راہ میں رکاوٹ آ جاتی ہے۔ بلاشبہ اس قسم کے حالات میں لوگ اخلاقی اصولوں کی پرواہ کم ہی کرتے ہیں۔ لیکن اصول اگر ایسے ہوں کہ انسانوں کی مسرت کو بڑی حد تک قربان کیے بغیر ان کی پابندی نہ کی جا سکتی ہو یا ان کی خلاف ورزی ان کی پابندی سے بہتر ہو جائے تو پھر ان اصولوں کو تبدیل کرنے کا وقت آ جاتا ہے۔ اگر یہ اصول نہ بدلے جائیں اور پرانے دستور پر عمل جاری رہے تو عوامی مفاد کے خلاف کام کرنے والے بہت سے لوگ منافقت سے کام لینے یا پھر ان اصولوں پر کھلم کھلا لعن طعن کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چرچ منافقت کا برا نہیں مناتا۔ لیکن چرچ سے باہر کی دنیا میں اب اس کو ایسی بدی سمجھا جاتا ہے کہ جس سے دامن بچانا ضروری ہے۔

مذہبی توہم پرستی سے زیادہ خطرناک قوم پرستی کی توہم پرستی ہے۔ اس سے مراد فرد کی مملکت سے غیر مشروط اطاعت ہے۔ تاہم یہاں میں اس موضوع پر مفصل بحث کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ لہٰذا بس یہ کہوں گا کہ اپنے ہم وطنوں تک محدود رہنا محبت کے اس اصول کی خلاف ورزی ہے جس کو ہم نے اچھی زندگی کا ایک جزو ترکیبی قرار دیا تھا۔ بلاشبہ اس قسم کا رویہ روشن خیال ذاتی مفاد کے بھی برعکس ہے۔ کیونکہ تنگ نظر قوم پرستی فاتح اقوام کے لیے بھی مفید ثابت نہیں ہوا کرتی۔

مجرموں کے ساتھ ہمارا سلوک ایک اور پہلو ہے جو حقیقت پسندی کے بجائے گناہ کے مذہبی تصور سے جنم لیتا ہے اور معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے۔ مجرموں کو "بدمعاش" اور سزا کا "مستحق" سمجھنے والا نظریہ ایسا نہیں کہ جس کی تائید کوئی معقول اخلاقیات کر سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض لوگ ایسے کام کرتے ہیں کہ جن کو معاشرہ قبول نہیں کر سکتا۔ وہ ان کا سدباب کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ ممکنہ حد تک ان کی روک تھام کرنا چاہتا ہے۔ قتل کو ہم اس معاملے کی سادہ ترین مثال کے طور پر قبول کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی معاشرہ اپنا وجود قائم رکھنا چاہتا ہے اور ہم اس کے الطاف و فوائد سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو پھر ہم لوگوں کو اس امر کی اجازت نہیں دے سکتے کہ

جب ان کا جی چاہے وہ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگیں۔ لیکن اس مسئلے کو خالص سائنسی انداز میں حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم کو محض یہ سوال اٹھانا چاہیے کہ ''قتل کی روک تھام کا بہترین طریقہ کون سا ہے؟''

قتل کی روک تھام کے دو یکساں طور پر موثر طریقوں میں سے ہمیں اس طریقے کو ترجیح دینی چاہیے جو قاتل کے لیے کمتر نقصان کا باعث بنے۔ ڈاکٹر کے آپریشن سے پہنچنے والی تکلیف کی طرح قاتل کو پہنچائی جانے والی تکلیف بھی افسوسناک ہے۔ آپریشن کی تکلیف کی طرح یہ تکلیف بھی ضروری ہوسکتی ہے۔ مگر یہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہے۔ مجرم سے انتقام لینے اور اس کو دوسروں کے لیے عبرت بننے والی مثالی سزا دینے کا جذبہ محض ظلم کی ایک صورت ہے۔ مجرم کو دی جانے والی اذیت کا جواز کبھی بھی انتقامی سزا کے تصور سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

بلاشبہ جرم کی روک تھام اور جرم کی سزا دو مختلف قسم کے مسائل ہیں۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ مجرم کو اذیت پہنچانے کا مقصد جرم کا سدباب کرنا ہے۔ قید خانوں کا ماحول اگر اس قدر اچھا بنا دیا جائے کہ ان میں قیدیوں کو مفت میں اچھی تعلیم ملنے لگے تو ہوسکتا ہے کہ لوگ قید خانوں میں داخل ہونے کے لیے جرائم کرنے لگیں۔ لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قید خانے کو آزاد زندگی کے مقابلے میں ناگوار جگہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا بہترین طریقہ یہ نہیں ہے کہ قید خانوں کو وحشیانہ عقوبت خانے بنا دیا جائے۔ بہرحال میں یہاں تعزیری اصلاحات کے موضوع کو زیر بحث نہیں لانا چاہتا۔ میں صرف یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ مجرم کے ساتھ ہمیں ویسا ہی سلوک کرنا چاہیے جیسا کہ کسی طاعون کے مریض کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ دونوں افراد عام لوگوں کے لیے خطرے کا باعث ہوتے ہیں۔ جب تک وہ خطرہ بنے رہیں ان کی آزادی کو محدود کرنا ضروری رہتا ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ طاعون کے مریض کے ساتھ ہم ہمدردی سے پیش آتے ہیں۔ اس کی تکلیف دیکھ کر ہمارا دل بھر آتا ہے۔ ہم اس پر ترس کھاتے ہیں لیکن مجرم سے ہم شدید نفرت کرتے ہیں۔ یہ طرز عمل معقول نہیں ہے۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ ہسپتال مریضوں کے علاج میں زیادہ کامیاب ہیں جبکہ قید خانے مجرموں کی اصلاح کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔

انفرادی اور اجتماعی نجات

روایتی مذہب کی ایک خامی اس کی فرد پرستی ہے۔اس سے منسلکہ اخلاقیات میں بھی یہی خامی پائی جاتی ہے۔روایتی طور پر مذہبی زندگی روح اور خدا کے مابین مکالمے سے عبارت تھی۔خدا کے حکم کی اطاعت نیکی تھی۔فرد یہ کام معاشرے کی حالت کو نظر انداز کر کے سرانجام دے سکتا تھا۔پروٹسٹنٹ فرقوں نے نجات تلاش کرنے کے تصور کی صورت گری کی مگر اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ مسیحی تعلیمات میں یہ تصور ہمیشہ سے موجود تھا۔تاریخ کے بعض ادوار میں انفرادی نجات کے تصور کی قدر و قیمت تھی۔مگر جدید دنیا میں ہم کو فلاح و بہبود کے انفرادی تصور کے بجائے اجتماعی تصور درکار ہے۔یہاں ہم دیکھیں گے کہ یہ تصور اچھی زندگی کے ہمارے تصور کو کس طرح متاثر کرتا ہے۔

مسیحیت کی نشو ونما سلطنت رومہ کی ان آبادیوں میں ہوئی جو سیاسی قوت سے بالکل محروم تھیں۔ان کی قومی ریاستیں تباہ و برباد کر کے ایک بڑی سلطنت میں شامل کر دی گئی تھیں۔مسیحی عہد کی پہلی تین صدیوں کے دوران مسیحیت کو قبول کرنے والے افراد اپنے عہد کے سماجی یا سیاسی اداروں کو دل کی گہرائیوں سے برا سمجھتے تھے۔مگر وہ ان اداروں کو بدل نہ سکتے تھے۔ان حالات میں انہوں نے فطری طور پر یہ عقیدہ بنالیا کہ نامکمل دنیا میں بھی کوئی فرد کامل ہوسکتا ہے اور بدی کی دنیا میں پارسا بن کر رہ سکتا ہے۔ان کا ایمان یہ ہوگیا کہ اچھی زندگی کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔افلاطون کی کتاب ''جمہوریہ'' سے موازنہ کیا جائے تو میری بات زیادہ واضح ہوسکتی ہے۔اچھی زندگی کی وضاحت کرتے ہوئے افلاطون نے فرد کے بجائے پورے معاشرے کو پیش نظر رکھا تھا۔اس نے یہ انداز انصاف کی تعریف طے کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔جو بنیادی طور پر ایک سماجی تعقل ہے۔وہ ایک جمہوریہ کی شہریت کا خوگر تھا اور اس کو سیاسی ذمہ داری کا بھرپور احساس تھا۔یونانی آزادی کے خاتمے کے بعد رواقیت کو عروج حاصل ہوا۔ضبط نفس پر اصرار کرنے والا یہ فلسفہ اچھی زندگی کے انفرادی تصور کو پیش کرتا ہے۔اس لحاظ سے وہ افلاطونی فلسفے سے دور اور عیسائیت کے قریب تر ہے۔

مغرب کے لوگ عظیم جمہوری معاشروں کے شہری ہیں۔ان کو موزوں اخلاقیات کا نمونہ شہنشاہی روم کے بجائے آزاد ایتھنز کے سماج سے حاصل کرنا چاہیے۔محکوم اور نیم محکوم ملکوں کے سیاسی حالات مختلف ہیں۔اس لیے وہاں مسیح کی تعلیمات جیسی اخلاقیات کے لیے کشش پائی جاتی

ہے۔لیکن ان ملکوں کے قوم پرست بھی انفرادی کے بجائے اجتماعی نجات کے تصور کے حامی ہیں۔ وہ قومی نجات کے خواہاں ہیں۔

جس انداز حیات کو ہم اچھی زندگی قرار دیتے ہیں وہ خاص قسم کے سماجی حالات کا تقاضا کرتی ہے۔ان حالات کے بغیر اچھی زندگی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ہم نے اچھی زندگی کی تعریف یوں کی ہے وہ محبت سے تخلیقی تحریک حاصل کرتی ہے اور علم سے رہنمائی پاتی ہے۔یہ مطلوبہ علم صرف انہی معاشروں میں ممکن ہوسکتا ہے جہاں حکومتیں یا دولت مند افراد اس کی دریافت اور اشاعت کے لیے خود کو وقف کیے ہوں۔مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ سرطان کا مرض تیزی سے پھیل رہا ہے...ہم اس سے کس طرح پیش آئیں؟ فی الحال کوئی شخص اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا اور اس بے چارگی کی وجہ علم کی کمی ہے۔یہ علم اسی وقت میسر ہوگا جب سرطان کے مرض کے اسباب و علاج کی تحقیق کے لیے بڑی بڑی رقوم دستیاب ہوں گی۔ایک اور مثال لیجیے ۔سائنس ،تاریخ ،ادب اور فن کا علم تمام خواہش مند افراد کے لیے قابل حصول ہونا چاہیے۔مگر یہ اس وقت ممکن ہے کہ جب حکام درس و تدریس کے وسیع انتظامات کریں گے۔یہ مقصد مذہبی تبدیلی کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔اسی طرح غیر ملکی تجارت کا معاملہ بھی ہے۔اس کے بغیر برطانیہ عظمیٰ کی نصف آبادی فاقوں کا شکار ہوجائے گی۔اچھا، اگر لوگ فاقہ زدہ ہوں تو ان میں سے بہت ہی کم اچھی زندگی سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔یہاں اس قسم کی مثالوں کا ڈھیر لگانے کی ضرورت نہیں۔اہم نکتہ بس یہ ہے کہ ایک وحدت ہے اور جو کوئی محض اپنے طور پر زندہ رہنے کا مدعی ہے، وہ شعوری یا لاشعوری طور پر کاسہ لیس ہے۔

جونہی ہم اچھی زندگی کے بہت ہی محدود تصور سے باہر نکلتے ہیں تو انفرادی نجات کا وہ خیال محال ہوجاتا ہے جو سیاسی غلامی کے زمانے میں ابتدائی مسیحیوں کے لیے باعث تسکین بنا کرتا تھا۔راسخ الاعتقاد مسیحی تعلیمات کے مطابق اچھی زندگی نیکی اور پارسائی کی زندگی ہے۔نیکی ان کے نزدیک خدا کے ارادے کی اطاعت ہے اور خدا کا ارادہ یا خدا کی مرضی ہر فرد پر اس کے ضمیر کی آواز کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔یہ سارا تصور ہی ان لوگوں کا ہے جو بیرونی استبدایت کے غلام ہوں۔

بات یہ ہے کہ اچھی زندگی صرف نیکی اور پارسائی پر مبنی نہیں ہوئی۔اس میں اور بہت کچھ

ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ذہانت اس کا اہم جزو ہے۔اب جہاں تک ضمیر کا تعلق ہے۔وہ تو بہت ہی گمراہ کن رہنما ہے۔وجہ یہ ہے کہ ضمیر ابتدائے عنفوان شباب میں سنے سنائے پندو نصائح کی مبہم یادوں پر مشتمل ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ضمیر صاحب ضمیر کی ماں یا آیا سے زیادہ عقلمند نہیں ہوتا۔اگر کوئی شخص بھر پور مفہوم میں اچھی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اچھی تعلیم، دوست احباب، بچے (اگر وہ ان کا خواہش مند ہو) محرومی اور شدید پریشانی سے محفوظ رہنے کے لیے مناسب آمدنی، اچھی صحت اور ایسا کام درکار ہوتا ہے جو غیر دلچسپ نہ ہو۔مختلف حد تک ان تمام چیزوں کا دارومدار معاشرے پر ہوتا ہے۔اور سیاسی اموران میں مددگار بنتے ہیں یا رکاوٹ ڈالتے ہیں۔اچھی زندگی اچھے معاشرے میں ہی گزرنی چاہیے۔اس کے بغیر وہ مکمل طور پر ممکن بھی نہیں ہوتی۔

اشرافی آدرش کی بنیادی خامی یہی ہے۔آرٹ، سائنس اور دوستی جیسی بعض اچھی چیزیں ایک اشرافی معاشرے میں ہی اچھی طرح پھل پھول سکتی ہیں۔یہ چیزیں یونان میں پائی جاتی تھیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاشرے میں غلام موجود تھے۔ہمارے معاشرے میں ان کا وجود استحصال کے سبب ہے۔مگر ہمدردی یا فیض رسانی کی صورت میں محبت اشرافی سماج میں آزادی سے وجود نہیں رکھ سکتی۔اشراف نے اپنے آپ کو یقین دلانا ہی ہوتا ہے کہ غلام، مزدور یا رنگ دار انسان کمتر مخلوق ہیں اور یہ ان کی تکلیفوں اور ان کے دکھ درد کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ابھی ماضی قریب تک صورتحال یہ تھی کہ شائستہ انگریز شرفاء افریقیوں کو اس بری طرح مارا پیٹا کرتے تھے کہ وہ چند گھنٹوں کی ناقابل بیان تکالیف کے بعد دم توڑ دیا کرتے تھے۔اچھا اگر یہ شرفاء اعلیٰ تعلیم یافتہ فن کے دلدادہ اور گفتگو کے قابل تعریف ماہر ہوتے تو بھی مجھے یہ ماننے سے انکار ہوتا کہ وہ اچھی زندگی کے حامل ہیں۔انسانی فطرت ہمدردی کو محدود کیا کرتی ہے۔مگر ان شرفاء کی حد تک نہیں جمہوری رویے رکھنے والے کسی سماج میں کوئی فاترالعقل شخص ہی اس قسم کا برتاؤ کر سکتا ہے۔اشرافی آدرش کی ہمدردی کی حد ہی اس کی وجہ ملامت ہے۔نجات ایک اشرافی آدرش ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انفرادیت پسند آدرش ہے۔پھر یہی سبب ہے کہ ہم انفرادی نجات کے تصور کی چاہے کوئی بھی توجیہ کریں یا اس کو چاہے جتنا بھی پھیلائیں۔وہ اچھی زندگی کی تعریف میں شامل نہیں ہو سکتا۔

نجات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ سینٹ پال کی تبدیلی مذہب کی طرح، ہمیشہ سخت قسم

کی اچانک اتھل پتھل سے جنم لیتی ہے۔ شیلے کی نظموں میں اس قسم کی اتھل پتھل کی مثال ملتی ہے۔اچھا کوئی شخص یہاں یہ کہہ سکتا ہے کہ شاعر تو غیر اہم فرد ہوتا ہے جس کے خیالات کی کوئی قدر ومنزلت نہیں ہوتی ۔تاہم مجھے یقین ہے کہ انقلابی رہنماؤں کی خاصی بڑی اکثریت کے خیالات شیلے سے بہت حد تک ملتے جلتے تھے۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ دکھ، جبر اور توہین کا سبب مطلق العنان حکمران، مذہبی رہنما یا سرمایہ دار ہیں۔اگر بدی کے ان منابع کو الٹ پلٹ دیا جائے تو پھر لوگوں کے رویے بدل جائیں گے اور وہ سب ہنسی خوشی زندگی گزار سکیں گے۔اس قسم کے اعتقادات کی وجہ سے وہ لوگ ''جنگ کے خاتمے کے لیے جنگ کرنے'' پر آمادہ رہے ہیں۔اس میں نسبتاً خوش قسمت امیدوں کے لٹنے کے باعث مایوسی اور قنوطیت کے بھنور میں ڈوب جاتے ۔آخری تجزیے میں یہ امیدیں نجات کی راہ کی حیثیت سے آشوبی کے مسیحی تصور سے پیدا ہوتی تھیں۔

میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ انقلاب کبھی ضروری نہیں ہوا کرتے ۔تاہم میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ یہ مسرتوں کے عہد کی طرف لے جانے والے مختصر راستے نہیں ہیں۔اچھی زندگی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی اس کے حصول کا کوئی مختصر یا سہل راستہ نہیں ہے۔اچھی زندگی تک رسائی پانے کے لئے ہم کو ذہانت ضبط نفس اور ہمدردی حاصل کرنی ہوگی ۔یہ مقداری معاملہ ہے ۔بتدریج بہتری، ابتدائی تربیت اور تعلیمی تجربے کا معاملہ ہے۔صرف بے صبری ہی ہم کو اچانک بہتری کے امکان میں یقین رکھنے پر اکساتی ہے ۔ممکنہ بتدریج بہتری اور اس کو حاصل کرنے کے طریقے مستقبل کی سائنس کا معاملہ ہیں۔پھر بھی کچھ نہ کچھ ہم اس وقت بھی کہہ سکتے ہیں۔آگے چل کر میں اس کو جزوی طور پر بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

سائنس اور مسرت

معلمین اخلاق کا مقصد انسانوں کے کردار کو بہتر بنانا ہے۔یہ ایک قابل تعریف خواہش ہے کیونکہ انسانوں کا بیشتر کردار قابل مذمت ہی ہوتا ہے۔لیکن میں معلمین اخلاق کی تعریف ان کی مطلوبہ بہتریوں یا ان کو حاصل کرنے کے ان کے طریقوں کی بنا پر نہیں کہہ سکتا۔معلم اخلاق کا واضح طریقہ اخلاقی پند و وعظ ہے۔اب اگر وہ بنیاد پرست ہے تو اس کا حقیقی طریقہ معاشی جزا و سزا کا

ایک نظام ہے۔ جہاں تک اخلاقی پندو وعظ کا تعلق ہے۔اس کے نتائج مستقل یا اہم نہیں ہوتے۔ تاریخ ہم کو یہی بتاتی ہے کہ بڑے بڑے اخلاقی معلمین کے اثرات بھی عارضی ہی ہوا کرتے ہیں۔ انعامات یا سزاؤں کے اثرات البتہ خاصے اہم ہوتے ہیں مثال کے طور پر وہ کسی مرد کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ وقتی طوائفوں کو نیم مستقل داشتہ پر ترجیح دے۔ کیونکہ وہ طریقہ کار اختیار کرنا ضروری ہے۔جس کو چھپانا سب سے زیادہ آسان ہے۔اس میں یہ ہوتا ہے کہ طوائفوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہےاور جنسی امراض بھی ختم نہیں ہوتے۔ بلاشبہ یہ معلمین اخلاق کے پسندیدہ نتائج نہیں ہوں۔مگر ان صاحبان کا رویہ اس قدر غیر سائنسی ہے کہ ان کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ ان نتائج کا سبب بن رہے ہیں۔

کیا کوئی بہتر شے ہے جو وعظ و تلقین اور خرابی کے اس غیر سائنسی ملغوبے کی جگہ لے سکے؟ میرے خیال میں ایسی شے موجود ہے۔

انسانوں کے افعال لاعلمی یا بری خواہشوں کے سبب نقصان دہ ہوتے ہیں۔سماجی نقطہ نظر سے بات کرتے ہوئے ہم ''بری'' خواہشوں کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ ان سے مراد ایسی خواہشیں ہیں جو دوسروں کی خواہشوں کی مزاحمت کرتی ہیں۔زیادہ صریح طور پر یوں کہئے کہ یہ وہ خواہشیں ہیں جو کم خواہشوں کی مددگار ہوتی ہیں اور زیادہ خواہشوں کی راہ روکتی ہیں۔لاعلمی اور جہالت سے پیدا ہونے والے نقصان کی وضاحت ضروری نہیں۔یہاں ضرورت محض زیادہ علم کی ہے۔گویا بہتری کی طرف لے جانے والی راہ تحقیق و دریافت اور زیادہ تعلیم کی راہ ہے۔البتہ جہاں تک بری خواہشوں سے پیدا ہونے والے نقصان کا تعلق ہے وہ زیادہ مشکل معاملہ ہے۔

عام مردوں اور عورتوں میں ایک خاص حد تک خباثت ہوتی ہے۔وہ اپنے دشمنوں کے بدخواہ ہوتے ہیں اور دوسروں کی بدقسمتی سے لطف بھی اٹھاتے ہیں۔اس خباثت پر خوبصورت لفظوں کا پردہ ڈالنے کا رواج ہے۔یوں سمجھئے کہ روایتی اخلاقیات کا لگ بھگ حصہ اس خباثت کا نقاب ہے لیکن ہمارے اعمال کو بہتر بنانے کا معلمین اخلاق کا مقصد حاصل کرنا ہے تو پھر اس خباثت کو چھپانے کے بجائے اس کے وجود کا اقرار کرنا چاہیے۔ہزاروں چھوٹے بڑے طریقوں سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔مثال کے طور پر اس کا اظہار اس ذوق وشوق میں ہوتا ہے جس کے ساتھ لوگ کسی سکینڈل میں یقین کرتے ہیں اور اس کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔مجرموں کے

ساتھ روا رکھے جانے والے بے رحم سلوک کے پیچھے بھی یہی خباثت کارفرما ہوتی ہے۔ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے ان کی اصلاح کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ لیکن ہم اچھے سلوک پر مائل نہیں ہوتے بلکہ فطری خباثت کے سبب مجرموں کی اصلاح یا ان کو عبرت ناک سزا دینے کے نام پر ان پر ظلم وستم روا رکھتے ہیں۔ خباثت کے اظہار کی اور بھی ہزاروں صورتیں ہیں۔ یہ انسانی فطرت کی بدترین خصوصیت ہے۔ انسانی مسرتوں میں اضافہ کرنے کے لیے اس کو تبدیل کرنا بہت ضروری ہے۔ غالباً جنگوں کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی خباثت رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں معاشی اور سیاسی اسباب کو بہت کم دخل رہا ہے۔

اچھا تو سوال یہ ہے کہ ہم اس خباثت سے کس طرح نمٹ سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کو اس کے اسباب سمجھنے چاہئیں۔ میرے خیال میں اس کے اسباب جزوی طور پر سماجی ہیں اور جزوی طور پر عضویاتی ہیں۔ تمام گزشتہ ادوار کی طرح آج کی دنیا بھی زندگی اور موت کی مسابقت پر مبنی ہے۔ جنگ عظیم کے پیچھے مرکزی سوال یہ تھا کہ آیا جرمن یا اتحادی بچوں کو بھوک اور قحط کے ہاتھوں مرنا چاہیے۔ دیکھئے ناں اگر اس جنگ کے فریقین خباثت سے کام نہ لے رہے ہوتے تو پھر دونوں کے بیک وقت زندہ رہنے کے حق کا احترام نہ کرنے کا کوئی چھوٹا موٹا سبب بھی موجود تھا۔ اکثر لوگوں کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں تباہ ہو جانے کا خوف چھپا ہوتا ہے۔ یہ خوف ان کو پریشان کیے رکھتا ہے۔ بچوں والے لوگ خاص طور پر اس خوف کی زد میں ہوتے ہیں۔ امیروں کو یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ غریب ان کے محلوں پر ہلہ بول دیں گے۔ غریبوں کو نوکری چھوٹ جانے یا بیمار ہو جانے کا ڈر رہتا ہے۔ ہر کوئی تحفظ کی ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہے اور سمجھتا ہے کہ تحفظ پانے کے لیے اپنے امکانی دشمنوں کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ افراتفری کے اس عالم میں ظلم پھیلتا ہے اور اس کی شدت بھی بڑھ جاتی ہے۔

اس صورتحال میں سائنسی ذہن رکھنے والے معلمین اخلاق کو خوف کے سد باب پر خاص توجہ دینی چاہیے۔ اس کام کو دو طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ تحفظ بڑھا دیا جائے اور دوسرا یہ ہے کہ حوصلہ و جرات میں اضافہ کیا جائے۔ یہ امر پیش نظر رہے کہ میں یہاں خوف کا ذکر ایک خلاف عقل جذبے کے طور پر کر رہا ہوں۔ یہاں اس سے مراد کسی امکانی بدقسمتی کی معقول پیش گوئی نہیں ہے۔ جب کسی تھیٹر کو آگ لگتی ہے تو کوئی معقول شخص بھی تباہی کی اس طرح واضح پیش

بنی کر لیتا ہے جس طرح خوف سے بے حد ہیجان زدہ کوئی شخص کرتا ہے۔ مگر دونوں کا ردعمل مختلف ہوتا ہے۔ پہلا شخص افراتفری کے عالم تباہی کو بڑھا دیتا ہے۔ 1914ء کے بعد سے یورپ کی حالت اس تھیٹر کے ہیجان زدہ تماشائیوں جیسی ہے جس کو آگ لگی ہو۔ اس کو دھکم پیل اور ایک دوسرے کو افراتفری کے عالم میں پاؤں تلے روندے بغیر آتش زدہ عمارت سے باہر نکلنے کے لیے پرسکون اور حکیمانہ احکامات درکار ہیں۔ وکٹوریائی زمانہ اپنی تمام خرافات کے باوجود تیز رفتار ترقی کا زمانہ تھا۔ وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگ خوف سے محفوظ تھے اور ان کے پاس امید تھی۔ اگر ہم دوبارہ ترقی چاہتے ہیں تو پھر سے امید ڈھونڈنی ہوگی۔

عمومی تحفظ کو بڑھانے والی ہر شے ظلم کو کم کر دیتی ہے۔ اس امر کا اطلاق جنگ کے سدباب پر بھی ہوتا ہے۔ چاہے یہ کام اقوام متحدہ کے وسیلے سے کیا جائے یا کسی اور وسیلے سے۔ اسی طرح اگر ہم غربت محتاجی اور بیماری کو کم کر سکیں تو انسانوں کے ذہن کے تاریک گوشوں میں چھپے خوف کم ہو سکتے ہیں لیکن انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی قیمت پر تحفظ فراہم کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لہٰذا مثال کے طور پر جرمنوں کی قیمت پر فرانسیسیوں کو، مزدوروں کے خون پسینے پر محنت کشوں کو اور پیلے آدمی کی قیمت پر سفید آدمی کو تحفظ فراہم کرنے کی کوششیں ہلاً خرابے سدا رہیں گی۔ اس قسم کے طریقوں سے الٹے نتیجے نکلتے ہیں چنانچہ بالاتر گروہ کو تحفظ تو کیا ملتا ہے وہ اور بھی زیادہ خوف و ہراس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس خیال سے اس کی نیندیں اڑ جاتی ہیں کہ زیردست گروہ کسی نہ کسی روز اس کا گریبان پکڑ لے گا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ صرف انصاف ہی تحفظ مہیا کر سکتا ہے۔ انصاف سے میری مراد تمام انسانوں کے مساوی حقوق کو تسلیم کرنا ہے۔

سازگار سماجی تبدیلیوں کے ذریعے تحفظ مہیا کرنے کے علاوہ خوف کو کم کرنے کا ایک براہ راست طریقہ بھی ہے...... وہ یہ ہے کہ خوف کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمت و جرات بڑھائی جائے۔ لڑائیوں میں جرات مندی کی اہمیت کے پیش نظر انسانوں نے بہت پہلے تعلیم اور خوراک کے ذریعے حوصلہ و جرات بڑھانے کا طریقہ دریافت کر لیا تھا۔ مثال کے طور پر انسانی گوشت کھانے کو اس سلسلے میں مفید سمجھا جاتا تھا، تاہم، لڑاکا جرات حکمران ذاتوں کا استحقاق خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ انگریز افسروں کو ہندستانی سپاہیوں، گوروں کو کالوں اور مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں دلیر قرار دیا جاتا تھا۔ صدیوں تک جرات مندی کو اشرافیہ کی امتیازی خوبی ٹھہرایا جاتا رہا۔ حکمران طبقے

کی دلیری میں ہر اضافہ عوام پر ظلم وستم کا بوجھ بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یوں عوام کا خوف وہراس اور بھی بڑھ جاتا اور ظلم کی بنیادیں زیادہ مضبوط ہو جاتیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جرات مندی صرف اس وقت انسانوں کے لیے خوبی بن سکتی ہے جب اس کو جمہوری بنایا جائے۔

حالیہ واقعات نے جرات مندی کو پہلے ہی خاصی حد تک جمہوری بنا ڈالا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں خواتین کے حق رائے دہی کی حمایت کرنے والی عورتوں نے اپنی جدوجہد کے ذریعے واضح کر دیا کہ وہ اتنی ہی جرات مند ہیں جتنے کہ بہادر ترین مرد ہیں۔ اس مظاہرے کے ذریعے ہی وہ عورتوں کو حق رائے دہی دلوانے میں کامیاب ہوئیں۔ جنگ عظیم کے دوران ایک عام سپاہی کو اتنی ہی جرات مندی درکار تھی جتنی ایک کیپٹن یا لیفٹیننٹ کو۔ کسی جنرل سے زیادہ اس کو جرات مندی درکار ہوا کرتی تھی۔ خود کو محنت کش طبقے کے چیمپئن قرار دینے والے کمیونسٹوں کے بارے میں آپ چاہے جو بھی کہیں، وہ جرات مندی سے محروم نہ تھے۔ اس امر کی تصدیق ان کے انقلاب کے پہلے کے ریکارڈ سے ثابت ہو جاتی ہے۔ جاپان میں پہلے سمورائی طبقے کی بہادری پر اجارہ داری سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جبری بھرتی نے تمام مردانہ آبادی میں بہادری کی ضرورت پیدا کر دی۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ حالیہ زمانے میں بڑی قوموں نے جرات مندی کو اشرافیہ کی اجارہ داری سے نکالنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو پھر جمہوریت کو اس سے زیادہ خطرہ لاحق ہوتا جتنا کہ اب ہے۔

خیر لڑائی جھگڑے میں کام آنے والی جرات مندی ہی سب کچھ نہیں ہے۔ جرات مندی کی بہت سی قسمیں ہیں اور یہ جرات مندی نہ تو واحد قسم ہے اور نہ ہی اہم ترین۔ غربت کا مقابلہ کرنے میں جرات مندی ہے۔ دوسروں کی طرف سے تضحیک وتمسخر کا مقابلہ کرنے اور اپنے ہی لوگوں کی طرف سے دشمنی کا مقابلہ کرنے میں بھی جرات مندی ہے۔ یہ وہ معاملے ہیں کہ جن میں بہادر ترین لڑاکے بھی عام طور پر افسوس ناک ڈرپوک ثابت ہوا کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر خطرے کی صورتحال میں پرسکون اور معقول طریقے سے سوچنے اور افراتفری سے پیدا ہونے والے طیش کو کنٹرول کرنے کی جرات مندی ہے۔ بلاشبہ یہ ایسی خوبیاں ہیں کہ جن کو حاصل کرنے میں تعلیم مدد دے سکتی ہے۔ صحت اچھی ہو، جسم مضبوط ہو، مناسب غذا دستیاب ہو اور بنیادی حیاتی جبلتوں کی تسکین آسانی سے ہو رہی ہو تو پھر فرد کو جرات مندی کی کوئی بھی قسم آسانی سے سکھائی جا سکتی ہے۔

شاید ہم بلی اور خرگوش کے خون کا آپس میں موازنہ کر کے جرات مندی کے عضویاتی منابع کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ جرات مندی کو بڑھانے میں سائنس بے انتہا خدمات سر انجام دے سکتی ہے۔ جرات مندی بڑھانے والے امور وہ ہیں جن سے امیر طبقے کے لڑکے لطف اندوز ہوا کرتے ہیں۔ غریبوں میں جس جرات مندی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے وہ قیادت اور پیش قدمی کے بجائے دوسروں کے احکامات کی تعمیل سے تعلق رکھتی ہے۔ جب قیادت عطا کرنے والی خوبیاں عالمگیر ہو جائیں گی تو پھر لیڈر اور مقلد کی تقسیم بھی ختم ہو جائے گی اور حقیقی جمہوریت وجود میں آجائے گی۔

بہر حال یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ خباثت صرف خوف سے جنم نہیں لیتی۔ حسد اور مایوسی کو بھی اس میں دخل حاصل ہے کینہ وبغض کے وسیلہ کے طور پر لنگڑوں اور کبڑوں کی حسد تو ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔ تاہم دوسری قسم کی بدقسمتیاں بھی ایسے ہی نتائج کا باعث بنا کرتی ہیں۔ اگر کسی مرد یا عورت کو جنسی تسکین سے محروم رکھا جائے تو وہ جلن اور حسد سے بھر جاتی ہے۔ عموماً اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جنسی بھوک کے مارے لوگ زیادہ خوش قسمت لوگوں کی اخلاقی مذمت شروع کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی دیکھئے کہ انقلابی تحریکوں کو آگے بڑھانے والے لوگ وہ ہوتے ہیں جو امیروں کی حسد میں مبتلا ہوتے ہیں۔ رقابت حسد کی ایک خصوصی صورت ہے۔ یہ محبت کی حسد ہے بزرگ اکثر اوقات نوجوانوں سے حسد کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے ساتھ ان کا برتاؤ ظالمانہ ہو جاتا ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے حسد سے نمٹنے کا طریقہ بس یہ ہے کہ حاسد لوگوں کی زندگی کو زیادہ خوش باش اور بھرپور بنایا جائے اور نوجوانوں میں باہمی مسابقت کے بجائے اجتماعی مہم بازی کی رغبت پیدا کی جائے۔ حسد کی بدترین صورتیں ان لوگوں میں ملتی ہیں جو شادی، بچوں یا کیریئر کے معاملے میں محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ بہتر سماجی اداروں کو وجود میں لا کر ان بدقسمتیوں سے عموماً محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ خیر، یہ مان لینا چاہیے کہ اس کے بعد بھی تھوڑی بہت حسد شاید باقی رہ ہی جائے گی۔ تاریخ میں جرنیلوں کی باہمی رقابت کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ بعض جنرل اس قدر حاسد تھے کہ وہ دوسرے کی شہرت میں اضافہ پر شکست کو ترجیح دے دیتے تھے۔ کسی ایک جماعت کے دو سیاست دان یا کسی ایک مکتبہ فکر کے دو فنکار کم وبیش لازمی طور پر ایک دوسرے سے حسد کر

تے ہیں۔ اس قسم کے معاملات میں بظاہر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ حریفوں کو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے ممکنہ حد تک روکا جائے اور صرف بہتر خوبیوں والا ہی آگے بڑھ سکے۔ عام طور پر کسی فنکار کی دوسرے فنکار کے لیے رقابت زیادہ نقصان دہ نہیں ہوا کرتی۔ وجہ یہ ہے کہ وہ رقیب فنکار کے فن کو تباہ نہیں کر سکتا۔ صرف بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر کے ہی وہ اس کو نیچا دکھا سکتا ہے۔ جہاں کہیں حسد ناگزیر ہو وہاں اس کو رقیبوں کی کوششوں کو خراب کرنے کے بجائے اپنی کوششوں کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔

انسانی مسرتوں میں اضافہ کرنے کے سائنس کے امکانات انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کے اثرات کم کرنے تک محدود نہیں جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے تک محدود ہیں اور اس لیے ہم ان کو ''بڑا'' قرار دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مثبت برتری میں اضافہ کرنے کے سائنس کے امکانات کی غالباً کوئی حد نہیں ہے۔ صحت کا شعبہ لیجیے۔ سائنس نے اس میں شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ماضی پرستوں کی بائے ہو کے باوجود ہم مثال کے طور پر اٹھارہویں صدی کے کسی طبقے یا قوم کے مقابلے میں زیادہ عرصہ زندہ رہتے ہیں اور کم بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس جو علم موجود ہے اس کو قدرے زیادہ بروئے کار لا کر ہم اور بھی زیادہ صحت مند زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ مستقبل کی دریافتیں اس عمل کو شدید تر کر دیں گی۔

طبعی سائنس نے اب تک ہماری زندگی کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ مستقبل میں غالباً عضویات اور نفسیات زیادہ متاثر کن ثابت ہوں گی۔ جب ہم کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ انسانی کردار کس طرح عضویاتی کیفیات پر منحصر ہوتا ہے تو پھر اگر ہم چاہیں گے تو پسندیدہ کردار کے زیادہ سے زیادہ انسان پیدا کر سکیں گے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ سائنس ذہانت، فنکارانہ اہلیت اور ہمدردی جیسی صفات بڑھا سکتی ہے۔ انسان سائنس کو عقل مندی سے استعمال کریں تو وہ بہتر دنیا کی تشکیل میں حائل تمام رکاوٹیں دور کر سکتی ہے۔ تاہم میں ایک اور جگہ پہلے ہی اپنے اس خدشے کا اظہار کر چکا ہوں کہ انسان سائنس سے حاصل ہونیوالی قوت کو دانائی سے بروئے کار لانے کے قابل شاید ثابت نہ ہوں گے۔

انسانی زندگی پر سائنس کے اطلاق کے بارے میں ایک رویہ ایسا بھی ہے جس سے مجھے کلی طور پر اتفاق نہیں۔ لیکن اس سے کچھ نہ کچھ ہمدردی ضرور ہے۔ یہ ''غیر فطری'' سے خائف لوگوں کا

رویہ ہے۔ یورپ میں روسو اس نقطہ نظر کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ تاہم ایشیا میں لاؤزے نے اڑھائی ہزار سال پہلے اس کو اور بھی زیادہ موثر انداز میں پیش کیا تھا۔ میرے خیال میں "فطرت" کی مدح و تحسین میں سچ اور جھوٹ دونوں مل گئے ہیں جن کو جدا کرنا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ "فطرت" ہے کیا؟ سرسری طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ "فطرت" سے مراد وہ سب کچھ ہے جس کا کوئی شخص بچپن میں خوگر رہا ہوتا ہے۔ لاؤزے کی مثال لیجئے۔ اس نے سڑکوں، گاڑیوں اور کشتیوں پر اعتراض کیا تھا۔ غالباً یہ سب چیزیں اس کے پیدائشی گاؤں میں موجود نہ تھیں۔ روسو بچپن سے ان چیزوں کا عادی تھا۔ لہٰذا وہ ان کو فطرت کے خلاف قرار نہیں دیتا۔ ہاں اگر وہ ریل گاڑیوں کی ایجاد تک زندہ رہتا تو ضرور ان کے خلاف آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ کپڑوں اور کھانے پکانے کا رواج اس قدر قدیم ہے کہ فطرت کے اکثر حامیوں نے اس کی مذمت نہیں کی۔ تاہم وہ ان معاملات میں نت نئے تجربوں اور طریقوں کے شدید مخالف ہیں۔ مجرو زندگی کو برداشت کرنے والے بھی برتھ کنٹرول کو برا بھلا کہتے ہیں۔ وجہ محض یہ ہے کہ مجرو زندگی فطرت کی خلاف ورزی کا قدیم طریقہ ہے جبکہ برتھ کنٹرول اس خلاف ورزی کی نئی صورت ہے۔ ان تمام معاملات کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ "فطرت" کا پرچار کرنے والوں کی رائے غیر مربوط ہے۔ ان میں تضاد پائے جاتے ہیں۔ یوں ہم ان کو محض قدامت پرست قرار دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ان ساری باتوں کے باوجود ان لوگوں کے حق میں بھی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ وٹامنز کی مثال لیجئے جن کی دریافت نے "قدرتی" غذاؤں کے حق میں ایک شدید ردعمل پیدا کرا دیا ہے۔ تاہم لگتا ہے کہ وٹامنز روغن ماہی اور بجلی کی روشنی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں انسانوں کی فطری غذاؤں کا حصہ نہیں ہیں۔ یہ مثال ہمیں بتاتی ہے کہ علم کی عدم موجودگی میں فطرت سے کوئی نیا انحراف غیر متوقع نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن جب اس نقصان کا علم حاصل ہو جاتا ہے تو پھر کسی نئے مصنوعی انداز کے ذریعے اس کا مداوا کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ہمارے طبعی ماحول اور ہماری خواہشوں کی تسکین کے طبعی طریقوں کا تعلق ہے، میرا نہیں خیال کہ "فطرت" کا نظریہ نئی تراکیب کو قبول کرنے میں ایک خاص حد تک تجرباتی احتیاط سے آگے کسی کو جائز قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ لباس فطرت کے خلاف ہوتے ہیں۔ پھر ان کے لیے ایک اور غیر فطری عمل کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ ہے لباس کو دھونا۔ بیماریوں سے محفوظ رہنا ہے تو

پھر ہمیں اپنے لباس کو صاف ستھرا رکھنا پڑتا ہے۔لیکن یہ دونوں غیر فطری کام مل کر انسان کو اس وحشی سے زیادہ صحت مند بنا دیتے ہیں جوان دونوں سے اجتناب کرتا ہے۔

انسانی خواہشوں کے معاملے میں ''فطرت'' کے لیے کچھ اور بھی کہنے کو ہے۔مرد، عورت یا کسی بچے پر اس کی شدید ترین خواہشوں کی نفی کرنے والی زندگی ٹھونسنا ظلم ہے اور خطرناک بھی۔ اس اعتبار سے ''فطرت'' سے ہم آہنگی کے لیے بعض شرائط کی موجودگی ضروری ہوگی۔زیر زمین چلنے والی بجلی کی ریل گاڑی کو دیکھئے اس سے زیادہ مصنوعی شے اور کیا ہو سکتی ہے۔لیکن جب کسی بچے کو اس گاڑی میں سفر کروایا جاتا ہے تو اس کی فطرت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔اس کے برخلاف کم وبیش سبھی بچے اس قسم کی ریل گاڑی میں سفر کرنے سے لطف اٹھاتے ہیں۔گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ عام لوگوں کی خواہشیں پوری کرنے والی مصنوعی اشیاء اچھی ہوتی ہیں۔لیکن زندگی کے ان طور طریقوں کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہی جا سکتی جو اس لحاظ سے مصنوعی ہوتے ہیں کہ لوگ ان کو خود قبول نہیں کرتے بلکہ کوئی اتھارٹی یا معاشی جبر ان کو لوگوں کو مسلط کر دیتا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ آج کے زمانے اس قسم کے طرز حیات کسی حد تک ناگزیر ہو چکے ہیں۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ملازمت کی خاطر بے شمار لوگ ایسے فرائض قبول کر لیتے ہیں جن کو خوشگوار قرار دینا ممکن نہیں۔ اس طرح بڑے بڑے شہروں میں لوگ تنگ وتاریک مکانوں میں رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔اس قسم کے جبر قابل افسوس ہیں اور ہم کو ان سے بچنے کے طریقے تلاش کرنے چاہئیں۔

ایک خاص حد تک کام یا محنت مزدوری کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ کام کا ناپسند کرتے ہیں۔دس میں سے نو افراد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کے بجائے کام کر کے خوش ہوتے ہیں۔لیکن آج کے زمانے میں اکثر لوگوں کو جس قدر اور جس قسم کا کام کرنا پڑتا ہے وہ واقعی پریشان کن خرابی ہے۔زندگی بھر ایک ہی کام کرتے رہنے کی بندش تو بالکل خرابی کی بات ہے۔زندگی اس قدر منضبط اور کڑے اصولوں اور قاعدوں کی غلام نہ ہونی چاہیے۔ہماری خواہشوں اور تحریکوں کو آزادنہ اظہار کے مواقع ملنے چاہئیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ دوسروں کے لیے تباہ کن اور نقصان دہ نہ ہونی چاہئیں۔زندگی میں مہم جوئی کے لیے گنجائش ہونی چاہیے۔ہم کو انسانی فطرت کا احترام کرنا چاہیے۔ہماری خواہشیں اور جبلتیں ہی وہ مواد ہیں جن سے ہماری خوشی جنم لیتی ہے ۔انسانوں کو وہ کچھ دینے کا کوئی فائدہ نہیں جس کو تجریدی طور پر ''اچھا'' سمجھا جاتا ہے۔اگر ان کی

خوشیوں کو بڑھانا مقصود ہے تو پھر ان کو وہ کچھ دیا جائے جس کی ان کو خواہش ہے یا جس کی ان کو ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ کبھی سائنس ہماری خواہشوں کو اس طرح ڈھالنے کے طریقے ڈھونڈ لے جس سے انسانوں کی خواہشوں کے درمیان تصادم کی شدت کم ہو جائے۔ایسا ہوا تو پھر ہم موجودہ زمانے سے زیادہ اپنی خواہشیں پوری کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔اس مفہوم میں اور صرف اسی ایک مفہوم میں ہماری خواہشیں ''بہتر'' ہو جائیں گی۔علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو کوئی ایک خواہش کسی اور خواہش سے بہتر ہوتی ہے اور نہ ہی بدتر۔البتہ خواہشوں کی بیک وقت تسکین ممکن ہو اور دوسرے مجموعے میں شامل خواہشیں آپس میں ہم آہنگ نہ ہوں اسی وجہ سے محبت نفرت سے بہتر ہے۔

طبعی فطرت کا احترام کرنا، اس کے آگے سر جھکانا، حماقت ہے۔احترام کے بجائے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے تا کہ اس سے انسانوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت لی جاسکے۔اور انسانوں کے مقاصد کے حصول کا وسیلہ بنایا جاسکے۔اخلاقی اعتبار سے دیکھا جائے تو طبعی فطرت اچھی ہے اور نہ بری۔جہاں کہیں طبعی فطرت اور انسانی فطرت کے مابین باہمی عمل ہو...... جیسا کہ آبادی کے شعبے میں ہوتا ہے...... تو مجہول پرستش میں ہاتھ باندھ لینے اور محض جنگ، وباء اور قحط کو اس مسئلے کا امکانی حل مان لینے کی ضرورت نہیں۔اہل مذہب کا کہنا یہ ہے کہ آبادی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے سائنس کو استعمال کرنا گناہ ہے۔اس کے بجائے انسانوں کو چاہیے کہ وہ جنسی لذتوں سے پرہیز کریں۔ان اہل مذہب سمیت سب کو معلوم ہے کہ ان کے مشورے پر کوئی عمل نہیں کرے گا۔پھر بھی وہ مشورے دیئے چلے جاتے ہیں۔خیر، سوال یہ ہے کہ آبادی کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے سائنس سے مدد لینے میں گناہگاری کیا ہے؟ اس کا معقول جواب کسی کے پاس نہیں۔زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اس سوال کے جواب میں قدیم عقیدوں کو دہرا دیا جاتا ہے۔

آبادی کے مسئلے کا جو حل اہل مذہب پیش کرتے ہیں اس میں بھی فطرت کی خلاف ورزی ویسے ہی موجود ہے جیسی کہ برتھ کنٹرول میں ہے۔وہ جنسی لذتوں سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔یہ مشورہ قبول کر لیا جائے تو اس سے انسانی مسرتوں کو ضعف پہنچے گا۔حسد اور ایذا رسانی کو تقویت ملے گی۔جنون کا خدشہ بڑھ جائے گا۔گویا اہل مذہب کا مشورہ مان لینے سے انسانی فطرت کو ضعف پہنچے گا۔اس کے برخلاف میں طبعی فطرت کو ''ضعف'' پہنچانے کو ترجیح دیتا ہوں۔یہ ضعف ویسا ہی

ہے جیسا کہ چھتری کے استعمال سے پہنچتا ہے۔ بارش میں جب آپ چھتری تان لیتے ہیں تو یہ مصنوعی طریقہ آپ کو طبعی فطرت کے عمل سے محفوظ کر دیتا ہے۔ یہ مثال بتا دیتی ہے کہ فطرت کی پیروی کرنے کے اصول کا اطلاق کس قدر مبہم اور غیر یقینی ہے۔

فطرت یہاں تک کہ انسانی فطرت بھی، مطلق مفروضہ کے طور پر مسلسل زوال پذیر رہے گی۔ اس کی صورت زیادہ سے زیادہ ویسی ہی بنتی چلی جائے گی، جیسی کہ سائنس کی ہنر مندی نے اس کو بنایا ہے۔ سائنس چاہے تو ہمارے پوتے پوتیوں کو علم ضبط نفس اور الجھاؤ کے بجائے ہم آہنگی سے پیدا ہونے والے اوصاف سے نواز کر اچھی زندگی بسر کرنے کے اہل بنا سکتی ہے۔ اس وقت سائنس ہمارے بچوں کو ایک دوسرے کو تباہ کرنے کا درس دے رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے اصحاب سائنس، انسانیت کے مستقبل کو اپنی عارضی خوشحالی پر قربان کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جب انسانوں کو اپنے جذبوں پر ویسا ہی غلبہ حاصل ہو جائے گا جیسا کہ ان کو خارجی دنیا کی طبعی قوتوں پر حاصل ہے تو پھر یہ مرحلہ بھی گزر جائے گا۔ تب ہی وہ دن آئے گا کہ جب ہم اپنی آزادی حاصل کر لیں گے۔



کیا ہم موت کے بعد زندہ رہتے ہیں؟

کیا ہم موت کے بعد بھی موجود رہیں گے؟ اس مسئلے پر بامعنی بحث کرنے سے پہلے آیئے ہم دیکھیں کہ کوئی شخص کن معنوں میں آج بھی وہی ہے جو کہ وہ کل تھا۔ فلسفی یہ سمجھا کرتے تھے کہ روح اور جسم قطعی جوہر میں۔ گزرتے ہوئے دنوں میں ان کا وجود برقرار رہتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب کوئی روح ایک مرتبہ تخلیق ہو جاتی ہے تو پھر وہ فنا نہیں ہوتی۔ آنے والے تمام وقتوں میں اس کا وجود برقرار رہتا ہے۔ جسم کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ موت کے بعد وہ فنا ہو جاتا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں۔ روز حشر وہ پھر سے وجود میں آئے گا۔

اس نظریئے کے جس حصے کا تعلق موجودہ زندگی سے ہے، وہ خاص یقینی حد تک غلط ہے۔ جسم کا مادہ نشو نما اور فرسودگی دونوں کے باعث مسلسل تغیر پذیر رہتا ہے۔ اچھا ایسا نہ ہوتا تو بھی طبیعات ہم کو یہ بتاتی ہے کہ ایٹم مستقل وجود نہیں رکھتے۔ وہ ہر دم بدلتے رہتے ہیں، چنانچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہے وہ ایٹم جو چند منٹ پہلے بھی موجود تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی جسم کا تسلسل محض ظاہری معاملہ ہے۔ یہ نظر کا فریب ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

ذہن کے بارے میں بھی یہی بات درست ہے۔ ہم سوچتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور عمل کرتے ہیں لیکن خیالات، احساسات اور اعمال کے علاوہ ذہن یا روح جیسی کوئی شے موجود نہیں جو ان واقعات سے گزرتی ہے۔ کسی شخص کا ذہنی تسلسل ہے۔ کل ایک شخص تھا جس کے احساسات کو میں یاد کر سکتا ہوں۔ پھر میں کہتا ہوں کہ ''میں ہی وہ کل کا شخص تھا۔'' لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ کل کا میں تو صرف چند ذہنی وقوعوں سے عبارت تھا۔ ان وقوعوں کو اب یاد کیا جاتا ہے اور ان کو اس شخص کا جزو قرار دیا جاتا ہے جو اب ان کو یاد کر رہا ہے۔ جو شئے فرد کی تشکیل کرتی ہے، وہ تجربات کا تواتر ہے۔ حافظہ اور عادت ان تجربات کو منضبط کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ اگر ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ فرد موت کے بعد بھی قائم رہتا ہے تو پھر ہم کو یہ یقین بھی کرنا ہوگا کہ فرد کی تشکیل کرنے والی یادیں اور عادتیں وقوعوں کے ایک نئے سیٹ کی صورت میں قائم رہتی ہیں۔

کوئی بھی اس نظریئے کو غلط ثابت نہیں کرسکتا۔ تاہم یہ واضح کرنا آسان ہے کہ اس قسم کی صورت حال کی موجودگی بہت مشکل ہے۔ ہماری یادیں دماغ کے ڈھانچے سے اس طرح منسلک ہوتی ہیں جس طرح کوئی دریا اپنی گزرگاہ سے منسلک ہوتا ہے۔ دریا کا پانی تو ہر دم بدلتا رہتا ہے لیکن دریا کی گزرگاہ وہی رہتی ہے۔ وجہ یہ کہ صدیوں کے بہاؤ نے اس کے لیے راستہ بنا دیا ہوتا ہے۔ اسی طرح سابقہ واقعات نے دماغ میں ایک راستہ بنا دیا ہوتا ہے اور اسی راستے پر ہمارے خیالات کا بہاؤ جاری رہتا ہے۔ یادداشت اور ذہنی عادات کا سبب یہی ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ موت کے ساتھ ہی دماغ کی ترتیب و تشکیل ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی سرگرمی باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا یہ توقع بھی کی جاسکتی ہے کہ حافظ بھی اس کے ساتھ ہی تباہ ہو جاتا ہے۔ دریا کی گزرگاہ کی مثال پر دوبارہ توجہ دیجئے۔ فرض کیجئے کہ کسی زلزلہ کے باعث دریائی گزرگاہ میں ایک پہاڑ نمودار ہو جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کیساتھ ہی پرانی گزرگاہ بھی ختم ہو جائے گی۔ ذہن کا ایک خاص وصف ہے جو کہیں اور شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ وہ وصف یہ ہے کہ ایک جیسے وقوعوں کے بار بار رونما ہونے سے عادتیں مرتب ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیئے کہ جب ہمارے چہرے پر تیز روشنی پڑتی ہے تو آنکھوں کی پتلیاں سکڑ جاتی ہیں۔ اگر آپ کسی شخص کی آنکھ پر بار بار تیز روشنی ڈالیں اور ہر بار، روشنی کے ساتھ ڈھول پر ایک تھاپ بھی دیں تو آخر کار، روشنی کے بغیر صرف ڈھول کی تھاپ سے ہی اس کی پتلیاں سکڑنے لگیں گیں۔ یہ دماغ اور اعصابی نظام ...... یعنی خاص قسم کے مادی ڈھانچے کی ایک حقیقت ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ بالکل اس قسم کے حقائق زبان سے متعلق ہمارے ردعمل اور اس کے ہمارے استعمال، ہماری یادداشتوں اور ان سے پیدا ہونے والے جذبوں، ہمارے کردار کی تشکیل کرنے والی اچھی اور بری عادتوں ...... قصہ مختصر یہ کہ ماسوائے وراثت سے وجود میں آنے والے جزو کے ...... ہماری ذہنی شخصیت کی تشکیل کرنے والے جملہ عناصر کی توجیہہ کرتے ہیں۔ وراثت میں ملنے والا حصہ اگلی نسلوں کو منتقل ہو جاتا ہے۔ مگر فرد میں وہ اس کی زندگی تک ہی قائم رہتا ہے۔ وہ جسم کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد قائم نہیں رہتا۔ لہٰذا ہم یہ کہیں

گے کہ کسی شخصیت کے وراثتی اور اس کے اپنے حاصل کردہ اجزا دونوں ہی مخصوص جسمانی ڈھانچوں کی خصوصیات سے جڑے ہوتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ دماغ پر کوئی چوٹ لگنے سے بسا اوقات حافظہ ختم ہو جاتا ہے۔

کبھی کسی ذہنی روگ کے سبب کوئی پارسا شخص گناہوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آیوڈین کی کمی کے باعث کئی ذہین بچے فاتر العقل بن جاتے ہیں۔ ان جانے پہچانے حقائق کے پیش نظر یہ بات مشکل ہی سے قابل یقین لگتی ہے کہ موت کی وجہ سے دماغ کے ڈھانچے میں پیدا ہونے والی تباہی کے بعد بھی ذہن اپنا وجود قائم رکھ سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ حیات بعد الموت میں ایمان عقلی دلائل سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ جذبے اس کا سبب بنتے ہیں۔

ان جذبوں میں سے اہم ترین موت کا خوف ہے۔ یہ خوف جبلی ہے اور حیاتیاتی طور پر مفید ہے۔ دوسری زندگی میں اگر ہم کو واقعی دل و جان سے اعتقاد ہو تو پھر ہم کو موت کے خوف سے بالکل ہی نجات مل جائے۔ اس کے نتائج حیرت انگیز ہوں گے اور شاید ان میں سے اکثر ہم کو اچھے بھی نہ لگیں گے، مگر یہ دیکھیے کہ ہمارے انسانی اور نیم انسانی آباؤ اجداد کئی ارضیاتی ادوار کے دوران اپنے دشمنوں سے لڑتے رہے ہیں اور ان کو تباہ برباد کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے جرات مندی سے فائدہ اٹھایا تھا، لہٰذا زندگی کی جدوجہد میں کامیاب ہونے والوں کے فائدے کی بات یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی موت کے فطری خوف پر غالب آتے رہیں۔ درندوں اور وحشیوں میں جبلی جارحیت موجود ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی جدوجہد میں ان کے کام آتی ہے۔ تاہم، جیسا کہ بعض مذاہب کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے، ترقی کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر جنت میں ایمان اس جارحیت کو دوبارہ پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے، لہٰذا ہم کو مان لینا چاہیے کہ ابدی زندگی میں ایمان کی حوصلہ افزائی کر کے جنگ پرست لوگ دانائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تاہم ساتھ ہی وہ یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ یہ ایمان اس قدر طاقت ور ہو جائے کہ لوگ دنیا کے سارے معاملات سے ہی بے نیاز ہو جائیں۔

انسان کے شرف و فضیلت کی تعریف کرنے کا جذبہ بھی بقا کے عقیدے میں ایمان کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ برمنگھم کے بشپ کا کہنا ہے کہ ''انسان کا ذہن ایک بے مثال آلہ ہے۔ اس سے

پہلے انسانی ذہن جیسی کوئی شے وجود میں نہ آئی تھی...... یہ ذہن نیکی اور بدی سے آگاہ ہے۔ وہ عظیم الشان عمارتیں تعمیر کر سکتا ہے، طیارے بنا سکتا ہے۔ وہ سورج کا فاصلہ ماپ سکتا ہے...... اچھا تو انسان جیسی اعلیٰ ہستی موت کے ساتھ ہی مکمل طور پر فنا ہو جاتی ہے؟

بشپ صاحب اس استدلال کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ کہ اس کائنات کی تخلیق ایک ذی شعور مقصد کے مطابق ہوئی ہے اور اس کائنات کا سارا نظام اسی کے تحت چل رہا ہے۔ اس صورتحال میں اگر انسان کو پیدا کرنے کے بعد موت کے ہاتھوں ختم ہونے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تو یہ بہت ہی احمقانہ بات ہوتی۔

اس دلیل کے کئی جواب دیئے جا سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ فطرت کی سائنسی تحقیق میں اخلاقی یا جمالیاتی اقدار کی دخل اندازی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس سے سائنسی دریافت میں رکاوٹ پڑتی ہے، چنانچہ کسی زمانے میں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ چونکہ دائرہ سب سے مکمل شکل ہے، لہٰذا اجرام فلکی لازماً دائرے کی شکل میں حرکت کرتے ہوں گے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ تمام انواع لازمی طور پر غیر مبدل ہوتی ہیں۔ دلیل اس کی یہ تھی کہ خدا کی ہر تخلیق کامل ہوتی ہے۔ اس میں تبدیلی وترقی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ وباؤں کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ نہ ہی ان سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بجائے صرف توبہ اور ندامت سے کام لینا چاہیے، کیونکہ وبائیں ہمارے گناہوں کی سزا کے طور پر نازل ہوتی ہیں۔ اس قسم کے بہت سے عقیدے مذہبی زمانوں میں موجود تھے اور اب بھی ان کے ماننے والوں کی کمی نہیں ہے۔ تاہم جہاں تک ہم جان سکے ہیں، یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ فطرت ہماری اقدار سے بے نیاز ہے اور یہ کہ ہم خیر وشر کے اپنے تصورات کو پس پشت ڈال کر ہی فطرت کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی مقصد ہو۔ تاہم جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس سے کہیں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ اگر کائنات کا کوئی مقصد موجود ہے تو وہ ہمارے اپنے مقاصد سے کوئی مشابہت رکھتا ہے۔

اچھا، اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر برنس صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان نیکی اور بدی کا علم رکھتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ لیکن علم انسانیت کی تحقیقات سے جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ نیکی اور بدی کے بارے میں انسانوں کے خیالات مختلف ادوار میں اس قدر مختلف رہے ہیں کہ ان میں کوئی قدر مشترک نہیں رہی۔ یہ خیالات ہمیشہ بدلتے رہتے

ہیں۔ ان میں کوئی مستقل عنصر نہیں، لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان نیکی اور بدی سے آگاہ ہے۔ زیادہ زیادہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بعض انسان اس قسم کی آگاہی رکھتے ہیں مگر کون سے انسان؟ نطشے نے ایک ایسی اخلاقیات کی حمایت کی تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقیات سے بالکل مختلف تھی۔ بعض طاقتور حکومتوں نے نطشے کی تعلیمات کو قبول کر لیا ہے۔ خیر و شر کے علم نے اگر ابدی زندگی کی دلیل بننا ہے تو پھر پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ آیا ہم نے نطشے کی اخلاقیات کو تسلیم کر لیا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقیات کو۔ پھر یہ دیکھیں کہ آیا مسیح تو لافانی ہیں جبکہ ہٹلر اور مسولینی نہیں ہیں۔ یا یہ کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ مطالعے کے کمرے میں حل نہ ہوگا۔ اس کو حل کرنے کے لئے میدان جنگ میں اترنا پڑے گا۔ وہاں یہ ہوگا کہ جن کے ہتھیار زیادہ خوفناک اور تباہ کن ہیں وہ جیت جائیں گے اور دوسرے مارے جائیں گے۔ زیادہ تباہ کن ہتھیار رکھنے والوں کی اخلاقیات کو برتری حاصل ہوگی اور وہ مستقبل کا اخلاقی ضابطہ قرار پائے گی۔

خیر و شر کا موضوع پر ہمارے احساسات اور اعتقادات ہماری دوسری چیزوں کی طرح فطری حقائق ہیں۔ وہ کسی خدائی یا ماورائی وسیلے سے حاصل نہیں ہوئے ہیں بلکہ زندگی کی جدوجہد کے دوران صورت پذیر ہوئے ہیں۔ ایسپ کے قصوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایک شیر کو شکاریوں کی تصویریں دکھائی گئیں جو شیر کو پکڑ رہے تھے۔ شیر نے تصویریں دیکھیں تو کہنے لگا کہ اگر یہ تصویریں اس نے بنائی ہوتیں تو وہ یوں دکھاتا کہ شیر شکاریوں کو پکڑ رہے ہیں۔ ڈاکٹر برنس یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان نفیس مخلوق ہے کیونکہ وہ ہوائی جہاز بنا سکتا ہے۔ شاید ایسا ہی ہو، مگر مجھے کچھ عرصہ پہلے کا ایک مقبول گیت یاد آ رہا ہے۔ یہ گیت مکھیوں کی خوش تدبیری کے بارے میں ہے۔ وہ چھت کی طرف اڑتے ہوئے کورس میں گاتی ہیں کہ "کیا ضیاء الحق اس طرح اڑ سکتا تھا؟ کیا بے نظیر بھٹو یہ کرتب دکھا سکتی ہیں؟ کیا نواز شریف میں ایسی ہمت ہے؟ نہیں! نہیں!!" اس بنیاد پر کوئی مذہبی ذہن رکھنے والی مکھی بڑا انگڑا استدلال تیار کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسری مکھیوں کے نزدیک یہ بہت ہی متاثر کن استدلال ہوگا۔

یہ امر قبل ذکر ہے کہ انسان کے بارے میں اس قسم کی اعلیٰ رائے ہم صرف اس وقت تک بنا سکتے ہیں، جب ہم تجریدی انداز میں سوچتے ہیں۔ زندہ و جاوید انسانوں کے بارے میں اکثر کی رائے یہ ہوتی ہے کہ ان کی بھاری اکثریت بری ہے۔ مہذب قوموں کو دیکھئے، وہ اپنی آمدنی کا

نصف سے زیادہ حصہ ایک دوسرے کے شہریوں کو قتل کرنے کے لیے خرچ کرتی ہے۔ مذہبی اور اخلاقی جوش وخروش سے جنم لینے والی سرگرمیوں کی طویل تاریخ پر نگاہ ڈالیے۔ بڑی تعداد میں انسانوں کی قربانیاں دی جا رہی ہیں۔ کافروں کو جہنم رسید کیا جا رہا ہے۔ بدعتیوں کو ایذائیں پہنچائی جاتی رہی ہیں۔ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو بھی بخشا نہیں جا رہا ہے۔ کیا یہ قابل نفرت کارروائیاں اور ان پر اکسانے والے اخلاقی نظریئے واقعی کسی ذی شعور خالق کا پتہ دیتے ہیں؟ اور کیا ہم واقعی آرزو کر سکتے ہیں کہ اس قسم کی کارروائیاں کرنے والے لوگ حیات ابدی سے بہرہ ور ہوں؟

جی میں آیا ہے کہ میں نفیس لوگوں کی تعریف میں ایک مضمون لکھوں۔ قارئین شاید پہلے یہ جاننا چاہیں گے کہ نفیس لوگوں سے میری مراد کیا ہے؟ ان کی لازمی صفت تک پہنچنا تو قدرے دشوار ہوگا لہٰذا کیوں نہ میں وہ خاص اقسام گنوا دوں جو نفیس لوگوں کی ذیل میں آتی ہیں۔ کنواری خالائیں ہمیشہ نفیس ہوتی ہیں اور وہ امیر بھی ہوں تو سونے پر سہاگہ سمجھئے۔ پادری صاحبان بھی نفیس ہوتے ہیں البتہ ان کا معاملہ اور ہے جو خودکشی کا بہانہ کر کے اپنی بھجن منڈلی کی کسی دوشیزہ کو ساتھ لے کر جنوبی افریقہ بھاگ جاتے ہیں۔ جہاں تک نوجوان دوشیزاؤں کا معاملہ ہے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کل کے زمانے میں وہ شاذ و نادر ہی نفیس ہوا کرتی ہیں۔ میری جوانی کے دنوں میں وہ عام طور پر نفیس ہی ہوا کرتی تھیں۔۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ صرف مختلف مسائل بلکہ، حد یہ ہے کہ، افراد اور نوجوان مردوں کے بارے میں بھی اپنی ماؤں کی رائے سے متفق ہوا کرتی تھیں۔ وہ مناسب لمحوں پر "ہاں ممی" اور "نہ ممی" کہا کرتی تھیں۔ وہ اپنے باپوں سے اس لیے محبت کرتی تھیں کہ یہ ان کا فرض تھا اور ماؤں کو اس لیے چاہتی تھیں کہ مائیں ان کو کسی خطا کاری کے سائے سے بھی محفوظ رکھا کرتی تھیں۔ جب ان کی منگنی ہو جاتی تو وہ سگھڑ میانہ روی میں مبتلا ہو جاتیں۔ شادی کے بعد وہ شوہروں سے محبت کرنے کو فرض سمجھتی تھیں، مگر عورتوں کو یہ ضرور جتلا دیا کرتی تھیں کہ وہ یہ فرض بڑی مشکل سے ادا کر رہی ہیں۔ ساس سسر سے وہ اچھا سلوک کرتی تھیں، مگر ان پر واضح کرتی رہتی تھیں کہ یہ وہی ہے جو ان سے اچھا سلوک کر رہی ہے، کوئی اور ہوتی تو لوہے کے چنے چبوا دیتی۔ دوسری عورتوں کی وہ بدگوئی نہ کیا کرتی تھیں، البتہ منہ کھول کر یوں بند کر لیتی تھیں کہ دوسروں کو پتہ چل جائے کہ وہ صرف فرشتہ صفت ہونے کے باعث زبان روکے ہوئے

ہیں۔اس قسم کی عورتوں کو نیک اور پارسا کہا جاتا ہے۔افسوس کہ ایسی عورتیں اب صرف بزرگوں میں ملتی ہیں۔

کرم کی بات ہے کہ اس قسم کی جو عورتیں بچ گئی ہیں،ان کے پاس بڑے اختیارات ہیں۔ مثال کے طور پر وہ تعلیم کو قابو کیے ہوئے ہیں۔تعلیم کے شعبے میں انہوں نے منافقت کا وکٹوریائی معیار کامیابی سے برقرار رکھا ہوا ہے۔اخلاقی مسائل میں قانون سازی ان کے قابو میں ہے۔یوں انہوں نے غیر قانونی شراب فروشی کے عظیم پیشے کو تخلیق کیا ہے اور پروان چڑھایا ہے۔وہ اس امر کو یقینی بناتی ہیں کہ اخباروں کے لیے لکھنے والے نوجوان اپنی آراء بیان کرنے کے بجائے نفیس بزرگ خواتین کے خیالات کی ترجمانی کیا کریں۔اس طرح وہ نوجوانوں کے اسلوب کا دائرہ وسیع کرتی ہیں اور ان کے نفسیاتی تخیل میں تنوع پیدا کر دیتی ہیں۔بے شمار تفریحات ان کی وجہ سے قائم چلی آ رہی ہیں،ورنہ کب کی ختم ہو چکی ہوتیں۔مثال کے طور پر سٹیج پر بری زبان سننے یا سٹیج پر رواج سے زیادہ ننگا جسم دیکھنے کی مسرتیں انہی کے دم قدم سے ہیں۔اگر یہ بزرگ نفیس خواتین ان باتوں کے خلاف احتجاج کرنا چھوڑ دیں تو یہ باتیں خود بخود ہی ختم ہو جائیں۔سب سے بڑھ کر یہ دیکھئے کہ نفیس لوگوں کے سبب شکار کھیلنے کی مسرت برقرار ہے۔برطانوی اضلاع کی متجالس آبادیوں میں لوگ لومڑیوں کا شکار کھیلنے پر مجبور ہیں۔یہ کھیل مہنگا ہے اور کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں لومڑ صاف طور پر یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ شکار ہونا اس کو کس قدر ناگوار گزرتا ہے۔ ان معاملات کے حوالے سے انسانوں کا شکار کھیلنا بہتر کھیل ہے۔اگر یہ نفیس لوگ نہ ہوتے تو پھر مطمئن ضمیر کے ساتھ انسانوں کا شکار کھیلنا زیادہ مشکل ہو جاتا۔نفیس لوگ جس کسی کی مذمت کرتے ہیں،وہ اچھا شکار بن جاتا ہے۔جونہی وہ منہ سے لش لش کی آوازہ نکالتے ہیں،شکاری جمع ہو جاتے ہیں۔پھر وہ مل کر شکار کو بندی خانے یا موت کے منہ کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔شکار کوئی عورت ہو تو جانئے کہ کھیل کا مزہ دو بالا ہو جاتا ہے۔اس سے عورتوں کی جلن اور مردوں کی اذیت پسندی کے جذبوں کو تسکین ملتی ہے۔

یہاں مجھے ایک غیر ملکی عورت یاد آ رہی ہے۔وہ انگلستان میں ایک مرد کے ساتھ غیر قانونی طور پر رہتی ہے۔اس مرد سے اس کو محبت ہے اور مرد بھی اس سے محبت کرتا ہے۔اس لیے دونوں ہنسی خوشی دن گزار رہے ہیں۔بدقسمتی سے اس عورت کے سیاسی خیالات دوسروں کی خواہش سے کم

قدامت پسند ہیں۔تاہم یہ محض خیالات ہی ہیں، عملی سیاست سے اس عورت کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔تاہم محض اس بہانے سے نفیس لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔انہوں نے خفیہ پولیس کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا اب اس بیچاری کو جلد ہی اس کے وطن بھیجا جا رہا ہے جہاں وہ بھوک سے مر جائے گی۔امریکہ کی طرح انگلستان میں بھی غیر ملکیوں کو اخلاقی گراوٹ کا سبب بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تو ہم سب پر پولیس کا احسان ہے کہ وہ یہ دیکھنے میں سرکھپاتی رہتی ہے کہ صرف غیر معمولی طور پر صالح غیر ملکی ہی ہمارے درمیان رہ سکیں۔

یہ نہ سمجھئے گا کہ نفیس لوگوں میں صرف عورتیں ہی شامل ہیں، ایسا نہیں ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ مرد کے مقابلے میں کسی عورت کا نفیس ہونا زیادہ عام سی بات ہے۔خیر، پادری صاحبان کے علاوہ اور بھی کئی نفیس مرد ہیں۔ان مردوں کو بھی اس صف میں شامل سمجھنا چاہیے جنہوں نے ڈھیروں کے حساب سے دولت کمائی اور اب کاروبار سے الگ ہو کر خیراتی سرگرمیوں میں شریک ہوتے ہیں۔مجسٹریٹ صاحبان کا عالم تو یہ ہے کہ وہ کم و بیش سب کے سب نفیس ہوا کرتے ہیں ۔تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قانون اور امن عامہ کے سبھی حمایتی نفیس ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جوانی کے دنوں میں، میں نے ایک خاتون کو موت کی سزا کے خلاف یہ دلیل دیتے ہوئے سنا تھا کہ سرکاری جلاد شاذ و نادر ہی نفیس ہوا کرتے ہیں۔ذاتی طور پر میں کسی جلاد کے ساتھ میل جول کے مواقع سے محروم رہا ہوں، لہٰذا اس دلیل کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔البتہ ایک خاتون کو میں جانتا ہوں جس کو ٹرین میں سفر کرتے ہوئے انجانے میں ایک جلاد سے پالا پڑا تھا ۔خاتون نے اس شخص کو موٹا کمبل پیش کیا تو وہ کہنے لگا ''آہ مادام! اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ میں کون ہوں تو آپ یہ مہربانی نہ کرتیں۔'' دیکھئے ناں، اس جواب سے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ بہر حال ایک نفیس آدمی تھا۔یہ ضرور استثنائی معاملہ ہوگا۔ڈکنز کے ناول ''بارنبی رج'' میں جو جلاد سامنے آتا ہے، وہ ہرگز نفیس کہلانے کا مستحق نہیں۔شاید وہ زیادہ نمائندہ قسم کا جلاد ہے۔

میرا نہیں خیال کہ ہمیں پھانسی کی سزا کی مخالفت کرتے ہوئے جلاد کے نفیس نہ ہونے کے بارے میں مذکورہ خاتون کی دلیل مان لینی چاہیے۔نفیس فرد بننے کے لیے حقیقت کے ساتھ بھونڈے اور کڑے تعلق سے محفوظ ہونا ضروری ہے۔جو لوگ اس قسم کی حفاظت مہیا کرنے کا کام کرتے ہیں ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ جس نفاست کو بچاتے ہیں، اس میں سے حصہ بھی

پائیں گے۔وہ خود نفاست سے محروم ہی رہتے ہیں۔مثال کے طور پر اس بحری جہاز کی تباہی کا تصور کیجیے جو بہت سے کالے مزدوروں کو لیے جارہا تھا۔اس کے اول درجے کی خواتین کو پہلے بچانا ہوگا۔ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ سب کی سب نفیس عورتیں ہوں گی۔تاہم ان کو بچانا اس وقت ممکن ہوگا کہ جب کالے مزدوروں کو چھلانگیں مار کر حفاظتی کشتیوں پر سوار ہونے سے روکنے والے مرد موجود ہوں۔یہ مرد نفیس طریقوں سے کام لے کر اپنا فرض ادا نہ کرسکیں گے۔اس کے بجائے ان کو طاقت سے کام لینا پڑے گا۔وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرنے والے کالے مزدوروں کو دھکے دے کر سمندر میں پھینکیں گے۔تب ہی وہ خواتین کو بچا پائیں گے۔بچ جانے والی خواتین کو اپنی حفاظت کا احساس ہوتے ہی ڈوب مرنے والے مزدوروں کا افسوس ہونے لگے گا لیکن ان کے یہ نرم و نازک احساسات ان کو بچانے والے متشدد مردوں کے مرہون منت ہوں گے۔

نفیس لوگ دنیا کی انتظام کاری کا فرض عام طور پر بھاڑے کے ٹٹوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔دل ہی دل میں ان کو احساس ہوتا ہے کہ یہ ایسا کام نہیں جو کوئی نفیس شخص سرانجام دے سکے۔البتہ ایک شعبہ وہ دوسروں کے حوالے نہیں کرتے۔اس کو اپنے لیے مخصوص رکھتے ہیں۔یہ چغل خوری اور سکینڈل بازی کا شعبہ ہے۔سچی بات تو یہ ہے کہ ہم لوگوں کو ان کی زبان کی طاقت کے حساب سے مختلف درجوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔اگر الف،ب کے خلاف بولتا ہے تو ب،الف کے خلاف اپنی قوت گویائی استعمال کررہا ہے۔تو ان کی سوسائٹی کے لوگ عام طور پر اس امر پر متفق ہوں گے کہ ان دونوں میں سے ایک تو اپنا عوامی فرض ادا کررہا ہے،جب کہ دوسرا غیبت میں مصروف ہے۔ان دونوں میں سے جو زیادہ نفیس ہے،اس کے ساتھ رعایت برتی جائے گی اور اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ عوامی فرض ادا کررہا ہے،چنانچہ،مثال کے طور پر،کسی سکول میں ہیڈ مسٹریس کو عام ٹیچر کے مقابلے میں زیادہ نفیس سمجھا جائے گا اور سکول بورڈ کے کسی رکن کو ان دونوں میں سے زیادہ نفیس ہونے کا درجہ دیا جائے گا۔کسی کو یاوہ گوئی کا نشان بنایا جائے تو اس غریب کا روزگار خطرے میں پڑ جاتا ہے۔بات اس انتہا تک نہ پہنچے تو بھی نشانہ بننے والا فرد اچھوت ضرور بن جاتا ہے۔گویا یاوہ گوئی لوگوں کو نیک اور پارسا رکھنے کی زبردست قوت ہے اور ہم کو اس کے لیے نفیس لوگوں کا ممنون ہونا چاہیے جو اس کو استعمال کرتے ہیں۔

نفیس لوگوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی حقیقت پر اضافہ کرنے کی قابل تعریف عادت

ہے۔دنیا خدا نے بنائی تھی، مگر نفیس لوگوں کا خیال ہے کہ وہ یہ کام بہتر انداز میں کر سکتے تھے۔اس خدائی تخلیق کے بہت سے معاملات ایسے ہیں کہ ان کے مختلف ہونے کی خواہش کو کفر کے مترادف سمجھا جائے گا۔تاہم ان کا ذکر کرنا بھی کچھ ایسی نفیس بات نہیں ہے۔نیک لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے پہلے والدین، یعنی حضرت آدم اور حضرت حوا سیب نہ کھاتے تو پھر انسانی نسل، دوسری نباتات کی طرح، معصومانہ انداز میں پھلتی پھولتی اور جنس کی گندگی سے پاک رہتی۔اس معاملے میں خدائی منصوبہ واقعی پراسرار ہے۔جنس کو گناہ کی سزا کے طور پر قبول کرنا خوب ہے۔تاہم اس نظریئے کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ نفیس لوگ تو جنس کو گناہ کی سزا مانتے ہیں، مگر ایسے لوگ بھی ہیں جو جنس کو پرلطف تسلیم کرتے ہیں۔اس معاملے میں لگتا یہ ہے کہ نفیس لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوگئی ہے۔اس لیے ان کا ایک بڑا مقصد، اس غیر ارادی بے انصافی کو ختم کرنا ہے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ جنس کو بے مزہ اور بے لطف بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ان کی کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ نفیس طریقے سے جنس کے بارے میں معلومات کم سے کم حاصل ہوسکیں۔وہ اس امر کو بھی یقینی بنانے کے درپے رہتے ہیں کہ جنس کا کھیل چوری چوری کھیلا جائے یا پھر روکھے پھیکے اور بے مزہ انداز میں، اور یہ کہ اس کھیل کو چوری چوری کھیلنے والوں کا جب بھانڈہ پھوٹ جائے تو وہ نفیس لوگوں کے رحم وکرم پر ہوں۔

خدا ہی جانتا ہے کہ اس نے انسانی جسم کو ایسا کیوں بنایا ہے۔وہ قادر مطلق ہے۔آخر وہ ایسا جسم بھی تو بنا سکتا تھا جو نفیس لوگوں کے لیے شرم کا باعث نہ بنتا اور ان کے لیے قابل قبول ہوتا۔شاید اس کا مناسب جواز موجود ہے۔لنکاسٹر میں کپڑے کی صنعت کی ترقی کے بعد سے برطانیہ میں مشینریوں اور کپڑے کے تاجروں کے درمیان قریبی اتحاد موجود رہا ہے۔مشنری غیر مہذب لوگوں کو اپنا تن ڈھانپنے کا درس دیتے ہیں۔اس طرح وہ کپڑے کی مانگ بڑھا دیتے ہیں۔انسانی جسم اگر شرمناک نہ ہوتا تو کپڑے کے تاجر منافع کے اس بڑے وسیلے سے محروم رہ جاتے۔یہ مثال اس امر کو بھی واضح کردیتی ہے کہ ہمیں نیکی اور پارسائی کی اشاعت سے اس لیے خوف زدہ نہ ہونا چاہیے کہ ہمارے منافعے کم ہو جائیں گے۔

جس کسی نے بھی ''ننگی سچائی'' کی ترکیب وضع کی تھی، اس نے ایک اہم ربط کا ادراک کرلیا تھا۔تمام پارسا لوگ عریانی سے ڈرتے ہیں۔یہی معاملہ سچائی کا بھی ہے۔وہ سچائی سے بھی خائف

رہتے ہیں۔ آپ کا تعلق چاہے کسی شعبے سے ہو، آپ جلد ہی دیکھیں گے کہ سچائی ایسی شے نہیں کہ کہ نفیس لوگ اس کو اپنے شعور میں داخل ہونے کی اجازت دے سکیں۔ بدقسمتی سے جب کبھی مجھے عدالت میں کوئی ایسا مقدمہ سننے کا اتفاق ہوا ہے جس کے بارے میں مجھے تھوڑا بہت براہ راست علم حاصل تھا، تو میں نے دیکھا ہے کہ عدالت کے معزز ایوان میں کسی سیدھی سادی سچائی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ عدالت کے کمرے میں جو سچائی رسائی پاتی ہے وہ ننگی سچائی نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف اس سچائی کو داخلے کی اجازت ملتی ہے جو عدالتی لباس میں ملبوس ہو۔ یہ لباس سچائی کے تمام غیر نفیس حصوں کو چھپا لیتا ہے۔ خیر، میں یہ نہیں کہتا کہ قتل اور چوری ڈاکہ جیسے سیدھے سادے مقدموں میں بھی صورت حال اس قسم کی ہوتی ہے۔ تاہم سیاسی مقدموں اور فحاشی کے مقدموں سمیت ان تمام مقدمات میں یہی معاملہ پیش آتا ہے جن میں تعصب کا عنصر پایا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں برطانیہ نے نفاست کے احساسات کے ذریعے ہر ناگوار شے کے کم و بیش غیر مرئی اور نیم شعوری کنٹرول کو کمال تک پہنچا دیا ہے۔ اگر آپ عدالت میں کوئی ناپسندیدہ واقعہ بیان کرنا چاہیں تو دیکھیں گے کہ شہادت کے قوانین اس کی اجازت نہ دیں گے، چنانچہ صرف جج اور مخالف فریق کا وکیل بلکہ آپ کا اپنا وکیل بھی اس واقعہ کو سامنے لانے سے روک دے گا۔

نفیس لوگوں کے احساسات کے باعث اس قسم کی غیر حقیقت پسندی سیاست کے شعبے کو بھی اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ اگر آپ کسی شخص کو یہ جتلانے کی کوشش کریں کہ اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والا کوئی سیاست دان دوسرے عام انسانوں جیسا ہی ایک انسان ہے تو وہ اس بات کا برا مان جاتا ہے اور آپ کی بات کی تردید کرنے پر اتر آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تمام جماعتوں کے سیاست دان اپنے پیشے کو نقصان پہنچانے والی کسی بات کو عوام سے چھپانے کی خاطر بڑی ہوشیاری سے متحد ہو جاتے ہیں۔ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ جماعتی اختلافات ارباب سیاست کو اس قدر تقسیم نہیں کرتے جس قدر پیشے کا تشخص ان کو اکٹھا کرتا ہے، اسی طرح نفیس لوگ قوم کے عظیم سپوتوں کے بارے میں اپنے غیر حقیقی تصورات برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور سکول کے بچوں کو یہ یقین دلانا بھی ممکن ہو جاتا ہے کہ عظمت صرف اعلیٰ ترین نیکی کے ذریعے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی کبھار ایسا وقت بھی آتا ہے، جب سیاست واقعی تلخ ہو جاتی ہے

اور کبھی ایسے سیاست دان بھی منظر پر آ جاتے ہیں جن کو اس غیر رسمی ٹریڈ یونین میں شمولیت کے لیے کافی حد تک معزز نہیں مانا جاتا۔ پارنل کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس پر پہلے تو قاتلوں کے ساتھ تعاون کرنے کے الزام لگایا گیا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس پر ایسی بداخلاقی کے جرم میں سزا دی گئی جس جرم کا خواب بھی اس کے الزام لگانے والے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اس زمانے میں بھی یورپ میں کمیونسٹوں کو اور امریکہ میں انتہا پسند انقلابیوں اور مزدوروں کو منظم کرنے والوں کو اچھوت ہی سمجھا جاتا ہے۔ نفیس لوگوں کی کوئی قابل لحاظ تعداد ان کی تعریف نہیں کرتی۔ جب وہ روایتی ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو ان کو کسی رحم یا رعایت کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ اس طریقے سے نفیس لوگوں کے غیر مبدل اخلاقی اعتقادات کا تعلق جائیداد کی حفاظت سے بن جاتا ہے۔ یوں ان کی بے بہا قدر و قیمت ایک بار پھر ثابت ہو جاتی ہے۔

نفیس لوگوں کا جب بھی مسرت و لطف سے پالا پڑے، ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ اس پر شبہ کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر وہ شے جو دانائی میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ دکھ درد کو بھی بڑھا دیتی ہے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دکھ کو بڑھانے والی ہر شے دانائی میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ یوں وہ اپنے طور پر محسوس کرتے ہیں کہ دکھ درد کو پھیلا کر وہ دانائی بانٹ رہے ہیں۔ اچھا اب اس بات پر ہی سب کا اتفاق ہے کہ دانائی ہیرے موتیوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ لہٰذا نفیس لوگ جائز طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ مفاد عامہ کا کام کر رہے ہیں، چنانچہ نفیس لوگ اپنے آپ کو انسان دوست ہونے کا یقین دلانے کے لیے بچوں کے کھیلنے کی ایک گراؤنڈ بناتے ہیں۔ گراؤنڈ تیار ہو جاتی ہے تو وہ اس کے استعمال کرنے کے لیے اس قدر کڑی شرائط عائد کر دیتے ہیں کہ کوئی بچہ وہاں کھیل کر اتنی خوشی حاصل نہیں کر سکتا جتنی کہ اس کو گلیوں میں کھیل کر حاصل ہوتی ہے۔ یہ لوگ کھیل کے میدانوں اور تھیٹر وغیرہ کو اتوار کے روز بند رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اتوار کے دن اس قسم کی سہولتوں سے زیادہ سے زیادہ لطف حاصل ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو، وہ اپنی نوجوان خواتین ملازماؤں کو مرد ملازموں کے ساتھ بات چیت کرنے سے روکتے ہیں۔ جن نفیس ترین لوگوں کو میں جانتا ہوں، وہ اس رویئے کو اپنے خاندانوں کے اندر تک لے جاتے ہیں، چنانچہ وہ اپنے بچوں کو صرف تعلیمی کھیل کھیلنے کی اجازت دیتے ہیں۔ تاہم وائے افسوس کہ نفاست کا یہ درجہ پہلے کے مقابلے میں کم ہوتا جا رہا ہے۔ پرانے

دنوں میں بچوں کو یہ درس دیا جاتا تھا کہ

رب کی لاٹھی کی بس ایک ضرب گنہگار بچوں کہ جہنم رسید کر سکتی ہے۔

سمجھایہ جاتا ہے کہ اگر بچوں نے کوئی خطا کی اور مذہبی کارکنوں کی مقرر کردہ حد سے قدم باہر نکالا تو پھر یہی کچھ ہوگا۔ رب کی لاٹھی چپ نہ رہے گی، وہ حرکت میں آئے گی۔ اس نقطہ پر مبنی تعلیم کو ''دی فیئر چائلڈ فیملی'' نامی کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نفیس لوگ تیار کرنے کے لیے بیش بہا طریقے درج ہیں۔ آج کے زمانے میں صرف چند والدین ہی یہ اعلیٰ معیار پیش نظر رکھتے ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اب عام طور پر بچوں کو زندگی سے لطف اندوز ہونے کے مواقع مہیا کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے ڈھیلے اصولوں پر پلنے والے بچے بڑے ہو کر ہنسنے کھیلنے کے دشمن نہ رہیں گے۔

مجھے لگتا ہے کہ نفیس لوگوں کا زمانہ اب ختم ہونے والا ہے۔ دو عوامل اس کے زوال کا سبب بن رہے ہیں۔ پہلا عامل تو یہ عقیدہ ہے کہ جب تک کسی اور کو نقصان نہ پہنچے، تب تک ہنسنے کھیلنے اور زندگی سے پورا لطف اٹھانے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ دوسرا عامل مکاری اور دغا بازی سے بڑھتی ہوئی نفرت ہے۔ یہ نفرت جس قدر اخلاقی ہے، اسی قدر جمالیاتی بھی ہے۔ پہلی جنگ عظیم نے ان دونوں عوامل کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ جب یہ جنگ شروع ہوئی تھی تو تمام ملکوں میں اقتدار نفیس لوگوں کے قبضے میں تھا۔ انہوں نے اعلیٰ ترین اخلاقیات کے نام پر ایک ایک کر کے نوجوانوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنا شروع کر دیا تھا۔ وحشت اور بربادی کا یہ کھیل ختم ہونے پر بچ جانے والوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ آیا نفرت سے پیدا ہونے والے جھوٹ اور مصائب اعلیٰ ترین نیکی کو جنم دیتے ہیں۔ یہ لوگ نفیس لوگوں کے جھانسے سے نکل آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دوبارہ دھوکہ کھانے میں ان کو کچھ وقت لگے گا۔

نفیس لوگوں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی سے نفرت کرتے ہیں۔ خاص طور پر ان کو ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے رجحانات، بچوں کے شوروغل اور --- سب سے بڑھ کر یوں کہیئے کہ جنس سے نفرت ہے۔ اصل میں جنس کا جن ہر وقت ان کے سروں پر سوار رہتا ہے۔ تو آیئے ایک جملے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نفیس لوگ وہ ہیں جن کے ذہن گندے ہوتے ہیں۔

❁

مذہب اور اخلاق

بہت سے لوگ ہمیں بتایا کرتے ہیں کہ خدا پر ایمان کے بغیر کوئی شخص خوش باش اور راست باز زندگی نہیں گزار سکتا۔ راست بازی کا مجھے کوئی ذاتی تجربہ نہیں۔ اس لیے میں صرف دیکھی بھالی بات ہی کر سکتا ہوں۔ البتہ جہاں تک خوشی و مسرت کا معاملہ ہے۔ تجربے اور مشاہدے دونوں کی بنیاد پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایمانداروں اور ملحدوں دونوں کی کیفیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ عام طور پر ایک دوسرے سے زیادہ خوش باش ہوتے ہیں اور نہ ہی رنجیدہ۔ رنج و ناخوشی کے ''عظیم'' اسباب عام طور پر تلاش کیے جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے دکھوں اور مصائب کے لیے خود کو ذمہ دار قرار دینے کے بجائے ان کو کسی ماورائی قوت سے منسوب کر سکے تو پھر ان دکھوں اور مصیبتوں پر فخر کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ آیئے اب اخلاقیات کی طرف۔ اس معاملے میں زیادہ انحصار اس امر پر ہے کہ آپ اس اصلاح سے کیا معنی لیتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اہم خوبیاں رحم دلی اور ذہانت ہیں۔ اچھا اب معاملہ یہ ہے کہ عقیدہ کوئی بھی ہو، وہ ذہانت کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس کی نشو و نما کی مزاحمت کرتا ہے۔ دوسری طرف گناہ اور سزا کے عقیدے میں ایمان رکھنے سے رحم دلی کو ضعیف پہنچتا ہے۔ یہ عقیدہ دلوں کو سخت کر دیتا ہے اور گنہگاروں کے ساتھ مہربانی، دردمندی اور لطف و عنایت کے ساتھ پیش آنے سے روکتا ہے۔

کئی عملی طریقوں سے روایتی اخلاقیات سماجی طور پر پسندیدہ امور کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ آبادی کا مسئلہ لیجئے۔ انسانی زندگی کو خوش گوار اور باوقار بنانے کے لیے بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کو قابو میں لانا ضروری ہے، لیکن مذہبی علماء ہر جگہ اس کی مخالفت کرتے ہیں اور آبادی کو کنٹرول کرنے کی کوششوں کو مذہب اور خدائی منصوبے میں مداخلت قرار دیتے ہیں۔ اس رویئے

نے انسانی مستقبل کو مخدوش بنا دیا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں مذہبی علماء اور ادارے بے اختیار ہو چکے ہیں، لہٰذا انہوں نے آبادی کا مسئلہ حل کر لیا ہے۔ پسماندہ ملکوں میں آبادی کو کنٹرول کرنا زیادہ ضروری ہے۔ مگر وہاں علمائے دین مزاحمت کے لیے ڈٹے ہوئے ہیں۔ ہر ذہین طالب علم کو آبادی میں بے تحاشا اضافے سے پیدا ہونے والے عذابوں کا علم ہے، مگر بے لچک اور تنگ نظر علمائے دین ان حقائق کو قبول کرنے سے منکر ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مذہبی عقیدے کے زوال سے صرف اچھائیاں ہی پیدا ہوں گی۔ میں یہ ماننے پر بالکل تیار ہوں کہ نازیوں اور اشتراکیوں جیسے عقائد کے نئے نظام روایتی نظاموں سے بھی بدتر ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولیے کہ اگر بچپن میں ہمارے ذہن عقیدوں کو قبول کرنے کے عادی نہ بنا دیئے گئے ہوتے تو پھر یہ نئے نظام کسی طور پھل پھول نہ سکتے تھے۔ سٹالن کے طور طریقے اور اس کی زبان اس مذہبی مدرسے کی یاد دلاتی ہے جس میں اس نے ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ دنیا کو عقیدے کے بجائے سائنسی تحقیق کے رویے کی ضرورت ہے۔ دنیا کو یہ بھی سیکھنے کی ضرورت ہے کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ایذا رسانی ناپسندیدہ ہے۔۔۔ چاہے اس کا ذمہ دار سٹالن ہو یا کوئی دیوتا۔



ہماری جنسی اخلاقیات

انسانی زندگی کے کسی اور عنصر کے مقابلے میں آج بھی بہت سے لوگوں، شاید یوں کہنا چاہیے کہ اکثر لوگوں، کا جنس کے معالے میں رویہ غیرہ معقول ہوتا ہے۔ ماضی میں انسانی قتل، وباؤں، جنوں، سونا چاندی اور ہیرے موتیوں کو---- یعنی درحقیقت شدید جذباتی قسم کی امیدوں اور خوفوں کا سبب بننے والی تمام چیزوں کو---- جادوٹونہ یا اساطیر کی دھند میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ مگر عقل کے سورج نے اس دھند کو عام طور پر ختم کر دیا ہے۔ صرف چند ہی گوشے اب تو اس کی لپیٹ میں رہ گئے ہیں۔ جنس کے پہلو پر البتہ ابھی تک سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ شاید یہ فطری تقاضا ہے، کیونکہ جنس کا تعلق اکثر لوگوں کی زندگی کے انتہائی ہیجان انگیز پہلو سے ہوتا ہے۔

خیر، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید دنیا کے تقاضے جنس سے متعلق عوامی رویئے کو تبدیل کرنے لگے ہیں۔ یقین سے فی الحال یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بالآخر کس قسم کی تبدیلی یا تبدیلیاں رونما ہوں گی لیکن تبدیلی کے لئے کام کرنے والی بعض قوتوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے اور یہ سوال بھی زیر بحث لایا جاسکتا ہے کہ معاشرے کے ڈھانچے پر ان کے اثرات کس قسم کے ہوں گے۔

انسانی فطرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم ایسے معاشرے کے قیام کا امکان رد نہیں کر سکتے جس میں شادی کے بغیر جنسی تعلقات خال خال ہی ہوں۔ لیکن ایسے معاشرے کے قیام کے لیے جن لوازمات کی ضرورت ہے، ان کو جدید زندگی نے کم و بیش ناقابل حصول بنا دیا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وہ کون سے ہیں؟

کسی علاقے میں آبادی کم ہو تو وہاں زندگی زیادہ متحرک نہیں ہوتی اور یہ بات یک زوجگی کو تقویت دیتی ہے۔ یعنی وہاں پر عورتوں اور مردوں کو شادی کی حدود سے باہر جنسی تعلقات قائم کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر مرد زیادہ تر گھر کے اندر رہتا ہے اور اس کو غیر

عورتوں سے میل ملاپ کے مواقع میسر نہیں ہیں تو پھر اس کے لیے بیوی کے ساتھ وفادار رہنا سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ بیوی کے بغیر سفر کرتا رہتا ہے اور کسی پر ہجوم شہر میں رہتا ہے تو پھر اس کو بے وفائی کے مواقع میسر آتے رہتے ہیں اور اس کا بیوی کے ساتھ وفادار رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یک زوجگی کو تقویت دینے والا ایک اور عنصر توہم پرستی ہے۔ جو لوگ دل سے یقین رکھتے ہیں کہ ناجائز جنسی تعلقات گناہ میں شامل ہیں اور یہ کہ یہ گناہ ابدی سزا کا سبب بنتا ہے، وہ بھی کسی نہ کسی حد تک ان نقصانات سے دور رہتے ہیں۔ البتہ یہ ماننے والی بات ہے کہ مذہبی لوگ ناجائز جنسی تعلقات کو گناہ قرار دینے کے باوجود ان سے اس قدر دور نہیں رہتے جتنی کہ ان سے توقع کی جاسکتی ہے۔ خیر، رائے عامہ بھی یک زوجگی کا ایک عمل ہے۔ دیہات اور ان جیسی دوسری بستیوں میں جہاں کوئی شخص اپنے کرتوتوں کو ہمسایوں سے چھپا نہیں سکتا، وہاں وہ ممنوعہ کاموں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہر حال پاک دامنی پر مائل کرنے والے یہ تمام اسباب آج کل اتنے موثر نہیں رہے جتنے کہ ماضی میں ہوا کرتے تھے۔ آج کے زمانے میں کم ہی لوگ دوسروں سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ شہروں اور قصبوں میں آبادی کا ہجوم ہے۔ دوزخ کی آگ میں ایمان کمزور ہو چکا ہے اور بڑے شہروں میں لوگ ہمسایوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ عورتیں اور مرد دونوں اس قدر پاک دامن اور پارسا نہیں رہے، جس قدر وہ جدید صنعتی نظام کے آغاز سے پہلے ہوا کرتے تھے۔

بلاشبہ یہ موقف اختیار کیا جاسکتا ہے کہ اگر لوگوں کی روز افزوں تعداد کسی اخلاقی قانون کو پامال کرنے لگی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے معیار ہی بدل ڈالیں۔ کبھی کبھی ہم کو یہ بھی جتلایا جاتا ہے کہ گناہ کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے اور احساس بھی کہ وہ گناہ کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر کسی اخلاقی ضابطے کی پابندی مشکل ہے تو اس سے خود اس ضابطے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس کی قدر و قیمت برقرار رہتی ہے، مگر میں ان باتوں کا یہ جواب دینا چاہتا ہوں کہ یہ سوال کہ آیا کوئی ضابطہ اچھا ہے یا برا، ویسا ہی سوال ہے جیسا کہ یہ کہ آیا وہ انسانی مسرتوں میں اضافے کا سبب بنتا ہے یا نہیں۔ میرا موقف یہ ہے کہ وہی اخلاقی قاعدہ یا اصول اچھا ہے جو انسانوں کی خوشیاں بڑھائے۔ بہت سے بالغ افراد دل ہی دل میں ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو ان کو بچپن

میں پڑھائی گئی تھیں۔ چنانچہ جب ان کا کردار بزرگوں سے سنے ہوئے معیاروں پر پورا نہیں اترتا تو وہ اپنے آپ کو فاسق و بدکار محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ نہ صرف داخلی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی باشعور معقول شخصیت اور لاشعوری طفلانہ شخصیت کے درمیان تقسیم پیدا ہو جاتی ہے بلکہ یہ نقصان بھی پہنچتا ہے کہ وہ روایتی اخلاقیات کے ناقص حصوں کے ساتھ اس کے ٹھوس حصے بھی غیر معتبر ہو جاتے ہیں، چنانچہ لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر زنا کاری قابل معافی ہے تو پھر کاہلی، بددیانتی اور بے رحمی بھی قابل معافی ہیں۔ وہ نظام اس خطرے سے محفوظ نہیں ہو سکتا جو نوجوانوں کو ایسے کئی عقیدوں کی تعلیم دیتا ہے جو ذرا سی سوجھ بوجھ کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ بالغ افراد جب ان عقیدوں میں سے بعض کو خام اور مضحکہ خیز پاتے ہیں تو وہ نہ صرف ان کو بلکہ عقائد کے اس پورے نظام کو ہی مسترد کر دیتے ہیں۔

کسی قابل عمل جنسی اخلاقیات کی تشکیل رقابت اور کثیر الازواجی جذبوں کے درمیان تضاد سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ رقابت کا جذبہ جزوی طور پر جبلی ہوتا ہے، مگر اس کا بڑا حصہ رواجی ہے۔ میں اس بات کی وضاحت یوں کروں گا کہ اگر کسی معاشرے میں بے وفا بیوی والے شوہر کا مذاق اڑایا جائے تو پھر وہ رشک و رقابت کی آگ میں ضرور جلنے لگے گا۔ چاہے اس کے دل میں بیوی کے لیے رتی بھر محبت نہ رہی ہو۔ اس رقابت کا ملکیت کے احساس سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جہاں یہ احساس موجود نہ ہو، وہاں رقابت کا جذبہ بھی شدید نہیں ہوتا۔ وفاداری کی رواجی طور پر توقع نہ کی جاتی ہو تو بھی رقابت بڑی حد تک ختم ہو جاتی ہے۔ بہر حال رقابت کو کم کرنے کا امکان اگرچہ بہت سے لوگوں کی توقعات سے کہیں زیادہ ہے لیکن جب تک باپوں کے حقوق اور فرائض موجود ہیں، تب تک ایک خاص حد سے زیادہ اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت حال کی موجودگی میں مرد کسی حد تک اس یقین دہانی کی لازمی طور پر خواہش کرتے رہیں گے کہ وہ اپنی بیویوں کے بچوں کے باپ ہیں۔ عورتوں کو جنسی آزادی دلانے کی خاطر باپوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ تب عورتوں کو اس توقع سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا۔ کہ شوہر ان کی کفالت کریں گے۔ ممکن ہے کہ آئندہ کبھی اس قسم کا ماحول پیدا ہو جائے، مگر یہ بہت گہری سماجی تبدیلی ہو گی اور اس کے اچھے یا بُرے اثرات بے شمار ہوں گے۔

درمیانے وقفے میں اگر ہم شادی اور ولدیت کو سماجی اداروں کی حیثیت سے برقرار رکھنا

چاہتے ہیں تو پھر ہمیں مکمل طور پر آزاد جنسی میل ملاپ اور زندگی بھر کی جنسی وفاداری کے درمیان کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کروانا پڑتے گا۔ یہ معاملہ محض ایک ہی وقت طے نہیں جا سکتا۔ بلکہ لوگوں کی عادات اور بچوں کی پیدائش کو روکنے کے موثر طریقوں کی بنیاد پر وقتاً فوقتاً نئے انداز اپنانے ہوں گے۔ چند باتیں اب بھی ہم خاصے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جسمانی اور تعلیمی دونوں اعتبار سے عورتوں کا بیس سال کی عمر سے پہلے ماں بننا پسندیدہ بات نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری اخلاقیات ایسی ہونی چاہیے کہ جو اس بات کی حوصلہ شکنی کرے۔

اس سلسلے کی دوسری بات یہ ہے کہ جنسی تجربے سے گزرے بغیر کوئی فرد، چاہے وہ عورت ہو یا مرد، محض جسمانی کشش اور اس قسم کی ہم آہنگی میں فرق نہیں کر سکتا جو کامیاب شادی کے لیے ضروری ہے۔ مزید براں معاشی اسباب عام طور پر مردوں کو شادی کو ٹالتے رہتے ہیں لیکن اس امر کا امکان کم ہے کہ وہ بیس سے تیس برس کی عمر کے دوران پاک دامن رہیں گے۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی اس قسم کی پاک دامنی پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ اب اگر انہوں نے عارضی جنسی تعلقات قائم کرنے ہی ہیں تو بہتر یہ ہے کہ وہ پیشہ ور عورتوں کے بجائے ان کے اپنے طبقے کی لڑکیوں کے ساتھ ہوں اور ان کی بنیاد پیسے کے بجائے چاہت پر ہو۔ ان دونوں اسباب کی بنا پر نوجوان کنواروں کو قابل ذکر حد تک آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ تاہم ان کو بچے پیدا کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔

اب ہم تیسرے معاملے کی طرف بڑھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے پر الزام لگائے بغیر میاں بیوی کو طلاق حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہیے اور طلاق کو رسوائی کی بات یا باعث شرم نہیں سمجھنا چاہیے۔ جن جوڑوں کے بچے نہ ہوں، ان کا شادی کا بندھن دونوں میں سے کسی ایک فریق کی خواہش پر فوراً ہی ختم ہو جانا چاہیے۔ باہمی رضامندی سے ہر شادی کو ختم ہو جانا چاہیے --- تاہم ایک سال کا نوٹس ضروری ہونا چاہیے۔ بعض دیگر اسباب کی بنیاد پر بھی طلاق ہو جانی چاہیے۔ ان اسباب میں، مثال کے طور پر، پاگل پن، فرار اور تشدد وغیرہ۔

قابل عمل جنسی اخلاقیات کی تشکیل کے لیے چوتھی اہم بات یہ ہے کہ جنسی تعلقات کو معاشی آلودگی سے بچانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا جانا چاہیے۔ ہمارے زمانے میں حالت یہ ہے کہ

طوائفوں کی طرح گھریلو بیویاں بھی اپنی جنسی دلربائیاں بیچ کر گزارہ کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ عارضی جنسی تعلقات میں بھی توقع یہ کی جاتی ہے کہ سارے مشترکہ اخراجات صرف مرد ہی برداشت کرے گا۔ اس کا نتیجہ دولت اور جنس کے گھٹیا ملاپ کی صورت میں سامنے آیا ہے اور عورت کے رویوں میں مطلب پرستی شامل ہوگئی ہے۔ مذہب کی تائید رکھنے والی جنس کو بھی کسی طور پر پیشہ نہ ہونا چاہیے۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ عورت کو گھربار کی دیکھ بھال، کھانے پکانے اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے کا معاوضہ دیا جائے لیکن معاوضہ محض اس لیے نہ ہونا چاہیے کہ اس نے مرد کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کسی عورت نے کبھی کسی مرد سے محبت کی تھی یا مرد نے اس کو چاہا تھا تو اس کو محبت کے خاتمے کے بعد مرد کی طرف سے نان نفقہ ملتا رہے اور وہ اس پر زندگی گزارتی رہے۔ مرد کی طرح عورت کو بھی گزارے کے لیے محنت کرنی چاہیے۔ ایک بیکار بیوی اسی قدر احترام کی مستحق ہوتی ہے جس قدر کسی عورت کی کمائی پر پلنے والا مرد ہوا کرتا ہے۔

(2)

جنسی طرزِعمل کے رائج الوقت ضابطہ کو پروان چڑھانے میں دو بہت ہی بنیادی جذبوں نے حصہ لیا ہے۔ تاہم ان کا حصہ ایک جیسا نہیں ہے۔ ایک نے کم اور دوسرے نے زیادہ حصہ لیا ہے۔ ان میں سے ایک شرم وحیا کا جذبہ ہے اور دوسرا جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، رقابت کا جذبہ ہے۔ کسی نہ کسی حد تک شرم وحیا کا جذبہ پوری نسل انسانی میں پایا جاتا ہے۔ وہ ایک ٹیبو ہے، اس کو توڑنا ضروری ہے۔ لیکن اس کو سلیقے سے اور کم از کم کسی مسلمہ ضابطہ آداب کے مطابق توڑنا چاہیے، لیکن لوگ شرم وحیا کے جذبے کو وکٹوریائی عہد کی تخلیق قرار دیتے ہیں اور بعض دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جذبہ تہذیب وتمدن نے پیدا کیا ہے، لہٰذا فطری نہیں بلکہ مصنوعی ہے۔ بشریات کے ماہرین نے قدیم دور کے غیر متمدن انسانوں میں شرم وحیا کی کئی واضح صورتوں کا پتہ چلایا ہے۔ بے شرمی کے تصور کی انسانی فطرت میں جڑیں بہت گہری ہیں۔ ہم بغاوت کے جذبے سے مغلوب ہو کر یا سائنسی روح کے ساتھ وفاداری سے سرشار ہو کر اس کے خلاف اٹھ سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بائرن کی طرح خود کو فاسق وبدکار محسوس کرنے کی خاطر ہم اس کی نفی کر دیں، لیکن اس قسم کی باتوں سے شرم وحیا کا جذبہ ہمارے فطری جذبوں کی فہرست سے خارج نہیں ہوتا۔ یہ ماننے والی بات

ہے کہ معاشرے کی رسوم ورواج ہی یہ طے کرتے ہیں کہ کون سی بات ناشائستہ ہے۔ لیکن اس قسم کا رواج چونکہ دنیا کے تمام معاشروں میں موجود ہے، لہٰذا یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ محض رواج کا معاملہ نہیں۔ اس کے پیچھے کوئی گہرے عوامل ہیں۔ دنیا کے ہر معاشرے میں عریانی اور جنسی اعضاء کی نمائش کو برا سمجھا جاتا ہے۔ صرف بعض خاص قسم کی مذہبی تقاریب میں اس کی اجازت دی جاتی ہے۔

ممکن ہے کہ رہبانیت کا شرم وحیا سے کوئی نفسیاتی تعلق ہو یا نہ ہو، تاہم یہ لگتا ہے کہ یہ جذبہ تہذیب وتمدن کی ایک خاص درجے تک ترقی کے بعد ہی نمایا ہوتا ہے، پھر وہ خاصا طاقتور بھی ہو سکتا ہے۔ عہد قدیم کی ابتدائی کتب میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ بعد کی کتابوں خصوصاً اسفار محرفہ اور عہد نامہ جدید میں رہبانیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی معاملہ یونانیوں کا ہے۔ ان کی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں یہ شاذونادر ہی ملتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ البتہ اس کا چرچا بڑھتا رہتا ہے۔ ہندوستان میں رہبانیت بہت پہلے رواج پا گئی تھی اور اس میں شدت بھی بہت پیدا ہوگئی تھی، خیر میں یہاں اس کے مآخذ کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہ کروں گا۔ تاہم مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک قسم کا بے ساختہ احساس ہے جو تمام مہذب انسانوں میں تھوڑا بہت موجود ہوتا ہے۔ اس کی کمزور ترین صورت یہ ہے کہ کسی معزز فرد، خاص طور پر مذہبی احترام کی حامل کسی شخصیت کو جنسی مباشرت کی حالت میں عالم تصور میں لانے سے ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ دراصل اس معاملے کو وقار کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ روح کو جسم کی قید سے نجات دلانے کی خواہش نے دنیا کے بہت سے عظیم مذاہب کو تخلیقی تحریک عطا کی ہے۔ یہاں تک کہ جدید دانشوروں میں بھی یہ خواہش طاقتور ہے۔

خیر، ان باتوں کے باوجود میرا خیال یہی ہے کہ جنسی اخلاقیات کی تشکیل میں جس عامل نے سب سے بڑا کردار ادا کیا ہے، وہ رقابت ہے۔ رقابت جبلی طور پر غصہ وطیش کا سبب بنتی ہے۔ جب اس جذبے کو عقلی جواز مہیا کیا جائے تو وہ اخلاقی ناپسندیدگی بن جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ اس خالص جبلی محرک کو تہذیب کی نشوونما کے کسی ابتدائی مرحلے پر مردوں کی پدریت کو محفوظ بنانے کی خواہش نے مزید تقویت پہنچائی ہوگی۔ جب تک مردوں کو اس امر کا تحفظ نہ ملتا کہ ان کی بیویوں کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے انہی کے ہیں، تب تک باپ کی حکمرانی کا خاندانی نظام قائم نہ

ہوسکتا تھا۔ نہ ہی اپنے تمام تر معاشی مضمرات کے ساتھ پدریت سماجی اداروں کی بنیاد بن سکتی تھی۔

لہٰذا دوسرے شخص کی بیوی کے ساتھ تعلقات کو بڑا گناہ قرار دیا گیا لیکن کسی غیر شادی شدہ عورت کے ساتھ تعلقات کو قابل ملامت بھی نہیں سمجھا گیا۔ شادی شدہ افراد کی زنا کاری کی مذمت کرنے کے شاندار عملی اسباب موجود تھے، کیونکہ وہ کنفیوژن اور اکثر صورتوں میں قتل و غارت کا سبب بنتے تھے۔

ٹرائے کا محاصرہ شوہروں کے حقوق کی پامالی سے پیدا ہونے والے فساد کی انتہائی صورت تھا۔ لیکن عام لوگوں کے معاملے میں بھی جب اس قسم کی کوئی گڑبڑ ہوتی تو، چھوٹے پیمانے پہ ہی سہی، اس قسم کے واقعات ضرور پیش آتے۔ ان زمانوں میں مردوں کے اس قسم کے حقوق کے مقابلے میں عورتوں کے کوئی حقوق نہ تھے۔ بیوی کے بارے میں شوہر کا کوئی فرض نہ تھا، اگرچہ وہ دوسرے شوہروں کی جائیداد کا احترام کرنے کا فرض رکھتا تھا۔ جن احساسات کا ہم یہاں ذکر کر رہیں، ان پر مبنی پدری خاندان کا قدیم نظام ایک اعتبار سے کامیاب رہا تھا یعنی مردوں کو بالا دستی حاصل تھی اور وہ خاصی آزادی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں عورتیں زیردست تھیں۔ ان کی محکومی اس قدر مکمل تھی کہ ان کے دکھ درد اور مصیبتوں کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی۔

آج کی دنیا میں جنسی اخلاقیات کا نیا نظام وضع کرنا ضروری ہوگیا ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مردوں کو پہلے جیسی بالا دستی حاصل رہی ہے اور نہ ہی عورتیں ماضی کی طرح محروم اور غلام رہی ہیں۔ حالات بدل چکے ہیں اور عورتیں مردوں کی برابری اور مساوی حقوق کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ مساوات دو طریقوں سے حاصل ہوسکتی ہے۔ پہلا طریقہ یہ کہ مردوں پر سخت پابندیاں لگائی جائیں۔ ان کو یک زوجی کا پابند کیا جائے بیوی کے علاوہ کسی اور سے جنسی تعلقات رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ گویا ان کا معاملہ ویسا ہی بنا دیا جائے جیسا کہ ماضی میں عورتوں کا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ عورتوں کو بھی روایتی ضابطہ اخلاق سے ویسی ہی ڈھیل دی جائے جیسی کہ مردوں کو حاصل ہے۔ عورتوں کے حقوق کی تحریک کا آغاز کرنے والوں میں سے اکثر پہلے طریقہ کار کو ترجیح دیتے تھے۔ مذہبی حلقے اب بھی اس کے حامی ہیں۔ عملاً دیکھا جائے تو اکثر لوگ دوسرے طریقہ کار کے حامی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ابھی تک اپنے طرز عمل کو نظریاتی جواز عطا کرنے کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ کسی نئی اخلاقیات کی ضرورت کا احساس رکھنے والوں کو یہ جاننے

میں مشکل پیش آ رہی ہے کہ اس کے مقولات کیا ہوں گے۔

جدت کا ایک اور منبع بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جنسی علم پر عائد رواجی ممانعت کو سائنسی رویئے کے اثرات نے کمزور کر دیا ہے۔ اب یہ بات جان لی گئی ہے کہ جنسی بیماریوں جیسی کئی خرابیوں کا اس وقت تک موثر انداز میں مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جب تک رواجی اخلاقیات کی طرف سے عائد شدہ پابندیوں کی خلاف ورزی کر کے ان کا چرچا نہ کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک لوگوں کو ان بیماریوں کے اسباب کا علم حاصل نہ ہوگا، وہ ان سے بچنے کے اقدامات نہ کر سکیں گے۔ مزید براں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ خاموشی اور جہالت کے سبب فرد کی نفسیات پر نقصان دہ اثر پڑتا ہے۔ عمرانیات اور تحلیل نفسی دونوں نے سنجیدہ طالب علموں کو جنسی امور سے متعلقہ مسائل میں چپ رہنے کی حکمت عملی کی مخالفت کرنے پر اکسایا ہے۔ کئی معلمین نے بچوں کے ساتھ اپنے تجربے کی بنا پر یہی موقف اختیار کیا ہے۔ انسانی طرز عمل کے بارے میں سائنسی نقطہ نظر رکھنے والے لوگ کسی انسانی عمل کو ''گناہ'' قرار نہیں دیتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے طرز عمل کا تعین ہماری روایت، تعلیم اور ماحول کے حوالے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ناپسند افعال کا خاتمہ ان کی کھلم کھلا مذمت یا ملامت سے نہیں ہوگا بلکہ اس کام کے لیے مذکورہ تینوں اسباب کو کنٹرول کرنا پڑے گا۔ جنسی رویئے کی نئی اخلاقیات کی جستجو میں ہمیں پرانی اخلاقیات کو جنم دینے والے غیر عقلی جذبوں سے محفوظ رہنا ہوگا۔ پھر بھی یہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں کہ ان جذبوں نے محض اتفاقی طور پر ہی سہی، بعض عمدہ اخلاقی اصول بنا لیے تھے۔ وہ قوت کھو چکے ہیں، لیکن ختم نہیں ہوئے، بلکہ ابھی تک موجود ہیں۔ لہٰذا وہ ہمارے مسئلے کے کوائف میں شامل ہیں۔ ہم نے جو مثبت قدم اٹھانا ہے، وہ اپنے آپ سے یہ سوال کرنا ہے کہ کون سے اخلاقی اصول انسانی مسرتوں میں اضافے کا سبب بن سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اصول چاہے کوئی بھی ہوں، ان کی عالمگیر پیروی ممکن نہ ہوگی۔

(3)

آیئے، اب جنسی موضوعات کے علم کے مسئلے پر غور کریں۔ یہ مسئلہ ابتدائی مرحلے پر ہی پیدا ہو جاتا ہے اور جن مسائل کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں، ان میں سب سے آسان ہے۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ باتوں کے دوران حقائق کو چھپانے کا کوئی بھی مناسب جواز نہیں ہو سکتا۔

ہمیں ان کے سوالوں کا دیانت داری سے جواب دینا چاہیے اور ان کے تجسس کی تسکین کرنی چاہیے۔ہمیں اس امر سے نہیں گھبرانا چاہیے کہ بسا اوقات وہ جنس سے متعلقہ سوال اٹھانے لگتے ہیں۔اس موضوع پر بھی ان کے سوالوں کے جواب سادہ اور قابل فہم انداز میں دینے چاہئیں اور ان میں جذبوں کی آمیزش سے گریز کرنا چاہیے۔شہد کی مکھیوں اور پھولوں کی محبت سے گفتگو کا آغاز کرنا درست نہیں۔اس کے بجائے زندگی کے حقائق تک پہنچنے کے لیے سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔جس بچے کو اس کے سوالات کا سیدھا اور واضح جواب دیا جائے اور اس کو والدین کو ننگی حالت میں دیکھنے کا موقع مل جائے،وہ شہوت انگیزی اور ناپاک خیالی سے محفوظ رہے گا۔اس کے لیے جنس خبط نہیں بنے گی۔جن لڑکوں کی پال پوس حقائق کو چھپانے کے روایتی ماحول میں ہوتی ہے ،ان کے سر پر جنس کا بھوت زیادہ سوار رہتا ہے۔ان کے مقابلے میں جن لڑکوں کی تعلیم وتربیت جنس کو زندگی کے بے شمار حقائق میں سے ایک قرار دینے والے ماحول میں ہوتی ہے،ان کا جنس کے بارے میں رویہ صحت مندانہ رہتا ہے۔وہ اس کے بوجھ تلے دب نہیں جاتے ہیں۔روایتی ماحول میں تربیت پانے والے لڑکوں کو جب جنسی حقائق کا علم ہوتا ہے تو وہ فریب کاری اور منافقت سے کام لینے لگتے ہیں۔دوسری طرف اگر وہ زندگی کے جنسی پہلو سے واقعی بے خبر رہیں،تو یہ اس کے لیے تشویش اور صدمے کا باعث بنتی ہے اور وہ حقیقی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ہر قسم کی جہالت تاسف انگیز ہوا کرتی ہے۔لیکن جنس جیسے اہم معاملے میں جہالت ایک بڑا خطرہ بن جاتی ہے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ بچوں کو جنس کے بارے میں بتایا جانا چاہئے تو میرا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ بچوں کو جنس کے حقائق سے آگاہ کیا جائے۔نہیں میں تو یہ کہتا ہوں کہ بچے جو کچھ بھی جاننا چاہیں،وہ ان کو بتانا چاہیے۔بالغ افراد کو اس سے زیادہ پارسا بنا کر پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔جتنے کہ وہ ہیں۔یہ جھوٹ بولنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں کہ جنس صرف ازدواجی زندگی کا معاملہ ہے۔بچوں کو فریب دینے کا کوئی جواز نہیں۔ظاہر ہے کہ کبھی نہ کبھی ان کو حقائق کا علم حاصل ہو ہی جاتا ہے۔روایتی خاندانوں میں بچوں سے کئی باتیں چھپانے کی خاطر جھوٹ بولا جاتا ہے۔بعد میں جب بچوں کو حقائق کا علم ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ والدین نے ان کو فریب دیا تھا۔یوں والدین پر ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ خود بھی ،بدلے میں،ماں باپ سے جھوٹ بولنے کو

جائز سمجھنے لگتے ہیں۔ زندگی کے بعض حقائق ایسے ہیں کہ جن کو خواہ مخواہ بچے کے سر پر تھوپنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر وہ کسی ایسی حقیقت کے بارے میں سوال کرے تو پھر جھوٹ سے کام نہ لینا چاہیے۔ جس اچھائی کو جھوٹ کا سہارا درکار ہو، وہ اچھائی نہیں ہے۔ نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ اپنے عملی تجربے کی بنیاد پر بھی مجھے یقین ہے کہ بچوں کو جنس کو سر پر سوار کرنے، اس کے بارے میں لغو طریقے سے سوچنے اور غلط راہوں پر چلنے سے روکنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ان کو جنسی معلومات مہیا کی جائیں اور ان کو حقائق جاننے سے نہ روکا جائے۔ ایک روشن خیال جنسی اخلاقیات کی تشکیل کے لیے بھی یہ بات ضروری ہے۔

جہاں تک بالغ جنسی طرز عمل کا تصور ہے، شدت پسند متضاد رویوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا سہل نہیں ہے۔ رقابت کے احساس اور ایک سے زیادہ افراد کے ساتھ جنسی تجربے سے لطف اندوز ہونے کی خواہش کے درمیان تضاد بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کو حل کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ ماننے والی بات ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی جذبہ بھی عالمگیر نہیں ہے۔ ایسے لوگ موجود ہیں (اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی ہے) جو کبھی رقابت محسوس نہیں کرتے۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف ایک فرد کے ساتھ جنسی تعلق رکھنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ ان دونوں اقسام میں سے کوئی ایک قسم بھی عالمگیر ہو جائے تو پھر ایک تسلی بخش ضابطہ کی تشکیل آسان ہو جائے۔ یہ البتہ مان لینا چاہیے کہ ان دونوں اقسام کو زیادہ عام بنانا ممکن ہے۔ تاہم اس کے لیے اس مقصد کو پورا کرنے والی رسوم و دستور بنانے ہوں گے۔

ہماری اس بحث میں جنسی اخلاقیات کے کئی پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔ تاہم میرا نہیں خیال کہ زیادہ تجربہ حاصل کیے بغیر ہم ان کے بارے میں کوئی بہت مثبت بات کہہ سکتے ہیں۔ یہاں تجربے سے میری مراد مختلف نظاموں کے اثرات اور جنسی معاملات میں معقول تعلیم سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا تجربہ ہے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ ریاست کا ادارے کے طور پر شادی سے سروکار صرف بچوں کی وجہ سے ہونا چاہیے۔ جب تک بچے پیدا نہ ہوں، شادی کو بالکل نجی معاملہ سمجھ لینا چاہیے۔ اچھا، جہاں بچے ہوں، وہاں بھی ریاست کی دلچسپی صرف باپ کے فرائض کے حوالے سے ہونی چاہیے۔ ان فرائض کی نوعیت زیادہ تر مالی قسم کی ہوتی ہے۔ جہاں کہیں طلاق آسان ہے مثلاً سیکنڈے نیویا کے علاقے میں یہی معاملہ ہے، وہاں بچے عام طور پر ماں کے ساتھ چلے جاتے

ہیں ۔ وہاں باپ کی برتری اور حاکمیت کا خاندانی نظام کمزور ہونے لگا ہے ۔ ایک اور تبدیلی بھی دیکھیے ۔ محنت کشوں اور غریبوں کے معاملے میں ریاست نے ایسے بہت سے فرائض سنبھال لیے ہیں جواب تک باپوں کے کندھے پر سوار ہوا کرتے تھے ۔ مثلاً ریاست ان کے بچوں کے لیے تعلیم ،صحت ،تفریح اور دوسرے مواقع مہیا کرنے لگی ہے ۔ رہائش کی سہولتیں بھی دی جانے لگی ہیں ۔ آج کے زمانے سے پہلے یہ سب سہولتیں باپ کی ذمہ داری قرار پاتی تھیں ۔ ریاست کی اس دخل اندازی کے سبب باپوں کا بوجھ کم ہو گیا ہے...... اور ان کی ضرورت بھی کم ہوگئی ہے ۔ گویا یوں کہیے کہ شادی کا جواز مسلسل کم ہو رہا ہے ۔ ممکن ہے کہ آئندہ چل کر صرف امیر اور مذہبی لوگ ہی شادی کے جھنجھٹ میں پڑا کریں گے ۔

خیر، وہ زمانہ آنے تک اچھی بات یہ ہوگی کہ مرد اور عورتیں جنسی رشتوں، ازدواجی زندگی اور طلاق کے معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ تحمل و برداشت ،لطف وعنایت ،سچائی اور انصاف سے کام لیں ، جو لوگ روایتی معیاروں کے حساب سے پارسا ہوتے ہیں ، وہ اس وجہ سے خود کو دوسروں سے اعلیٰ و برتر سمجھنے لگتے ہیں ۔ ان کا رویہ اچھے اور شائستہ انسانوں جیسا نہیں رہتا ۔ اکثر معلمین اخلاق کے سر پر جنس کا بھوت اس قدر سوار رہا ہے کہ انہوں نے اخلاقی طور پر پسندیدہ طرز عمل کی کئی سماجی طور پر زیادہ مفید قسموں کو تقریباً نظر انداز ہی کر دیا ہے ۔



کیا مذہب ہماری مشکلات دور کر سکتا ہے؟

انسانیت ہلاکت خیز تباہی سے دوچار ہونے کے خطرے کی زد میں ہے اور اس تباہی کا خوف، ماضی کی طرح، آج بھی انسانوں کو خدا کے دامن میں پناہ لینے پر اکسا رہا ہے۔ مغربی دنیا میں عام طور پر مذہب کا احیا ہو رہا ہے۔ نازیوں اور اشتراکیوں نے مسیحت کو رد کر دیا تھا اور پھر ایسے کام کیے جن سے ہم کو نفرت ہے۔ اس صورت حال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت آسان تھا کہ ہٹلر اور سوویت حکومت کی طرف سے مسیحت کا رد کم از کم جزوی طور پر ہمارے مصائب کا سبب ضرور ہے اور یہ کہ اگر دنیا مسیحت سے رجوع کرلے تو ہمارے بین الاقوامی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض ایک فریب ہے جو خوف و دہشت سے پیدا ہوا ہے۔ میرا بھی یہ خیال ہے کہ یہ مغالطہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ ان لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے جن کی سوچ، بصورت دیگر، مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ فریب اور یہ مغالطہ ایک ٹھوس حل کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

درحقیقت زیر بحث مسئلے کا تعلق صرف دنیا کی موجودہ صورت حال سے نہیں۔ یہ اس سے کہیں زیادہ عمومی مسئلہ ہے۔ اور صدیوں سے اس پر بحث ہوتی رہی ہے۔ مسئلہ وہ یہ ہے کہ آیا انسانی معاشرے مذہب کے سہارے کے بغیر اخلاقیات کے حامل ہو سکتے ہیں؟ کیا اخلاقی نظام مذہب کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا؟ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اخلاق کو مذہب کے سہارے کی ہرگز اس قدر ضرورت نہیں جتنی کہ ارباب مذہب سمجھتے ہیں۔ میں تو یہاں تک سوچا کرتا ہوں کہ بعض بہت ہی اہم نیکیاں مذہب کے علمبرداروں میں نہیں ملتیں۔ وہ ان لوگوں میں پائی جاتی ہیں جو مذہب کے باغی ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو نیکیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور وہ راست بازی اور ذہنی دیانت ہیں۔ ذہنی دیانت سے میری مراد پیچیدہ مسائل کو ثبوت اور شہادتوں

کی بنیاد پر حل کرنے کی عادت ہے۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جب تک کافی ثبوت اور شہادتیں دستیاب نہ ہوں، تب تک ان مسائل کو غیر حل شدہ ہی رہنے دیا جائے۔ عقیدہ پرستی کے تمام نظاموں کے پیروکار اس خوبی کی اہمیت کو کم کیا کرتے ہیں۔ تاہم میری نزدیک اس کی بہت زیادہ سماجی اہمیت ہے اور دنیا کو اس سے مسیحت یا عقیدوں کے کسی اور نظام کے مقابلے میں زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

آیئے ایک لمحے کے لیے ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اخلاقی اصولوں کو کس طرح قبول کیا گیا ہے۔ عموماً یہ اصول دو قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ ایک قسم کے اصول وہ ہیں کہ جن کی بنیاد صرف مذہبی عقائد پر ہوتی ہے۔ دوسری قسم کے اخلاقی اصول وہ ہیں جن کی بنیاد صاف طور پر سماجی افادیت پر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ راسخ العقیدہ یونانی مسیحیت میں ایک ہی بچے کے دینی ماں باپ (یعنی جو بچے کے بپتسمہ کے موقع پر اس کے کفیل ماں باپ بنتے ہیں) کو آپس میں شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اصول کی بنیاد صرف مذہبی عقیدے پر ہے۔ اب اگر آپ اس اصول کو اہم خیال کرتے ہیں تو پھر آپ یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوں گے کہ مذہب کا زوال قابل مذمت ہے کیونکہ اس سے بالآخر مذکورہ اصول کی قدر و قیمت بھی ختم ہو جائے گی اور لوگ اس کی پرواکرنا چھوڑ دیں گے۔ خیر، یہاں ہمارا سروکار اس قسم کے اصولوں سے نہیں ہے۔ یہاں ہم ان اصولوں کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں جن کا مذہبی عقائد سے قطع نظر سماجی جواز موجود ہے۔

چلیے مثال کے لیے ہم چوری کا مسئلہ لیتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں سبھی چور ہیں اور ہر کوئی چوری کرنے میں جتا ہوا ہے تو وہ سب لوگ مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ یہ امر واضح ہے کہ اکثر لوگ اس معاشرے میں اپنی پسند کی زندگی گزار سکتے ہیں جس میں چوری کے واقعات شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں یعنی اس معاشرے میں سب لوگ چور نہ ہوں۔ کوئی اکادکا شخص ہی چور ہو، لیکن قوانین، اخلاقیات اور مذہب کی عدم موجودگی میں ایک مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر فرد کے لیے بہترین سماج وہ ہوگا جس میں وہ خود تو چور ہو، باقی تمام لوگ دیانتدار ہوں اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرد کے مفادات کو معاشرے کے مفادات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کسی سماجی ادارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کام فوجداری قانون اور پولیس موثر انداز میں کر دیتی ہے۔ لیکن

مجرم ہمیشہ ہاتھ نہیں آتے ۔ پولیس کی بہترین کوششوں کے باوجود کئی مجرم قانون کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں ۔ پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ طاقتور افراد کے معاملے میں پولیس کا رویہ نرم ہو اور وہ نا جائز طور پر ان کے آگے جھک جاتی ہو۔ اس پس منظر میں اگر لوگوں کو یقین دلایا جا سکے کہ خدا موجود ہے ۔ وہ سب کچھ جانتا ہے ۔ کوئی چور اس کی گرفت سے نہیں بھاگ سکتا۔ لہٰذا اگر کوئی چور پولیس سے بچ نکلے تو بھی وہ خدا کی گرفت میں آ جائے گا ۔ اس عقیدے کی تعلیم سے لگتا ہے کہ دیانت داری کو فروغ دینے میں مدد مل سکتی ہے ۔ لوگ پہلے سے خدا پر ایمان رکھتے ہوں تو وہ آسانی سے مان جائیں گے کہ خدا کو چوری کرنا پسند نہیں ہے اور یہ کہ اس نے چوری کرنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔

میں اس امر سے انکار نہ کروں گا کہ ماضی کے نیم مہذب معاشروں میں اس قسم کے عقائد نے سماجی طور پر پسندیدہ طرز عمل پیدا کرنے میں مدد دی ہو گی ، لیکن آج کے زمانے میں اخلاق کو الہیاتی منبع سے نوازنے والی اچھائی ایسی خرابیوں سے جڑی ہوئی ہے کہ ان کے مقابلے میں اچھائی غیر اہم ہو کر رہ جاتی ہے ۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ زمینی پابندیاں آسمانی پابندیوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں ، لوگوں کو اس امر کا زیادہ سے زیادہ یقین ہوتا چلا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے چوری کی تو وہ پکڑے جائیں گے ۔ دوسری طرف ان کا یہ تصور کمزور ہوتا چلا جاتا ہے کہ اگر چوری کرنے کے باوجود وہ پولیس اور قانون کے ہاتھوں سے بچ گئے تو بھی خدا ان کو سزا دے گا۔ اس کی سزا سے وہ بچ نہ سکیں گے ۔ حد یہ ہے کہ ہمارے زمانے کے زیادہ مذہبی لوگوں کو بھی بہ مشکل ہی یہ توقع ہے کہ چوری کرنے کے سبب ان کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک تو ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ مناسب وقت پر اپنے کیے کی معافی مانگ لیں اور دوسرے یہ کہ دوزخ پر ایمان ڈانواں ڈول ہے ۔ یا کم از کم وہ اس قدر ہیبت ناک نہیں رہا جتنا کہ پہلے زمانوں میں ہوا کرتا تھا۔ بہر حال ہم سب دیکھتے ہیں کہ مہذب معاشروں میں اکثر لوگ چوری نہیں کرتے اور میرا خیال یہ ہے کہ اس کی عمومی وجہ اسی زندگی میں پکڑے جانے اور سزا ملنے کا ڈر ہے ۔ اس امر کی تصدیق یوں بھی ہوسکتی ہے جونہی کسی معاشرے میں نظم ونسق ڈھیلا پڑ تا ہے ، یا کسی وجہ سے افراتفری پیدا ہوتی ہے تو پھر پکڑے جانے کا خوف کم ہو جاتا ہے اور تقریباً ہر کوئی چوری کرنے لگتا ہے۔

خیر آپ کہہ سکتے ہیں کہ چلیے مان لیا کہ چوری کی ممانعت کا مذہبی حکم اب بہت ضروری نہیں رہا، لیکن اس کے قائم رہنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ آخر ہم سب یہی چاہتے ہیں ناں کہ لوگ چوری نہ کریں۔ مصیبت مگر یہ ہے کہ جونہی لوگ مذہب پر شک کرنا شروع کرتے ہیں تو طاقتور گروہ ناگوار اور نقصان دہ طریقوں سے اس کی حمایت میں نکل آتے ہیں۔ نیکی کے لیے اگر کسی مذہب کو ضروری سمجھا جائے اور دوسری طرف بے لاگ اور غیر جانب دار تحقیقات سے پتہ چلے کہ اس مذہب کو درست ماننے کا کوئی جواز نہیں ہے، تو پھر ہوتا یہ ہے کہ حکام بے لاگ تحقیقات کی حوصلہ شکنی شروع کر دیتے ہیں۔ پرانے زمانوں میں اس قسم کے محققین کو کھونٹی پر چڑھا کر زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ کئی ملکوں میں آج بھی ایسے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں جو پرانے وحشیانہ طریقے سے تھوڑے ہی بہتر ہیں۔ مغربی ملکوں میں البتہ ترغیب دینے کے نرم طریقے بنائے گئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم طریقہ غالباً سکولوں کا ہے۔ چنانچہ تعلیم کا ایسا نظام وضع کر لیا گیا ہے جس کے ذریعے بچوں کو ان آراء کے حق میں دلائل سننے سے محفوظ کر لیا جاتا ہے جو حکام کو پسند نہیں ہوتیں۔ اس کے باوجود جو منحرف نظریات میں دلچسپی لینے سے باز نہیں آتے، ان کو سماجی ناپسندیدگی کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ، اگر ممکن ہو تو، ان کو اخلاقی اعتبار سے قابل ملامت ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے۔ اس طریقے سے مذہبی بنیاد رکھنے والا اخلاقی اصولوں کا نظام ان آلات میں ایک بن جاتا ہے جن کے ذریعے ارباب قوت اپنی بالا دستی کو قائم رکھتے ہیں اور نوجوانوں کی ذہنی توانائی کا ستیاناس کرتے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ آج کے زمانے میں بہت سے لوگوں میں سچائی سے بے نیازی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب لوگ مسیحیت کے فروغ میں دلائل دیتے ہیں تو وہ قرون وسطٰی کے مسیحی مفکر تھامس اکوئنس کی طرح اس امر کے حق میں دلائل نہیں دیتے کہ خدا موجود ہے اور یہ کہ اس نے انجیل میں اپنی مرضی کا اظہار کیا ہے اس کے بجائے ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ اگر لوگ مسیحیت کو قبول کر لیں تو ان کا طرز عمل نہ ماننے کے مقابلے میں بہتر ہو جائے گا۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک ہم کو خدا کے وجود یا عدم وجود پر غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بے پرواہی کے کسی لمحے پر اگر شک وشبہات سر اٹھانے لگیں تو ہم کو چاہیے کہ فوراً ہی ان کا سر کچل دیں۔ بے لاگ فکر اگر شک کا باعث بننے لگے تو ہمیں فوراً اس سے دامن چھڑا لینا چاہیے۔ راسخ الاعتقادی کے رسمی

ترجمان اگر آپ سے یہ کہیں کہ مرحوم بیوی کی بہن کیساتھ بیاہ کرنا گناہ ہے تو ہمیں نیک طور طریقوں کو بچانے کی خاطر فوراً ان کی بات مان لینی چاہیے۔اسی طرح اگر وہ خاندانی منصوبہ بندی کو گناہ قرار دیں تو ان کے ساتھ بحث ومباحثہ میں الجھے بغیر ان کا حکم مان لینا چاہیے۔چاہے آپ کو پورا یقین ہو کہ آبادی یونہی بے تحاشا بڑھی تو تباہی ناگزیر ہو جائے گی۔

ان ساری مثالوں میں آپ نے یہ بات نوٹ کی ہوگی کہ کسی عقیدے یا دعوے کو قبول کرنے کی وجہ یہ نہیں بتائی جا رہی ہے کہ وہ سچا ہے، بلکہ سچائی سے ہٹ کر دوسری وجوہ تلاش کی جا رہی ہے ۔یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ جونہی ہم اپنا رویہ بنالیں کہ کوئی عقیدہ اپنی سچائی کے بجائے کسی اور وجہ سے اہم ہو سکتا ہے تو پھر کئی خرابیاں آگے بڑھ آتی ہیں ۔تحقیق کی حوصلہ شکنی ان میں سب سے پہلی خرابی ہے ۔لیکن دوسری خرابیاں بھی پیچھے نہیں رہتیں ۔قدامت پسندوں کو قوت واختیار حاصل ہو جاتا ہے۔تاریخی دستاویزات میں اگر کوئی بات عقیدوں کے بارے میں شبہات پیدا کرنے والی ہو تو ان کی تکذیب شروع کر دی جاتی ہے ۔پھر یہ ہوتا ہے کہ جلد یا بدیر منحرف عقیدے رکھنے والوں کے خلاف مہم شروع کر دی جاتی ہے ۔پھانسیاں گاڑ دی جاتی ہیں اور نظر بندی کیمپ بنا دیئے جاتے ہیں ۔میں اس شخص کی قدر کر سکتا ہوں جو یہ کہے کہ مذہب سچا ہے لہٰذا ہم کو اس پر ایمان رکھنا چاہیے۔لیکن ان لوگوں کے لیے میرے دل میں گہری نفرت کے سوا کچھ نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب کی سچائی کا مسئلہ اٹھانا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے اور یہ کہ ہم کو مذہب اس لیے قبول کرنا چاہیے کہ وہ مفید ثابت ہوتا ہے۔یہ نقطہ نظر سچائی کی توہین کرتا ہے، اس کی اہمیت کو ختم کر دیتا ہے اور یوں جھوٹ کی بالادستی قائم کر دیتا ہے۔

مسیحی معذرت خواہ عام طور پر اشتراکت کو مسیحیت سے بہت مختلف شے قرار دیا کرتے ہیں ۔وہ اس کی برائیوں کا موازنہ مفروضہ طور پر مسیحی اقوام کو حاصل نعمتوں سے کرتے ہیں ۔میری نزدیک یہ بہت بڑی غلطی ہے۔اشتراکیت کی برائیاں وہی ہیں جو ایمان کے زمانوں میں مسیحیت میں پائی جاتی تھیں ۔سوویت خفیہ پولیس کے کارنامے رومن کیتھولک کلیسا کی قرون وسطیٰ کی عدالت احتساب کے کارناموں سے صرف مقداری طور پر ہی مختلف تھے ۔جہاں تک ظلم وستم کا تعلق ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں ۔اس پولیس نے روسیوں کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کو ایسا ہی نقصان پہنچایا جیسا کہ مذہبی احتساب کی عدالت نے مسیحی اقوام کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کو پہنچایا تھا

۔اشتراکی تاریخ کی تکزیب کرتے ہیں۔نشاۃ ثانیہ تک چرچ بھی یہی کام کیا کرتا تھا۔اب اگر چرچ گزشتہ صدیوں کی طرح بڑا نہیں رہا تو اس کی وجہ چرچ کے خلاف بغاوت کرنے والوں کا اثر ورسوخ ہے۔کونسل آف ٹرنٹ سے لے کر آج تک چرچ کی جو اصلاح ہوئی ہے، وہ اصل میں اس کے دشمنوں کی مرہون منت ہے۔بہت سے لوگ اشتراکیت کی مخالفت اس کے معاشی نظریہ کی وجہ سے کرتے ہیں۔لیکن ابتدائی دور کے مسیحی اور قرون وسطیٰ کے مسیحی بدعتی بھی اسی قسم کے نظریئے کے حامل تھے۔خیر اشتراکی نظریہ صرف بدعتیوں تک محدود نہ تھا چنانچہ سر تھامس مور کو لیجیے وہ کسی طور بھی بدعتی نہیں بلکہ راسخ العقیدہ شہید ہے۔مگر اس نے بھی مسیحیت کو اشتراکی انداز میں پیش کیا ہے۔اصل میں یہ سوویٹ نظریہ نہیں جس کو جائز طور پر خطرہ سمجھا جا سکتا ہے بلکہ خطرے کا سبب وہ طریقہ ہے جس کے مطابق اس نظریئے کو قبول کیا جاتا ہے۔اس کو مقدس اور ناقابل تردید سچائی قرار دیا جاتا ہے۔اس پر شک کرنے کو گناہ ٹھہرایا جاتا ہے اور شک کرنے والے کو سخت ترین سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔

مسیحی کی طرح اشتراکی بھی سمجھتا ہے کہ اس کا عقیدہ نجات کے لیے ناگزیر ہے۔اس عقیدے کے بغیر نجات حاصل نہیں ہوسکتی۔یہی عقیدہ اس کے لیے نجات کو ممکن بناتا ہے۔قصہ مختصر یہ کہ مسیحیت اور اشتراکیت میں مشابہتیں اور قربتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ ان کو ایک دوسرے کے لیے ناموافق بنا دیتی ہیں۔جب دو سائنس دانوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے تو وہ اختلاف کو دور کرنے کے لیے ثبوت تلاش کرتے ہیں۔جس کے حق میں ٹھوس اور واضح ثبوت مل جاتے ہیں، وہ راست قرار پاتا ہے۔ایسا اس لیے ہے کہ سائنس دان ہونے کی حیثیت سے ان دونوں میں سے کوئی بھی خود کو بے خطا خیال نہیں کرتا۔دونوں سمجھتے ہیں کہ وہ غلطی پر ہو سکتے ہیں۔اس کے برخلاف جب دو مذہبی علماء میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو وہ دونوں اپنے آپ کو مبرا عن الخطا خیال کرتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔دونوں میں سے ہر ایک کو یقین ہوتا ہے کہ صرف وہی راستی پر ہے۔لہٰذا ان کے درمیان فیصلہ نہیں ہو پاتا۔بس یہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگتے ہیں کیونکہ دونوں کو یقین ہوتا ہے کہ دوسرا نہ صرف غلطی پر ہے۔بلکہ راہ حق سے ہٹ جانے کے باعث گناہ گار بھی ہے۔اس صورت میں ظاہر ہے کہ جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور نظری مسائل حل کرنے کے لیے دنگا فساد تک نوبت جا پہنچتی ہے۔

میں مان لیتا ہوں کہ مسیحیت اب اس قدر نقصان دہ اور ضرر رساں نہیں رہی جتنی کہ ماضی میں ہوا کرتی تھی۔ مگر سبب اس کا یہ ہے کہ اب اس پر لوگوں کا ایمان پہلے جیسا جوشیلا نہیں رہا۔ شاید وقت کے ساتھ ایسی تبدیلی اشتراکیت میں بھی آ جائے گی۔ ایسا ہو تو اس نظریئے کو نامعقول بنانے والے بہت سے حصے ختم ہو جائیں گے۔ دوسری طرف اگر مغربی دنیا میں یہ عقیدہ برقرار رہا کہ نیکی اور سماجی استحکام کے لیے مسیحیت ناگزیر ہے تو پھر اس میں قرون وسطیٰ جیسی خرابیاں دوبارہ پیدا ہو جائیں گی۔ زیادہ سے زیادہ اشتراکیت جیسی بننے کی دوڑ دھوپ میں مسیحیت اشتراکیت سے زیادہ سے زیادہ مختلف ہوتی چلی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ راہ نہیں جس پر چل کر دنیا کو ہلاکت سے بچایا جا سکے۔



کیا انسان معقول ہو سکتا ہے؟

میں اپنے تئیں عقلیت پسند خیال کرنے کا عادی ہوں اور میرا خیال یہ بھی ہے کہ عقلیت پسند دوسرے لوگوں کو بھی معقول دیکھنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی طرح دوسرے بھی عقلیت پسندی کا شعار اپنائیں۔ لیکن حالیہ دنوں میں عقلیت پسندی کو بہت سے ضعف پہنچے ہیں۔ اور اس کا روایتی حلیہ بگاڑ دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ جاننا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ اس کا صریح طور پر مطلب کیا ہے اور کیا انسان عقلیت پسند ہو سکتے ہیں۔

عقلیت پسندی کی تعریف کے مسئلہ کے دو پہلو ہیں: ان میں سے ایک نظری ہے اور دوسرا عملی۔ مثلاً معقول رائے کیا ہوتی ہے؟ اور یہ کہ معقول طرز عمل کیا ہے؟ نتائج کی بنیاد پر فیصلے کرنے والے صاحبان، یعنی نتائجیت پسند رائے کی نامعقولیت پر زور دیتے ہیں جب کہ تحلیل نفسی نے طرز عمل کی غیر معقولیت پر اصرار کیا ہے۔ ان دونوں نے بہت سے لوگوں کے دل میں بات بٹھا دی ہے کہ عقلیت پسندی کے آئیڈیل جیسی کوئی شے نہیں جس سے رائے اور عمل دونوں مفید طور پر ہم آہنگ ہو سکیں ہو سکیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا نظر آتا ہے کہ اگر کسی معاملے میں میری اور آپ کی آراء مختلف ہیں تو پھر اختلاف کو دور کرنے کے لیے استقلال کا سہارا لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کسی غیر جانبدار تیسرے فرد کی ثالثی بھی ہمارے کام نہیں آ سکتی۔ باقی ایک ہی راہ رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الجھ پڑیں۔ اپنے مالی اور فوجی وسائل کے مطابق ایک دوسرے سے زبانی اشتہاری یا اصلی لڑائی شروع کر دیں۔ مجھے اس تصور سے وحشت ہوتی ہے، میں اس کو خطرناک سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک بالآخر یہ تہذیب کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ اسی لیے میں یہاں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جن خیالات کو عقلیت پسندی کے لیے مہلک قرار دیا گیا ہے۔ وہ عقلیت پسندی کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ فکر اور زندگی کے رہنما کے طور پر اس کو ماضی میں جو اہمیت دی

جاتی تھی، وہ اب بھی جُوں کی تُوں موجود ہے۔

آیئے ہم رائے کی معقولیت کے معاملے سے آغاز کریں۔ میں اس کی تعریف ایک ذہنی عادت کے طور پر کروں گا اور وہ عادت یہ ہے کہ کسی معاملے میں نتیجے تک پہنچنے کے لیے تمام متعلقہ شہادت کا جائزہ لیا جائے۔ اس کو دیکھا اور پرکھا جائے اور اس کے بعد ہی کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے یا کوئی فیصلہ کیا جائے۔ جس معاملے میں تیقن تک رسائی ممکن نہ ہو اور کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہ ہو سکتا ہو، اس معاملے میں معقول شخص اس رائے کو سب سے زیادہ وزن دیتا ہے جو سب سے زیادہ اغلب ہوتی ہے۔ تاہم وہ ان آراء کو بھی بالکل مسترد نہیں کرتا جو کافی حد تک اغلب ہوتی ہیں اور جن کے درست ہونے کا کافی حد تک امکان موجود ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کی آراء کو مفروضوں کی حیثیت سے ذہن میں رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعد کی کوئی شہادت ان کو قابل ترجیح بنا دے۔ یہ طریقہ کار فرض کرتا ہے کہ ایک معروضی طریقہ کار کی مدد سے بہت سے معاملات میں حقائق اور احتمالات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ معروضی طریقہ کار سے مراد وہ طریقہ کار ہے جو کوئی سے دو محتاط افراد کو یکساں نتیجے کی طرف لے جائیں گے۔ اکثر اوقات اس تصور پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں اور شک و شبے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ عقل کا کام بس یہ ہے کہ وہ ہماری خواہشوں اور ضرورتوں کی تسکین کرنے میں مدد دے۔ بس یہاں پلیسُ نیکسٹ بکس کمیٹی کی مثال دوں گا جس کا ''آؤٹ لائن آف سائیکالوجی'' نامی کتاب میں بیان یہ ہے کہ ''سب چیزوں سے بڑھ کر عقل طرف داری کا آلہ ہے۔'' اس کا کام اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ فرد یا نوع کے فائدے کے کام کیے جائیں گے اور جو کم مفید کام ہے، ان کی مزاحمت کی جائے گی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہی مصنفین اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''ایک مارکس پرست کا یقین مذہبی ایمان سے مختلف ہوتا ہے۔ مذہبی ایمان صرف خواہش اور روایت پر موسس ہوتا ہے جب کہ مارکسی یقین معروضی حقیقت کے سائنسی تجزیے پر مبنی ہوتا ہے۔'' میں سمجھتا ہوں کہ یہ دعویٰ ان صاحبان کے تصور عقل سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ یہ دعویٰ کریں کہ وہ عقل کے ذریعے مارکسی یقین تک نہیں پہنچتے تو پھر معاملہ مختلف ہوگا۔ خیر، جب وہ یہ مانتے ہیں کہ معروضی حقیقت کا سائنسی تجزیہ ممکن ہے تو پھر ان کو یہ بھی مان لینا چاہیے کہ ایسی آراء رکھی جا سکتی ہیں جو معروضی اعتبار سے معقول ہوتی ہیں۔

غیر عقلیت پسندی کی وکالت کرنے والے نتائجیت پسند فلسفیوں جیسے زیادہ عالم فاضل مصنفین کو قابو کرنا اس قدر آسان نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معروضی حقیقت موجود ہو تو پھر اس سے ہم آہنگ ہونے کی صورت میں رائے غلط ٹھہرے گی۔ لیکن اگر کوئی ایسی حقیقت ہی موجود نہ ہو تو پھر معروضی انداز میں رائے کے درست یا غلط ہونے کا سوال ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ نقطہ نظر رکھنے والے صاحبان آراء کو زندگی کی جنگ میں استعمال ہونے والے ہتھیار سمجھتے ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ جو آراء آپ کو اس میں کامیاب ہونے میں مدد دیتی ہیں، وہ آپ کے لیے درست ہیں اور نقصان دینے والی آراء غلط ہیں۔

چھٹی صدی عیسوی کے جاپان میں یہ نقطہ نظر مقبول تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب بدھ مت پہلے پہل وہاں پہنچا تھا۔ حکومت کو اس نئے مذہب کی صداقت کے بارے میں شبہ تھا۔ چنانچہ ایک درباری کو تجزیاتی طور پر یہ نیا مذہب اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ طے یہ پایا تھا کہ اگر وہ درباری نیا مذہب قبول کرنے کے بعد پھلتا پھولتا رہے اور دوسروں سے آگے نکل جائے تو اس سے مذہب کی سچائی ثابت ہو جائے گی اور سب لوگ اس کو قبول کر لیں گے۔ جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق چند تبدیلیوں کے ساتھ اسی طریقہ کار کو نتائجیت پسند ہر قسم کے مذہبی اختلافات کے سلسلے میں استعمال کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔ اچھا، اس رویے کے باوجود میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے یہودیت کو قبول کر لیا ہے، حالانکہ یہ مذہب دوسرے تمام مذہب کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے خوش حالی حاصل کرنے کا وسیلہ بن سکتا ہے۔

''سچائی'' کی اس تعریف کے باوجود نتائجیت پسند روزمرہ کی زندگی کے عملی معاملات میں ایک بالکل مختلف معیار پیش نظر رکھتا ہے۔ آپ اس کو قتل کے کسی مقدمے میں جج بنا دیں تو وہ دوسرے لوگوں کی طرح مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لئے شہادتوں کا بغور جائزہ لے گا، حالانکہ اگر وہ سچائی کی اپنی فلسفیانہ تعریف پر ثابت قدم رہے تو پھر اس کو بس یہ دیکھنا چاہیے کہ شہر کے لوگوں میں سے کس کو پھانسی کے تختے پر چڑھانا سب سے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ اس تعریف کے مطابق تو صرف یہی شخص قتل کا مجرم قرار پانا چاہیے۔ چاہے وہ بیچارہ بالکل معصوم اور بے گناہ ہی کیوں نہ ہو اور اس کا قتل سے دُور کا بھی کوئی تعلق نہ ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس شخص کو قاتل قرار دینا کسی دوسرے شخص کے مقابلے میں زیادہ مفید ہوگا اور اس لیے، نتائجیت پسندوں کے استدلال کے

مطابق، زیادہ سچ ثابت ہوگا۔

مجھے خدشہ ہے کہ اس قسم کی عملی نتائجیت پسندی کبھی کبھی واقعی سرزد ہو جایا کرتی ہے۔ میں نے امریکہ اور روس میں اس قسم کے جھوٹے مقدمات کے بارے میں سن رکھا ہے۔ یہ جعلی مقدمے کسی شخص کو سزا دینے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ لیکن ان مقدمات میں حقائق کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ حقائق چھپ نہ سکیں تو پھر سکینڈل بن جاتا ہے۔ چھپانے کی یہ کوشش ظاہر کرتی ہے کہ پولیس والے بھی فوجداری مقدمات میں معروضی صداقت کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ سائنس بھی اس قسم کی معروضی سچائی --- جو بہت ہی دنیاوی اور بے کیف قسم کا معاملہ ہے --- کو تلاش کرتی ہے۔ مذہب میں بھی لوگ ایسی ہی سچائی ڈھونڈتے ہیں۔ جب تک ان کو اس کے ملنے کی امید ہوتی ہے۔ لیکن جب ان کو یہ ثابت کرنے کی امید نہیں رہتی کہ مذہب سیدھے سادھے مفہوم میں سچا ہے، تب وہ یہ ثابت کرنے کے جتن کرتے ہیں کہ وہ کسی اچھوتے اور کسی گہرے مفہوم میں سچا ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناعقلیت پسندی، یعنی معروضی حقیقت میں عدم یقین، کم و بیش ہمیشہ ہی کسی ایسی شئے کو ثابت کرنے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کے لیے کوئی شہادت یا ثبوت موجود نہ ہو۔ اس کے علاوہ ناعقلیت پسندی کسی ایسی بات کا انکار کرنے کی خواہش سے بھی پیدا ہوتی ہے جس کے حق میں اچھی شہادتیں موجود ہوں۔ بہر حال جہاں تک عملی مسائل کا تعلق ہے، معروضی حقیقت میں یقین ہمیشہ ہی برقرار رہتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے سرمایہ کاری کرنی ہو یا ملازم ڈھونڈنے ہوں تو آپ معروضی حقیقت کا تصور نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ اگر کسی معاملے میں ہمارے خیالات کی سچائی کا ٹیسٹ حقیقت کو بنایا جا سکتا ہے۔ تو پھر یہ ٹیسٹ اور یہ معیار صرف اس معاملے تک محدود نہ رہے گا بلکہ اس کو زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی قبول کرنا پڑے گا جہاں کہیں اس معیار کا اطلاق نہ ہو سکے گا وہاں لاادریت کا سبب بنے گا۔

میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ مندرجہ بالا استدلال کافی نہیں ہے۔ اصل میں فلسفیوں کی بدحواسیوں نے حقائق کی معروضیت کا مسئلہ بہت الجھا دیا ہے۔ میں نے اس مسئلہ سے نمٹنے کی کسی اور جگہ زیادہ گہری کوشش کی ہے۔ یہاں میں بس یہ فرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ حقائق موجود ہیں، بعض حقائق کو جانا جا سکتا ہے اور بعض دوسرے حقائق کے بارے میں جزوی معلومات حاصل

کی جا سکتی ہیں۔ تاہم ہمارے عقائد کا معاملہ یہ ہے کہ وہ عموماً حقائق کے برعکس ہوتے ہیں۔ جب ہم بس یہ کہتے ہیں کہ کوئی شئے شہادت کی بنیاد پر قابل وقوع ہے تو اصل میں ہمیں یوں کہنا چاہیے کہ اسی شہادت کی بنا پر وہ نا قابل وقوع ہے۔ عقلیت پسندی کا نظری پہلو صاف طور پر یہ ہے کہ حقائق کے بارے میں اپنے عقائد کی اساس ہم خواہشات، تعصبات اور روایات کے بجائے شہادت اور ثبوت پر رکھیں۔ گویا ایک معقول شخص ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ کوئی منصف یا سائنس دان ہوتا ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسانوں کے عزیز عقیدوں کے عجیب وغریب اور کم وبیش مجنون منبع کی نشاندہی کر کے تحلیل نفسی نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اپنے عقیدوں کے معاملے میں معقولیت پسند نہیں بن سکتے۔ اچھا، اگر چہ میں تحلیل نفسی کا بہت احترام کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ وہ بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن عوامی ذہن نے اس مقصد کو کسی قدر نظر انداز کر دیا ہے۔ جس کے لیے فرائڈ اور اس کے مقلدین سرگرم کار تھے۔ ان کا مقصد اور طریق کار زیادہ تر معالجانہ تھا۔ وہ ہسٹریا اور جنون کی اقسام کا علاج کر رہے تھے۔ جنگ اول کے زمانے میں تحلیل نفسی جنگ سے متعلقہ ذہنی بیماریوں کے علاج میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ ریورز کی کتاب ''جبلت اور لاشعور'' زیادہ تر جنگی ماندگی کے مریضوں کے تجربے پر مبنی ہے۔ یہ کتاب خوف کے مریضانہ اثرات کا خوبصورت تجزیہ پیش کرتی ہے۔ یہ اثرات زیادہ تر غیر عقلی ہوتے ہیں اور کئی قسم کی بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ یہاں ان سے ہمارا سروکار نہیں ہے۔ اس کے بجائے یہاں ہماری دلچسپی ذہنی جنون وفتور سے ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ پاگلوں کے بہت سے خبط رکاوٹوں سے پیدا ہوتے ہیں اور محض ذہنی طریقوں سے ان کا علاج کیا جا سکتا ہے۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مریض کو دو قسم کے حقائق یاد دلائے جائیں جن کو اس نے زبردستی دبا رکھا ہے۔ اس قسم کا علاج اور اس کی تحریک پیدا کرنے والا نقطہ نظر ذہنی صحت اور معقولیت کے ایک معیار کو پہلے سے فرض کرتا ہے۔ مریض کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس معیار سے ہٹ چکا ہے اور اس کو تمام متعلقہ حقائق یاد دلا کر اس معیار کی طرف واپس لانا ہوتا ہے۔ ان حقائق میں ایسے بھی شامل ہوتے ہیں جن کو بھلانے کی مریض سب سے زیادہ خواہش کرتا ہے۔

یہ ہے تحلیل نفسی کی حقیقت، مگر بعض لوگوں نے مشہور یہ کر رکھا ہے کہ تحلیل نفسی نامعقول

عقائد کی برتری کو ثابت کرتی ہے۔ وہ یہ سیدھی سی بات بھول جاتے ہیں یا پھر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تحلیل نفسی اس برتری کو قائم نہیں رکھتی اور نہ ہی قائم رکھنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے بالکل برعکس وہ طبی علاج کے ایک معین طریقے کے ذریعے اس کو ختم کرتی ہے۔ اس خاتمے کو ہی وہ ذہنی صحت کا عنوان دیتی ہے۔ اس سے ملتا جلتا طریقہ ان لوگوں کے غیر معقول رویوں اور عقیدوں کے علاج کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے جو مجنون ہونے کے طور پر پہچانے نہیں جاتے۔ شرط بس یہ ہے کہ وہ لوگ ایسے معالج کا علاج قبول کر لیں جو ان لوگوں کے وہموں اور وسوسوں سے محفوظ ہو۔ مملکتوں کے سربراہ، وزراء اور معروف شخصیات شاذ و نادر ہی یہ شرط پوری کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ سب لوگ علاج سے محروم رہ جاتے ہیں۔

ابھی تک ہم نے عقلیت کے صرف نظری پہلو تک توجہ محدود رکھی ہے۔ اب ہمیں عملی پہلو کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ یہ پہلو زیادہ مشکل ہے۔ خیر، بات یہ ہے کہ عملی مسئلوں پر اختلاف رائے دو اسباب سے پیدا ہوتا ہے، پہلا سبب یہ ہے کہ اختلاف کرنے والوں کی خواہشیں مختلف ہوتی ہیں اور خواہشوں کا یہ فرق ان کی آراء میں اختلاف کا باعث بن جاتا ہے۔ دوسرا سبب ان خواہشوں کی تکمیل کرنے کے وسائل کے بارے میں اختلاف بنتا ہے۔ اس دوسری قسم کے اختلافات دراصل فطری قسم کے ہوتے ہیں اور صرف استخراجی طور پر عملی ہوتے ہیں۔ آیئے ہم اس کی ایک مثال پیش کریں۔ بعض حکام کی رائے یہ ہے کہ دفاع کی پہلی لائن جنگی بحری جہازوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ کئی حکام اس رائے کو درست تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلی دفاعی لان طیاروں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اختلاف کرنے والے دونوں گروہوں میں مقصد کے بارے میں کوئی جھگڑا نہیں، ان کا مقصد ایک ہی ہے۔ یعنی دونوں گروہ قومی دفاع کے حامی ہیں اور اپنی اپنی دانست میں اس کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔ اختلاف ان میں ہے تو ذرائع کے بارے میں ہے۔ لہٰذا یہ دونوں گروہ سائنسی انداز میں دلائل دے سکتے ہیں اور یوں اپنا اختلاف دور کر سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے اختلاف کا تعلق موجودہ یا مستقبل کے یقینی یا احتمائی حقائق سے ہے۔ اس قسم کے تمام معاملات میں اگرچہ کوئی نہ کوئی عملی مسئلہ زیر بحث ہوتا ہے، لیکن ان پر اسی قسم کی عقلیت پسندی کا اطلاق ہوتا ہے جس کو میں نظری قرار دیتا ہوں۔

بہر حال اسی ذیل میں آنے والے بہت سے معاملات میں ایک ایسی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے

جو عمل میں بہت اہم ہوتی ہے۔ یہاں اس شخص کی مثال لیجئے جو کسی خاص انداز میں عمل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلائے گا کہ اس طرح عمل کرنے سے وہ کوئی ایسا مقصد حاصل کر پائے گا جس کو وہ اچھا اور پسندیدہ سمجھتا ہے لیکن اس خواہش کی عدم موجودگی میں اس کو اپنے تصور کا کوئی جواز دکھائی نہ دے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کا رویہ بالکل بدل جائے گا اور وہ اس عمل کا جائزہ غیر جانب داری سے لینا چاہے گا۔ جواریوں کے متعلق ہم سب جانتے ہیں کہ ان کے رویے سراسر غیر معقول ہوتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر کھیل ان کی جیت کا سبب بنے۔ کچھ ایسا ہی حال سیاست میں دلچسپی لینے والوں کا ہوتا ہے۔ ان کا تعلق کسی ایک سیاسی جماعت سے بن جاتا ہے اور وہ ان کو فرشتوں کی جماعت نظر آتی ہے جب کہ باقی تمام جماعتیں ان کو شیطانوں کے گروہ دکھائی دیتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پارٹی کے لیڈر کبھی بھی دوسری جماعتوں کے رہنماؤں جیسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال نہیں کر سکتے۔ جو انتظامیہ کے حامی ہوتے ہیں ان کو انسانوں کو مویشیوں کی طرح ہانکنا اچھا لگتا ہے۔ تمباکو کے شوقین دعویٰ کرتے ہیں کہ اس سے اعصاب کو سکون ملتا ہے اور شراب کے رسیا کہتے ہیں کہ وہ بذلہ سنجی اور برجستگی کو تحریک دیتی ہے۔

اصل میں ان ساری وجوہ سے پیدا ہونے والا تعصب فیصلہ کرنے کی انسانی صلاحیتوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس سے دامن بچانا بہت مشکل ہے۔ یہ معاملہ اس حد تک ہے کہ اگر آپ اعصاب پر شراب نوشی کے اثرات کے بارے میں کوئی عملی اور سائنسی قسم کا مقالہ پڑھیں تو زیادہ امکان یہی ہے کہ اس کے مندرجات سے اندازہ ہو جائے گا کہ آیا مقالہ نگار خود شراب پینے والا ہے یا اس سے پرہیز کرنے والا ہے۔ وہ حقائق کو اس انداز سے دیکھ رہا ہو گا جس سے اس کے اپنے طرز عمل کی تائید ہو جائے۔

سیاست اور مذہب میں اس قسم کے امور بہت اہم ہو جاتے ہیں۔ اکثر لوگ سوچتے ہیں کہ ان کی سیاسی آراء قومی اور عوامی مفاد پر مبنی ہیں لیکن دس میں سے نو صورتوں میں آپ کسی شخص کی سیاست کی پیش گوئی اس بنیاد پر کر سکتے ہیں کہ اس کا وسیلہ روزگار کیا ہے۔ اس امر واقعہ کی وجہ سے بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں --- اور بہت سے دوسرے عملی طور پر اس میں یقین بھی رکھتے ہیں --- کہ اس قسم کے امور میں غیر جانب دار اور معروضی ہونا ممکن نہیں ہے اور یہ کہ متضاد تعصبات رکھنے والے طبقوں کے درمیان رسہ کشی کے سوا کوئی طریقہ کار نہیں ہے۔

خیر، ایسے معاملات میں جن میں تحلیل نفسی بطور خاص مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کو ان تعصبات سے آگاہ ہونے کے قابل بناتی ہے جو اب تک لاشعور میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں اپنے آپ کو اس طرح دیکھنے کی تکنیک مہیا کرتی ہے جس طرح کہ دوسرے لوگ ہم کو دیکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ہم کو یہ فرض کرنے کا سبب بھی دیتی ہے کہ ہمارے متعلق یہ نقطہ نظر اس سے کم غیر منصفانہ ہے جتنا کہ ہم سوچنے کا میلان رکھتے ہیں۔ اگر اس طریقہ کار کو سائنسی نقطہ نظر کی تربیت کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر رائج کر دیا جائے تو وہ لوگوں کو تمام حقائق سے متعلق ان کے عقیدوں اور کسی مجوزہ عمل کے ممکنہ اثرات کے بارے میں، آج کے مقابلے میں، غیر محدود طور پر معقول ہونے کے قابل بنا سکتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر لوگ اس قسم کے معاملات میں ایک دوسرے سے متفق ہو جائیں تو جو اختلافات باقی بچیں گے، وہ کم وبیش یقینی طور پر، خوش اسلوبی سے حل کرنے کے قابل ہوں گے۔

بعض ایسے مسائل بہرحال بچ جاتے ہیں جن کو خالص عقلی طریقوں سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ خواہشوں کا معاملہ لیجئے۔ کسی شخص کی خواہشوں کو کسی طریقے سے بھی کسی دوسرے شخص کی خواہشوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔ سٹاک ایکس چینج کے دو حریف اس امر پر ایک دوسرے سے مکمل طور پر متفق ہو سکتے ہیں کہ فلاں فلاں عمل کے کون کون سے نتائج پیدا ہوں گے، مگر یہ کامل اتفاق ان میں عملی اتفاق پیدا نہ کر سکے گا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ دونوں حریف ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر خود فائدہ حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ یہ بات درست ہے، لیکن آپ دیکھئے کہ یہاں بھی عقلیت پسندی اس نقصان کو خاصی حد تک روکنے کی اہل ہوتی ہے جو بصورت دیگر پہنچ سکتا ہے۔ ہم اس شخص کو نامعقول کہتے ہیں جو جذبے کے تحت کام کرتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وقتی غلبہ حاصل کرنے والی خواہش سے مغلوب ہو کر وہ اپنی ایسی خواہشوں سے بے نیاز ہو رہا ہے جو بالآخر اس کے لیے زیادا اہم ہوتی ہیں۔ اگر انسان تمام معقول ہوتے تو وہ اپنے مفادات کا زیادہ صحیح اندازہ لگانے کے زیادہ اہل ہوتے۔ اگر تمام انسان وسیع المشرب ذاتی مفادات سے تحریک حاصل کرنا شروع کر دیں تو دنیا کی حالت بدل جائے۔ وہ آج کے مقابلے میں جنت بن جائے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عمل کا ذاتی مفاد سے بہتر کوئی محرک نہیں۔ تاہم میری رائے یہ ضرور ہے کہ جذبہ ایثار کی طرح جب ذاتی مفاد بھی وسیع المشرب اور روشن خیال ہو تو وہ اس کی متضاد صورت

کے مقابلے میں بہتر ہوا کرتا ہے۔ منظم معاشرے میں دوسروں کو نقصان پہنچانے والا کوئی کام شاذ و نادر ہی کسی شخص کے ذاتی مفاد میں ہوتا ہے۔ آدمی جس قدر کم عقل ہو، اسی قدر اس کو پتہ نہیں چلتا کہ جس شے سے دوسروں کو نقصان پہنچتا ہے۔ وہ خود اس کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفرت یا حسد اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے۔ وہ معاملات کو صحیح طور پر دیکھنے کے قابل نہیں رہتا۔ لہٰذا اگرچہ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ روشن خیال ذاتی مفاد اعلیٰ ترین اخلاقی اصول ہے، پھر بھی میں یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ اصول ہی عام ہو جائے تو دنیا کی حالت آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر ہو جائے گی۔

عملی عقلیت پسندی کی تعریف ہم وقتی طور پر غلبہ پا لینے والی خواہش سے مغلوب ہو جانے کے بجائے اپنی تمام متعلقہ خواہشات کو یاد رکھنے کی عادت کے طور پر کر سکتے ہیں۔ نظری امور کی عقلیت پسندی کی طرح یہاں بھی معاملہ درجے کا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کامل عقلیت پسندی ایک ناقابل حصول آدرش ہے، لیکن جب تک ہم بعض لوگوں کو مخبوط الحواس قرار دیتے رہیں گے تب تک اس بارے میں بھی شبہ نہ رہے گا کہ ہم بعض لوگوں کو دوسروں کے مقابلے معقول سمجھتے ہیں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں ہونے والی تمام ٹھوس ترقی، عملی اور نظری دونوں قسم کی عقلیت پسندی میں اضافے کی مرہون منت ہے۔

بے غرضانہ اخلاقیات کی تبلیغ کرنا مجھے فضول سا کام لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تبلیغ سے وہی لوگ اثر قبول کریں گے جو پہلے سے بے غرضانہ اور ایثار پیشہ خواہشات کے حامل ہیں۔ اس کے برخلاف عقلیت پسندی کی تبلیغ کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ عقلیت ہم کو، مجموعی طور پر خود اپنی خواہشوں کی تکمیل میں مدد دیتی ہے کوئی شخص اس قدر معقول ہوتا ہے جس قدر اس کی خواہش اس کی ذہانت کے قابو میں ہوتی ہے۔ میرا یقین یہ ہے کہ ہمارے اعمال پر ہماری ذہانت کا کنٹرول سب سے زیادہ اہم بات ہے۔ سائنس دوسروں کو نقصان پہنچانے کے ہمارے وسائل میں برابر اضافہ کرتی چلی جارہی ہے، لہٰذا اعمال پر ذہانت کی یہ گرفت ہی ایک ایسی شے ہے جو اس صورت حال میں سماجی زندگی کو ممکن بنائے رکھے گی۔ آج کے زمانے میں حالت یہ ہے کہ تعلیم، پریس، سیاست اور مذہب --- مختصر یہ ہے کہ دنیا کی تمام عظیم قوتیں --- غیر عقلیت پسندی کا ساتھ دے رہی ہیں۔ یہ قوتیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جو عوام کو غلط راہ پر ڈال رہے ہیں۔ اس کا حل

کسی عظیم الشان انقلاب میں نہیں بلکہ دنیا اور ہمسائیوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کا زیادہ صحت مند اور متوازن رویہ پیدا کرنے کی افراد کی کوششوں میں مضمر ہے۔ دنیا کا زیادہ صحت مند اور متوازن رویہ پیدا کرنے کی انفرادی کوششوں میں مضمر ہے۔ دنیا کو درپیش مسائل کے حل کے لیے ہم کو، بتدریج فروغ پذیر، ذہانت وعقل سے رجوع کرنا چاہیے۔



میں فلسفے کی طرف کیوں راغب ہوا؟

مختلف محرکات لوگوں کو فلسفی بننے کی راہ پر ڈالتے رہے ہیں۔ان میں سب سے زیادہ قابل احترام محرک دنیا کو سمجھنے کی خواہش رہی ہے۔ابتدائی زمانے میں فلسفہ اور سائنس دونوں ایک شے تھے۔ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا لہٰذا دنیا کو سمجھنے کا محرک سب پر غالب تھا۔اسی زمانے میں فلسفے کی طرف راغب کرنے والا ایک اور محرک حواس کی فریب کاری تھا۔اس قسم کے سوالات اٹھائے جایا کرتے تھے کہ قوس قزح کیا ہے، کیا چیزیں اصل میں ویسی ہیں جیسی کہ وہ سورج کی روشنی میں نظر آتی ہیں یا جیسی وہ چاندنی میں دکھائی دیتی ہیں۔ان مسائل کو قدرے جدید اصولوں میں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ کیا چیزیں ویسی ہیں جیسی کہ وہ ننگی آنکھ سے نظر آتی ہیں یا ویسی ہیں جیسی کہ وہ خوردبین سے نظر آتی ہیں۔

خیر اسی قسم کے معموں اور الجھیڑوں کی جگہ جلد ہی ایک بڑے مسئلے نے لے لی۔یونانی اولمپس کے دیوتاؤں کے بارے میں شک وشبہات میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے فلسفہ میں روایتی عقیدوں کا متبادل تلاش کرنا شروع کر دیا۔ان دونوں محرکات کے امتزاج سے فلسفے میں ایک دہری تحریک شروع ہوئی۔ایک طرف تو وہ یہ ظاہر کرتی دکھائی دیتی تھی کہ روزمرہ کی زندگی میں ہم جس شے کو علم خیال کرتے ہیں، وہ حقیقی علم نہیں ہے۔دوسری طرف وہ یہ سوچنے کا میلان پیدا کرتی تھی کہ کوئی گہری فلسفیانہ سچائی موجود ہے جو، اکثر فلسفیوں کے نزدیک، ہمارے روزمرہ کے عقائد کے مقابلے میں اس شے کے زیادہ موافق ہے جیسی کہ ہماری کائنات کو ہونا چاہیے۔کم وبیش تمام فلسفے میں شک اہم آلہ کار رہا ہے اور یقینی طور پر شک فلسفے کا مطمع نظر بھی ہے۔حواس پر شک کیا جاتا رہا ہے، سائنس پر شک کیا جاتا رہا ہے اور الہیات پر بھی شک کیا جاتا رہا ہے۔بعض فلسفی ان میں سے کسی ایک شک پر زور دیتے رہے ہیں اور دوسرے فلسفی کسی اور شک کے زیر اثر رہے ہیں۔ان

شکوک کے جو جوابات دیئے گئے، وہ تمام فلسفیوں کو مطمئن نہ کر سکے۔ لہٰذا ان کے درمیان اختلافات موجود رہے، یہاں تک کہ وہ اس امر پر بھی متفق نہ ہو سکے کہ آیا کوئی جوابات ممکن ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

مجھے فلسفے کی طرف راغب کرنے میں تمام روایتی محرکات نے حصہ لیا ہے۔ تاہم دو محرکات نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ پہلا اور زیادہ دیرپا ثابت ہونے والا محرک یہ خواہش تھی کہ ایسا علم تلاش کیا جائے جو شبہات سے پاک ہو اور جس کو یقینی طور پر سچا تسلیم کیا جا سکے۔ دوسرا محرک مذہبی احساسات کے لیے کوئی نہ کوئی تسکین حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ میرا خیال ہے کہ پہلے پہل گیارہ برس کی عمر میں فلسفے کی طرف میری توجہ ہوئی (یہ اور بات ہے کہ ان دنوں میں لفظ ''فلسفہ'' سے ناآشنا تھا) میرا بچپن زیادہ تر تنہائی کا شکار رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ میرا بھائی عمر میں مجھ سے سات سال بڑا تھا۔ بلاشبہ زیادہ تنہائی کے باعث گھمبیر سنجیدگی مجھ پر طاری ہوگئی۔ سوچنے کے لیے میرے پاس بہت سا وقت تھا لیکن ظاہر ہے کہ علم زیادہ نہ تھا جو سوچ بچار کا مواد بن سکتا۔ مجھے اس زمانے میں خبر تو نہ تھی، لیکن لطف ریاضیاتی ذہن کی نشاندہی کرنے والے استدلال میں آتا تھا۔ بعد ازاں جب میں نے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ بعض دوسرے لوگوں کی کیفیت بھی یہی ہے۔ میرا دوست جی۔ ایچ۔ ہارڈی نظری ریاضی کا پروفیسر تھا۔ وہ بہت اعلیٰ سطح پر اس سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے بتایا کہ اگر اس کو اس امر کا ثبوت مل جائے کہ میں پانچ منٹوں کے اندر مرنے والا ہوں تو اگرچہ اس کو مجھ سے محروم ہونے کا رنج پہنچے گا، لیکن ثبوت سے حاصل ہونے والی خوشی اس رنج سے کہیں زیادہ ہوگی۔

اپنے دوست کی زبان سے یہ بات سن کر مجھے ذرا بھی تکلیف نہ پہنچی بلکہ مجھے تو اس سے پوری ہمدردی پیدا ہوگئی۔ ابھی میں نے جیومیٹری کا مطالعہ شروع نہ کیا تھا تو کسی نے مجھے بتایا کہ جیومیٹری چیزوں کو ثابت کر سکتی ہے، چنانچہ جب میرے بھائی نے کہا کہ وہ مجھے جیومیٹری پڑھایا کرے گا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس زمانے میں جیومیٹری ابھی تک ''اقلیدسی'' چلی آ رہی تھی۔ بھائی نے مجھے پڑھانے کا آغاز تعریفات سے کیا۔ میں نے ان کو فوراً قبول کر لیا۔ ان کے بعد مسلمات کی باری آئی تو بھائی نے کہا کہ ''ان کو ثابت نہیں کیا جا سکتا لیکن باقی چیزوں کو ثابت کرنے کے لیے ان کو قبول کرنا ناگزیر ہے۔'' یہ سنتے ہی میری امیدیں پارہ پارہ ہوگئیں۔ میں ایسا علم

حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جس کو ثابت کیا جا سکے۔ لیکن معلوم اب یہ ہوا کہ یہ کام ایسے مفروضوں کو قبول کرنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے کہ جن کو خود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

غصے اور احتجاج کے ساتھ بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا کہ ''اگر ان باتوں کو ثابت نہیں کیا جا سکتا تو میں ان کو کیوں مان لوں؟'' اس نے جواب دیا ''اچھا تم نہیں مانو گے تو ہم آگے نہ بڑھ سکیں گے۔'' اس پر میرے جی میں آیا کہ آگے تو بڑھنا چاہیے، شاید کوئی بات بن جائے۔ یوں میں وقتی طور پر مسلمات کو قبول کرنے پر رضامند ہو گیا۔ شک و شبہات مگر موجود رہے اور وہ جو جیومیٹری سیکھنے کا شوق تھا، پہلے جیسا نہ رہا۔ ان شکوک و شبہات کی شدت برقرار نہ رہی۔ ریاضی سے مجھے گہری مسرت ہونے لگی۔ یہ مسرت اس قدر زیادہ تھی کہ کسی اور مطالعے سے مجھے حاصل نہ ہوئی۔ میں طبعی دنیا پر ریاضی کی اطلاقات کے بارے میں سوچنا پسند کرتا تھا اور امید کرتا تھا کہ جلد ہی انسانی کردار کی ریاضی وجود میں آ جائے گی اور وہ مشینوں کی ریاضی جتنی صریح ہو گی۔ یہ امید اس لیے تھی کہ میں ثبوت پسند کرتا تھا۔ اکثر اوقات یہ محرک آزاد ارادہ میں یقین کرنے کی خواہش پر بھی غالب آ جاتا تھا۔ بہر حال ان ساری باتوں کے باوجود، ریاضی کے ٹھوس ہونے کے بارے میں میرے بنیادی شکوک برقرار ہی رہے اور میں ان سے پوری طرح نجات نہ پا سکا۔

جب میں نے اعلیٰ ریاضی سیکھنی شروع کی تو نئی الجھنوں نے گھیر لیا۔ استاد مجھے ایسے ثبوت پیش کرتے تھے جو مجھ کو غلط محسوس ہوتے تھے۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ ان کو جعلی تسلیم کیا جا چکا تھا۔ ان ایام میں یا کیمبرج چھوڑنے کے بعد کچھ عرصے تک مجھے یہ بالکل خبر نہ تھی کہ جرمن ریاضی دانوں نے بہتر ثبوت ڈھونڈ لیے تھے۔ اس لیے میں کانٹ کے فلسفے کے دلیرانہ اقدامات کا بدستور مداح رہا۔ یہ فلسفہ ایک بڑا نیا سروے سامنے لاتا ہے۔ جس کے حوالے سے اس قسم کی مشکلات غیر موثر اور غیر اہم ہو جاتی ہیں جو میرے لیے پریشان کن رہی تھیں۔ پھر وہ زمانہ مابعد الطبیعیاتی پریشان خیالی کی دلدل میں میرے گہرائی تک اترنے کے بعد ہی آیا۔ فلسفے کی طرف میری رغبت ریاضی سے کسی حد تک بیزاری کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ یہ بیزاری اس قسم کی مہارت پر بے حد توجہ مرکوز کرنے اور اور اس میں پوری طرح ڈوب جانے کا نتیجہ تھی جس کی ضرورت امتحانات میں پڑتی ہے۔ امتحانی تکنیک حاصل کرنے کی کوشش نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ریاضی عیارانہ داؤ پیچ اور معصومانہ تدبیروں پر مشتمل ہے اور مجموعی طور پر کسی لفظی معمے جیسی ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں تین

سال گزارنے کے بعد. ب ریاضی کے اپنے آخری امتحان سے فارغ ہوا تو میں نے قسم کھائی کہ آئندہ کبھی ریاضی کی طرف لو ہٹ نہ کروں گا۔اس کے ساتھ ہی میں نے ریاضی کی اپنی ساری کتابیں بیچ ڈالیں ۔اس ذہنی کیفیت میں فلسفہ کے مطالعہ سے مجھے ویسی ہی مسرت حاصل ہوئی جیسی کہ کسی تنگ وادی سے نکلنے پر کوئی وسیع ارضی منظر عطا کرتا ہے۔

بات یہ نہیں کہ میں نے صرف ریاضی سے تیقن حاصل کرنا چاہا تھا۔ڈیکارٹ کی طرح (جس کے کام سے میں ابھی تک لاعلم تھا) میرا خیال بھی یہ تھا کہ میرا اپنا وجود میرے لیے ہر قسم کے شبہات سے محفوظ ہے۔مزید براں ڈیکارٹ کی طرح مجھے بھی یہ فرض کرنا ممکن لگتا تھا کہ خارجی دنیا محض ایک خواب ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔خیر، اگر وہ خواب ہے تو بھی ایسا خواب ہے جس کو حقیقی طور پر دیکھا جاتا ہے اور یہ امر واقعہ بالکل یقینی رہتا ہے کہ اس کا تجربہ کرتا ہوں۔اس خواب کو دیکھتا ہوں۔ پہلے پہل سولہ سال کی عمر میں مجھے یہ طرز فکر سوجھا اور بعد میں مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ڈیکارٹ نے اس کو اپنے فلسفے کی اساس بنایا تھا۔

کیمبرج یونیورسٹی میں زمانہ طالب علمی کے دوران فلسفے میں میری دلچسپی کو ایک اور بھی محرک ملا۔جس تشکیک پسندی نے مجھے ریاضی پر شک کرنے پر اکسایا تھا، اسی نے مجھے مذہب کے بنیادی عقائد پر انگلی اٹھانے کی ترغیب بھی دی۔تاہم میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی راہ تلاش کرلی جائے جس کے ذریعے کم از کم ایسی شے کو بچایا جاسکے جس کو مذہبی ایمان کہا جاتا ہے۔پندرہ سے اٹھارہ برس کی عمر کے دوران میں نے بہت سا وقت مذہبی ایمان پر غور وفکر میں صرف کیا۔میں نے بنیادی عقیدوں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیا۔خلوص دل سے مجھے امید تھی کہ میں ان کو قبول کرنے کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈلوں گا۔میں نے اپنے خیالات ایک نوٹ بک میں درج کرتا رہا جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔بلاشبہ وہ خیالات ناپختہ اور نوجوانی کی خصوصیات کے حامل تھے لیکن ان کی پیش کردہ لاادریت کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

کیمبرج میں مجھے ان پورے فکری نظاموں کی تعلیم دی گئی جن سے میں بے خبر چلا آرہا تھا، چنانچہ میں نے وقتی طور پر وہ خیالات تیاگ دیئے جن پر میں تنہائی میں غور وفکر کرتا رہا تھا۔کیمبرج میں مجھے ہیگل کے فلسفے سے متعارف کروایا گیا جو نیس نہایت ہی مشکل کتابوں میں ایسا فکری نظام پیش کرنے کا مدعی تھا جو روایتی عقیدوں کے شائستہ، تصیح شدہ متبادل کے طور پر کام دے سکے۔

ہیگل کے نزدیک یہ ساری کائنات ایک وحدت ہے اور اس میں تمام اشیاء بہت ہی قریبی طور پر ایک دوسرے سے منضبط ہیں۔ گویا کائنات برتن میں رکھی ہوئی جیلی کی طرح ہے۔ آپ اس کے کسی حصے کو چھیڑیں تو وہ ساری کی ساری تھرتھرانے لگتی ہے۔ ایک اور پہلو سے دیکھیں تو کائنات جیلی سے بالکل مختلف شے ہے۔ وہ یوں ہے کہ آپ جیلی کو ٹکڑوں میں کاٹ سکتے ہیں لیکن کائنات ہیگل کے نزدیک ایک ایسی وحدت ہے جس کے حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے۔ ہیگل کہتا ہے کہ جو حصے بخرے ہم کو نظر آتے ہیں، وہ محض فریب نظر ہیں۔ واحد حقیقت بس مطلق ہی ہے۔ مطلق سے اس کی مراد خدا ہے۔

ایک زمانے میں مجھے اس فلسفے میں تسکین ملی۔ مجھے یہ فلسفہ ہیگل کے پیروکاروں سے اور خصوصاً میک ٹیگرٹ سے پڑھنے کا موقع ملا۔ جو ان دنوں میرا قریبی دوست تھا۔ ان صاحبان نے مجھے اس فلسفے سے یوں متعارف کروایا کہ وہ مجھے دلکش اور قابل ثبوت محسوس ہونے لگا۔ میک ٹیگرٹ مجھ سے تقریباً چھ سال بڑا فلسفی تھا۔ اور زندگی بھر وہ ہیگل کا پر جوش شاگرد رہا تھا۔ اس نے اپنے معاصرین پر خاص اثر ڈالا تھا اور کچھ عرصہ میں بھی اس کے سحر میں مبتلا رہا۔ ہیگل کے فلسفے کے زیر اثر اپنے آپ کو یہ یقین دلانے میں ایک انوکھی مسرت پنہاں تھی کہ زمان و مکان غیر حقیقی ہیں۔ مادہ محض التباس ہے اور یہ کہ دنیا میں سوائے ذہن کے اور کچھ بھی نہیں۔ پھر بے دھڑکی کا ایک ایسا لمحہ آیا کہ میں نے چیلوں کو چھوڑ کر خود گورو سے رجوع کر لیا۔ جب میں نے ہیگل کی کتابیں پڑھیں تو ان میں مجھے پریشان خیالی اور الجھاؤ ے نیز ابہام اور ذومعنویت کے ملغوبے کے سوا کچھ نہ ملا۔

کچھ عرصے کے لیے مجھے ایک ایسے نظریئے سے تسکین ملی جو کسی قدر و ترمیم کے ساتھ افلاطون سے اخذ کیا گیا تھا۔ افلاطون کے مطابق تصورات کی ایک غیر مبدل ابدی دنیا ہے۔ ہمارے حواس اس کی ناقص نقل ہمیں پیش کرتے ہیں۔ اس نظریئے کے مطابق ریاضی کا تعلق تصورات کی دنیا سے ہے، لہٰذا اس میں ایسی صراحت اور کمال پایا جاتا ہے جو روزمرہ کی دنیا میں نہیں ملتا۔ افلاطون نے اس قسم کی ریاضیاتی سریت فیثاغورث ہی سے مستعار لی تھی۔ اس نے مجھے متاثر کیا، لیکن آخر کار میں نے اس نظریئے کو بھی ترک کر دیا۔ اس کے بعد مجھے کسی ایسے فلسفیانہ نظریئے سے مذہبی تسکین نصیب نہیں ہوئی جس کو میں قبول کر سکتا۔

❁

اُستاد کے فرائض

اکثر دوسرے پیشوں کے مقابلے میں تدریس کا کام گزشتہ ایک صدی کے دوران بہت بدل گیا ہے۔ پہلے وہ ایک دوسرے تربیت یافتہ پیشہ تھا جس کا تعلق آبادی کے صرف ایک چھوٹے سے حصہ سے تھا۔ اب وہ عوامی خدمت کا ایک بڑا اور اہم پیشہ بن گیا ہے۔ اس پیشے کی ایک عظیم اور واجب الاحترام روایت ہے جو تاریخ کے آغاز سے شروع ہو کر حالیہ زمانوں تک قائم رہی، لیکن آج کی دنیا میں کوئی استاد اپنے پیش رووں سے تخلیقی تحریک حاصل کرے اور ان کے نقش قدم پر چلنا چاہے تو غالباً فوراً ہی اس کو باور کروادیا جائے گا کہ اس کا کام یہ نہیں کہ وہ اپنے خیالات کی تعلیم دے، بلکہ اس کا کام ان عقائد اور تعصبات کو ذہنوں میں ٹھونسنا ہے جن کو اس کو ملازم رکھنے والے مفید خیال کرتے ہیں۔ ماضی میں استاد کے بارے میں یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ غیر معمولی علم یا دانش کا حامل ہوگا جس کی باتیں سننے سے فائدہ پہنچے گا۔ زمانہ قدیم میں درس وتدریس کا کام منظم پیشہ نہ تھا۔ اساتذہ کی تدریس کو کنٹرول بھی نہیں کیا جاتا تھا۔

خیر، یہ بھی سچ ہے کئی بار اساتذہ کو ان کے باغیانہ خیالات کی وجہ سے بعد میں سزا بھی بھگتنا پڑتی تھی۔ سقراط کی مثال اس سلسلے میں بہت نمایاں ہے۔ اس غریب کو موت کی سزا دی گئی تھی۔ افلاطون کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ اس کو پس دیوار زنداں پھینک دیا گیا تھا۔

تاہم اس قسم کے واقعات ان لوگوں کے خیالات کی اشاعت میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔ حقیقی استاد اپنے گوشت پوست کے وجود کی صورت میں زندہ جاوید رہنے کے بجائے اپنی کتابوں کے ذریعے زندہ رہنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ استاد کے فرائض کی مناسب ادائیگی کے لیے ذہنی آزادی کا احساس لازم ہے، کیونکہ اس کا کام یہ ہے کہ رائے عامہ کی تشکیل کے عمل میں وہ ممکنہ حد تک علم اور معقولیت کو داخل کر دے۔ قدیم زمانے میں وہ یہ فرض آزادی سے ادا کرتا تھا۔ بس

کبھی کبھار ظالم اور مطلق العنان حاکم یا فسادی ہجوم اس کے کام میں غیر موثر رکاوٹ ڈال دیا کرتے تھے۔

قرون وسطیٰ میں درس وتدریس کے کام پر اہل مذہب نے قبضہ جمالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذہنی یا سماجی ترقی کا عمل رک گیا۔ یورپ کی بیداری کی صدیوں میں علم و دانش کی قدر کی جانے لگی۔ یوں استاد کو ازسرنو بڑی حد تک آزادی حاصل ہوگئی۔ یہ سچ ہے کہ مذہبی احتساب کی عدالتوں نے گلیلیو کو توبہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور برونو کو زندہ جلا دیا تھا، مگر یہ دونوں صاحبان سزا پانے سے پہلے اپنا اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ یونیورسٹیوں جیسے ادارے عقیدہ پرستوں کی گرفت میں رہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہترین ذہنی کام کا زیادہ حصہ ان عالموں فاضلوں نے کیا جن کا تعلق اس قسم کے اداروں سے نہ تھا۔ چنانچہ خاص طور پر انگلستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ نیوٹن کے سوا شاید ہی کسی اول درجے کے عالم کا تعلق، انیسویں صدی کے خاتمے کے قریب تک، یونیورسٹیوں سے رہا تھا، لیکن سماجی نظام ایسا تھا کہ اس کی وجہ سے نہ تو ان کی سرگرمیاں متاثر ہوئیں اور نہ ہی ان کی افادیت کم ہوئی۔

ہماری آج کی دنیا میں بہت زیادہ منظم ہے۔ اس میں ہم کو ایک نیا مسئلہ درپیش ہے۔ تعلیم کے نام سے کوئی شے سب کو مہیا کی جارہی ہے۔ عام طور پر یہ ذمہ داری ریاست نے سنبھال رکھی ہے۔ چرچ بھی یہ کام کر رہا ہے۔ یوں اکثر صورتوں میں استاد ایک سرکاری ملازم بن کر رہ گیا ہے۔ وہ ان لوگوں کے احکامات کی تعمیل کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے جو نہ تو اس جیسا علم رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کو بچوں اور نوجوانوں سے نمٹنے کا کوئی تجربہ ہے۔ تعلیم کے بارے میں ان کا کوئی رویہ ہے تو بس پروپیگنڈہ کار جیسا ہے۔ ان حالات میں یہ دیکھنا آسان نہیں ہے کہ اساتذہ کیسے اپنے مخصوص فرائض ادا کر سکتے ہیں۔

ریاستی تعلیم واضح طور پر ضروری ہے۔ تاہم واضح طور پر اس میں کئی خطرات بھی مضمر ہیں جن سے بچاؤ کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ ریاستی تعلیم میں پوشیدہ خطرات نازی، جرمنی میں پوری طرح سامنے آگئے تھے۔ بعد میں وہ روس میں بھی دیکھے جاسکتے تھے، جہاں کہیں اس قسم کی خرابیاں موجود ہیں، وہاں کوئی شخص صاحبان اقتدار کی طرف سے ٹھونسا جانے والا ایسا متعصبانہ نظریہ قبول کیے بغیر درس وتدریس کا کام نہیں کرسکتا جس کو آزاد ذہن رکھنے والے اصحاف۔ جنہ اگر [illegible] ہی خوش دل

سے قبول کرنے پر آمادہ ہوں گے۔نظریاتی اور آمرانہ ملکوں میں استاد کو نہ صرف ''قومی نظریہ'' قبول کرنا پڑتا ہے بلکہ اس کو حالات حاضرہ پر اپنی زبان بھی بند رکھنی پڑتی ہے۔ جب تک استاد حروف تہجی اور حساب کے پہاڑے پڑھاتا رہے تب تک کوئی اختلافی نکتہ سامنے نہیں آتا اور سرکاری عقیدہ اس کے کام میں دخل انداز نہیں ہوتا۔ تاہم نظریاتی اور آمرانہ نظاموں کے حامل ملکوں میں اس سطح پر بھی استاد سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ تدریس کے ان طریقوں سے کام نہ لے گا جن کو وہ بہترین سمجھتا ہے۔اسکے بجائے وہ بچوں کو اپنی اتھارٹی کی بلا چون و چرا فرمانبرداری پر مجبور کر کے ان کے دلوں میں خوف اور اندھی اطاعت کے جذبے پیدا کرے گا۔تعلیم کی ابتدائی سطح سے بلند ہوتے ہی استاد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تمام اختلافی مسائل پر ذاتی رائے دینے کے بجائے سرکاری نقطہ نظر کی وکالت کرے گا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان تنگ نظر بنیاد پرست بن جاتے ہیں ۔ان کے ذہن بند ہو جاتے ہیں ۔ وہ حقائق کا ادراک کرنے اور دوسروں کا نقطہ نظر سمجھنے کے اہل نہیں رہتے اپنے معاشرے اور ملک سے باہر کی دنیا کی ان کو کوئی خبر نہیں ہوتی ۔ آزادانہ بحث کی خوبی سے وہ بالکل محروم ہوتے ہیں اور یہ بات ان کے گمان میں بھی نہیں آتی کہ کوئی شخص خلوص دل سے ان کی آراء پر تنقید کر سکتا ہے۔ان تنگ نظر اور محدود فکر رکھنے والے نوجوانوں کو تعلیم ہی یہ دی جاتی ہے کہ جو کوئی شخص ان کے سرکاری نظریئے پر انگلی اٹھاتا ہے وہ ملک اور قوم کا دشمن ہے اور ملک و قوم کو نقصان پہنچانے کی سازش کر رہا ہے۔اگر ذہنوں میں ٹھونسے جانے والے عقیدے عالمگیر اور بین الاقوامی قسم کے ہوتے تو صورت حال اس قدر تباہ کن نہ ہوتی ۔مگر مصیبت یہ ہے کہ جدید عقیدہ پرست بین الاقوامی ثقافت کے تصور کے ہی دشمن ہیں ۔ وہ جرمنی میں ایک عقیدے کا پرچار کرتے ہیں تو اٹلی میں دوسرے کا۔ روس میں ان کا ایک نظریہ ہے تو جاپان میں دوسرا ہے۔ان تمام ملکوں میں نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے عمل میں متعصبانہ قوم پرستی پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔اب بھی صورت حال زیادہ مختلف نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دنیا کی ہر قوم اپنی اپنی قوم پرستی کا راگ الاپ رہی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ ایک ملک کے افراد کی دوسرے ملک کے افراد کے ساتھ کوئی قدر مشترک نہیں رہی ۔مشترکہ تہذیب کا کوئی تصور جنگجویانہ وحشت کی راہ میں حائل نہیں رہا۔

ثقافتی بین الاقوامیت کا زوال پہلی جنگ عظیم کے بعد سے مسلسل تیز ہوتا رہا ہے۔ میں

۱۹۲۰ میں لنین گراڈ میں تھا۔ وہاں میری ملاقات نظری ریاضی کے ایک پروفیسر سے ہوئی۔ وہ متعدد بین الاقوامی انجمنوں کا رکن رہا تھا۔ اس حوالے سے وہ لندن اور پیرس سمیت کئی دارلحکومتوں سے خوب شناسا تھا۔ اشتراکی انقلاب کے بعد صورت حال بدل گئی۔ حکمرانوں کو ڈر تھا کہ اگر پڑھے لکھے لوگ دوسرے ملکوں کو جائیں گے تو وہ وہاں کے حالات کا مقابلہ اپنے ملک کے حالات سے کرنے لگیں گے۔ چنانچہ انہوں نے روسی دانش وروں کے بیرونی دوروں کی حوصلہ شکنی شروع کر دی۔ دوسرے ملکوں کے تعلیمی حلقوں میں قوم پرستی کا اس قدر زور نہیں ہے۔ تاہم سچی بات یہ ہے کہ ہر جگہ یہ جذبہ پہلے کی نسبت زیادہ قوی ہو گیا ہے۔ انگلستان میں رجحان یہ ہے کہ (شاید امریکہ میں بھی صورت حال یہی ہے) فرانسیسی اور جرمن زبانیں پڑھانے کے لیے فرانسیسی اور جرمن اساتذہ کی خدمات حاصل کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ گویا استاد کے طور پر تقرری کے لیے قابلیت کے بجائے قومیت کو اولیت دی جاتی ہے۔ یہ رجحان نہ صرف تعلیم کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ بین الاقوامی کلچر کے آدرش کے بھی منافی ہے۔ یہ کلچر سلطنت رومہ اور کیتھولک چرچ کا ورثہ تھا، مگر اب وہ ایک نئی بربریت کے حملے تلے دب رہا ہے۔

یہ ماننے والی بات ہے کہ جمہوری ملکوں میں خرابیوں میں اس قدر شدت پیدا نہیں ہوتی جتنی کہ آمرانہ نظام والے ملکوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ تاہم ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ان ملکوں کے تعلیمی نظاموں میں ویسی ہی تبدیلیاں رونما ہونے کا شدید خطرہ موجود ہے۔ اس خطرے کو دفع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آزادی فکر میں یقین رکھنے والے لوگ اساتذہ کو ذہنی غلامی سے محفوظ رکھنے کے لیے ہوشیار رہیں۔ اس سلسلے کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ہم معاشرے میں اساتذہ کی متوقع خدمات کا واضح تصور رکھیں۔

میں دنیا کی حکومتوں کے اس موقف سے اتفاق کرتا ہوں کہ استاد کا ایک اہم فریضہ معین غیر اختلافی معلومات کی تدریس ہے۔ اصل میں یہ معلومات بنیاد کا کام دیتی ہیں۔ ہمارے جیسی تکنیکی تہذیب میں بلاشبہ اس کی بہت افادیت بھی ہے۔ جدید معاشرے میں ایک ایسے طبقے کی موجودگی لازم ہے جو اس میکانکی نظام کو چالو رکھنے کے لیے درکار تکنیکی مہارت کا حامل ہو جس پر ہماری مادی آسائشوں کا دارومدار ہے۔ علاوہ ازیں اگر آبادی کا بڑا حصہ ناخواندہ ہو تو یہ تکلیف دہ بات ہوتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہم سب عالمگیر لازمی تعلیم کے حق میں ہیں۔ تاہم حکومتوں نے یہ بھانپ لیا

ہے کہ نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کے دوران اختلافی امور پر عقیدوں کو ذہنوں میں ٹھونسنا اور حکمرانوں کے لیے اچھی یا بُری ذہنی عادتیں پیدا کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔

تمام مہذب ملکوں میں ریاست کا دفاع اساتذہ کے ہاتھوں میں اسی قدر رہتا ہے جس قدر کہ مسلح افواج کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ آمرانہ نظاموں والے ملکوں کے سوا، باقی ملکوں کا دفاع پسندیدہ امر ہے۔ لہٰذا اگر تعلیم کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ خرابی البتہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قدامت اور ظلم پسند قوتیں ریاست کا دفاع کرتی ہیں اور جب نامعقول جذبوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ کسی اچھی ریاست کے معاملے میں اس قسم کے ہتھکنڈے بالکل غیر ضروری ہوتے ہیں۔ پھر بھی ان لوگوں میں ان کو اختیار کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے جو تعلیم کا براہ راست علم نہیں رکھتے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اختلاف رائے اور آزادی کو دبانے سے قوتیں مضبوط ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر لوگ اتفاق رائے کو قومی اتحاد اور یکجہتی کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ یہ بات بار بار سننے میں آتی ہے کہ جنگ کے دوران جمہوریت کی وجہ سے ملک کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ جھوٹ ہے اور اس جھوٹ پر اس حقیقت کے باوجود مسلسل اصرار کیا جاتا ہے۔ کہ ۱۷۰۰ء کے بعد سے تمام اہم جنگوں میں جمہوری قوموں کو جیت حاصل ہوتی رہی ہے۔ تنگ نظر نظریاتی یکسانیت پر اصرار کرنے کی کوششوں نے اس سے زیادہ قوموں کو تباہ و برباد کیا ہے جتنی کہ فکر و نظر کی آزادی اور اختلاف رائے کو برداشت کرنے کے کلچر کی وجہ سے ہوئی ہیں، دنیا بھر کے عقیدہ پرستوں کا ایمان یہ رہا ہے کہ اگرچہ ان کے پاس سچائی ہے، لیکن لوگوں کو کسی مسئلہ پر دونوں جانب کے دلائل سننے کا موقع دیا گیا تو وہ گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ نقطہ نظر دو میں سے کسی ایک بدقسمتی کا سبب بنتا ہے۔ اول یہ کہ عقیدہ پرستوں کا کوئی ایک گروہ دنیا کو فتح کر لیتا ہے اور تمام نئے خیالات پر پابندی عائد کر دیتا ہے یا پھر عقیدہ پرستوں کے حریف گروہ مختلف علاقوں پر غالب آجاتے ہیں۔ تب وہ ایک دوسرے کے خلاف نفرتیں پھیلانے لگتے ہیں۔ یہ دوسری صورت حال اصل میں پہلی سے بھی زیادہ خراب ہے۔ ان دونوں میں سے پہلی خرابی قرون وسطیٰ میں پائی جاتی تھی۔ دوسری مذہبی جنگوں کے زمانے میں عام تھی اور اب ہمارے زمانے میں بھی اس کا چلن ہے۔ پہلی خرابی تہذیب کو جامد و ساکن کر دیتی ہے اور اس کی ترقی کا عمل روک دیتی ہے جب کہ دوسری خرابی تہذیب کو بالکل ہی برباد کر

دینے پر تلی رہتی ہے۔ استاد کا کام یہ ہے کہ وہ ان دونوں خرابیوں کے خلاف انسانیت کی نگہبانی کرے۔

یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ منظم جماعتی روح ہمارے زمانے کے بڑے خطروں میں سے ایک ہے۔ قوم پرستی کی صورت میں یہ روح مختلف اقوام کے درمیان جنگ وجدل کا موجب بنتی ہے، جب کہ دوسری صورتوں میں وہ خانہ جنگی کی طرف لے جاتی ہے۔ اساتذہ کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ جماعتوں کے باہمی جھگڑوں سے دور رہیں اور نوجوانوں میں غیر جانب دار اور بے لاگ تحقیق کی عادت میں پیدا کریں۔ اس طرح نوجوان مسائل کو خود ان کی اپنی خوبیوں اور خامیوں کی بنیاد پر جانچنے اور یک طرفہ عقیدوں اور فیصلوں کو رد کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ استاد سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ عوام یا حکام کے تعصابات کی کاسہ لیسی کرے گا اور ان کو پھیلانے کا سبب بنے گا۔ اس کی پیشہ ورانہ خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر بے لاگ سائنسی تحقیق سے کام لے گا اور ہر قیمت پر سچائی اور انصاف کا ساتھ دے گا۔ اگر استاد کی تحقیق کے نتائج بعض لوگوں کے لیے ناگوار ہوں تو اس کو مخالفین کی خفگی سے بچایا جانا چاہیے۔

خیر، یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ استاد کا کام محض موجودہ تنازعوں اور جھگڑوں کی حدت کو کم کرنا ہے۔ کئی مثبت کام بھی اس کے ذمے ہیں اور ان کے کاموں کو کرنے کی خواہش سے متحرک ہوئے بغیر وہ ایک عظیم استاد نہیں بن سکتا۔ بات یہ ہے کہ دوسرے تمام طبقوں کے مقابلے میں اساتذہ تہذیب کے زیادہ بڑے محافظ ہیں، لہٰذا ان کو خوب اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ تہذیب کیا ہے اور ان کو اپنے شاگردوں میں مہذب رویہ پیدا کرنے کی تڑپ ہونی چاہیے۔ یہ نکتہ ہم کو اس سوال کی طرف لے آتا ہے کہ وہ کون سی شے ہے جو مہذب سماج کی تشکیل کرتی ہے؟

عام طور پر مادی امور کی طرف اشارہ کر کے اس سوال کا جواب دے دیا جاتا ہے، چنانچہ اگر کسی ملک کے پاس ڈھیر ساری مشینیں ہیں، بہت سی موٹر کاریں ہیں، بہت سے باتھ روم ہیں اور نقل وحرکت کا تیز رفتار اور جدید طرز کا نظام ہے تو پھر اس پر مہذب ہونے کی پرچی چسپاں کر دی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید لوگ ان اشیاء کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں تاہم اہم مفہوم میں تہذیب زندگی کے طبعی پہلو سے تعلق رکھنے والی مادی اشیاء کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ذہنی نوعیت کی حامل ہے۔ جزوی طور پر وہ علم کا معاملہ ہے اور جزوی طور پر جذبے کا۔ جہاں تک علم کا

تعلق ہے، فرد کو اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش کے ماحول کی تفصیلات بے حد باخبر ہونا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ملک کو محض اپنے محبوب وطن کے طور پر نہ دیکھے بلکہ یہ بات ذہن میں رکھے کہ اس کا ملک دنیا کے بہت سے ملکوں میں سے ایک ہے اور یہ کہ سب کو زندہ رہنے، سوچنے اور محسوس کرنے کا یکساں حق حاصل ہے۔ اس کو یہ بھی خبر ہونی چاہیے کہ جس طرح اس کو ماضی کے مناقشے اور جھگڑے عجیب و غریب لگتے ہیں، اسی طرح آج کے مناقشے اور جھگڑے مستقبل کی نسلوں کو بے تکے محسوس ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے زمانے کو ماضی اور مستقبل کے حوالے سے دیکھ سکے۔ وسیع تر حوالے سے دیکھا جائے تو اس کو ریاضیاتی ادوار اور فلکیاتی گہرائیوں کی وسعتوں کا علم ہونا چاہیے۔ مگر یہ سارا علم اس کے لیے انفرادی انسانی روح کو کچلنے والا بوجھ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس عظیم الشان منظر نامے کی حیثیت سے ہونا چاہیے جو غور و فکر کرنے والے ذہن کو وسعت عطا کرتا ہے۔ جہاں تک جذبوں کا تعلق ہے، وہی شخص حقیقی معنوں میں مہذب قرار پائے گا جو خالص ذاتی سطح سے بلند ہو کر اپنے آپ میں جذباتی وسعتیں پیدا کر سکے گا۔ انسان ولادت سے موت تک کا سفر کبھی ہنستے کھیلتے، کبھی روتے روتے، کبھی فراخدلی سے اور کبھی تنگ دلی سے، کبھی بہادردی سے اور کبھی بزدلی سے کانپتے کانپتے طے کرتے ہیں، زندگی کے کھیل کا مجموعی طور پر جائزہ لینے والے کو دکھائی دیتا ہے کہ اس میں بعض چیزیں قابل تعریف ہیں، بعض افراد انسانیت کی محبت سے مغلوب رہے ہیں اور بعض نے اعلیٰ ترین عقل سے متاثر ہو کر ہم کو اس دنیا کا فہم حاصل کرنے میں مدد دی ہے، جس میں ہم رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض افراد نے غیر معمولی حساس پن کے ذریعے حسن کی تخلیق کی ہے۔ ان سب لوگوں نے ظلم و بربریت، تشدد اور توہم پرستی کے طویل ریکارڈ کے مقابلے میں نیکی اور اچھائی کا پلہ بھاری کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مثبت شے تخلیق کی ہے۔ ان سب لوگوں نے انسانی زندگی کو اجڈ وحشیوں کی ہنگامہ آرائی سے بہتر کوئی شے بنانے کی خاطر اپنی اپنی حد تک بہترین کوششیں کی ہیں۔ مہذب انسان جب تعریف نہیں کر سکتا تو وہ چیزوں پر لعنت بھیجنے کے بجائے ان کو سمجھنے کی تگ و دو کرتا ہے۔ وہ اپنے زیر سایہ انسانوں سے نفرت کرنے کے بجائے ان کی برائی کے غیر شخصی اسباب کو سمجھنے اور ان کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ساری باتیں استاد کے ذہن و قلب میں ہونی چاہئیں اور اگر وہ اس کے ذہن و قلب میں ہوں گی تو وہ اپنے شاگردوں تک بھی ان کو پہنچائے گا۔

کوئی شخص اس وقت تک اچھا استاد نہیں بن سکتا جب تک اس کے دل میں شاگردوں کے لئے گرم جوشی کے جذبات نہ ہوں اور جب تک وہ شاگردوں کو ان ساری باتوں کا درس دینے کی سچی خواہش محسوس نہ کرتا ہو جن کو قابل فخر سمجھتا ہے۔ مبلغین کا یہ رویہ نہیں ہوتا۔ مبلغ اپنے شاگردوں کو کسی فوج کے امکانی سپاہی خیال کرتے ہیں۔ وہ شاگردوں کو کسی خارجی مقصد کے لیے تیار کر رہے ہوتے ہیں۔ مبلغ کبھی بھی یہ نہیں چاہتے کہ ان کے شاگرد دنیا کا کھلی آنکھوں سے جائزہ لیں اور پھر اپنے لیے کوئی ایسا مقصد حیات منتخب کریں جو واقعی قابل قدر ہو۔ اس کے بجائے وہ شاگردوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ مبلغ کے طے کئے ہوئے مقصد کو اپنی منزل مقصود بنا لے۔ وہ شاگرد میں غور و فکر کی عادت پیدا نہیں کرتے۔ اس کو خود فیصلہ کرنے کا موقع نہیں دیتے بلکہ اس کی شخصیت کو مسخ کر کے اپنے ڈھب پر لے آتے ہیں۔ اپنے ڈھب پر لانے کی جدوجہد میں وہ شاگرد کی فطری نشو و نما کو روک دیتے ہیں۔ اس کی اچھائیوں اور خوبیوں کو تلف کر کے اس میں حسد، غصہ، بربریت اور تباہ و برباد کرنے کی خواہش بھر دیتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر انسانوں کی پال پوس اور تربیت اچھے طریقے سے ہو اور وہ مبلغین کے ہاتھ نہ چڑھ جائیں تو پھر ظلم و بربریت کی طرف ان کے مائل ہونے کا کوئی سبب نہیں۔

دنیا کی موجودہ حالت کو دیکھ کر صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں تشدد اور ایذا رسانی کے جذبوں کی خوب فراوانی ہے، مگر یاد رکھیے کہ اس قسم کے منفی جذبات انسانی فطرت کا ناگزیر حصہ نہیں ہیں۔ اس کے برخلاف میرا خیال یہ ہے کہ جذبے کسی نہ کسی ناخوشی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ بات استاد کے فرائض میں شامل ہونا چاہیے کہ وہ شاگردوں کو مسرت انگیز اور بامقصد بنائیں گے تو ان کی دوسروں کے ساتھ محبت اور مہربانی سے پیش آنے کی خواہشیں متحرک ہوں گی اور وہ دوسرے لوگوں کو ان مسرتوں سے محروم نہ کرنا چاہیں گے جن سے وہ خود محروم رہے تھے۔ بہت سے لوگ مسرت کے حصول کو مقصد قرار دینے کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ اس تصور کو اپنے لیے اچھا سمجھتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کے لیے مناسب خیال کرتے ہیں۔ تاہم یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا رویہ ''انگور کھٹے ہیں'' والا معاملہ ہے۔ کسی اجتماعی مقصد کی خاطر ذاتی مسرت کو قربان کر دینا ایک بات ہے، لیکن عمومی مسرت کو ہی غیر اہم قرار دے دینا بالکل مختلف بات ہے۔ اس کے باوجود کسی مفروضہ اولوالعزمی اور جانبازی کے نام پر اکثر ایسا کیا جاتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کا رویہ اختیار کرتے

ہیں، ان میں عموماً بے رحمی اور سفاکی کی خصوصیات پائی جاتی ہے۔اس کی بنیاد لاشعوری حسد پر ہوتی ہے اور خود اس حسد کی جڑیں بچپن یا عنفوان شباب کے ایام میں ہوتی ہیں ۔استاد کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ بالغ افراد کو اس قسم کی نفسیاتی بدقسمتیوں سے نجات پانے کی تربیت دے اور ان کو سکھلائے کہ ان کو دوسرے لوگوں کو مسرتوں سے محروم کرنے کا آرزومند نہیں رہنا چاہیے کیونکہ وہ خود ان سے محروم نہیں کئے گئے ہیں۔

موجودہ حالات میں بہت سے اساتذہ اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے ہیں۔اس ناکامی کے اسباب بہت سے ہیں۔ان اسباب میں سے بعض کم وبیش اتفاقی ہیں ۔جب کہ بعض دیگر اسباب کی جڑیں گہری ہیں۔مثال کے طور پر پہلی قسم کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ اکثر اساتذہ پر کام کا بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے، وہ اپنے شاگردوں کی لبرل ذہنی تربیت کرنے کے بجائے ان کو امتحانوں کی تیاری کروانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جو لوگ تدریس کے کام کے عادی نہیں ہیں ۔۔۔عملی طور پر اس صف میں تمام تعلیمی حکام شامل ہیں۔۔۔وہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ اس معاملے میں کس قدر محنت کرنی پڑتی ہے۔واعظین سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ روزانہ کئی کئی گھنٹوں تک وعظ دیں گے، مگر اساتذہ یہی کام کرتے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ اکثر اساتذہ پریشان اور مضطرب رہتے ہیں، ان کے مضمون میں ہونے والے تازہ ترین کام سے ان کا رابطہ نہیں رہتا اور وہ اپنے طلبہ کو نئے فہم اور نئے علم سے حاصل ہونے والی خوشی مہیا نہیں کر سکتے۔

بہرحال یہ سب سے گھمبیر مسئلہ نہیں ہے۔اکثر ملکوں میں بعض آراء کو درست قرار دیا جاتا ہے اور بعض کو خطرناک ٹھہرایا جاتا ہے۔جن اساتذہ کی آراء معاشرے اور حکمرانوں کی آراء سے مختلف ہوتی ہیں وہ ان کے بارے میں زبان بند رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں اگر وہ اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں تو اس کو پراپیگنڈہ قرار دیا جاتا ہے، جب کہ درست سمجھی جانے والی آراء کے چرچے کو اچھی درس وتدریس کا درجہ ملتا ہے۔اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ متجسس نوجوانوں کو کلاس روم میں تسکین نہیں ملتی۔ان کو اکثر اوقات یہ جاننے کے لیے درسی کتابوں اور کلاس روم سے باہر جانا پڑتا ہے کہ ان کے زمانے کے عظیم ذہن کیا کچھ سوچ رہے ہیں۔امریکہ میں سوکس کے نام سے ایک مضمون پڑھایا جاتا ہے اور آپ یقین کیجیئے کہ دوسرے تمام مضامین کے مقابلے میں اس مضمون میں زیادہ مبالغہ آمیز اور گمراہ کن چیزیں پڑھائی جاتی ہیں۔نوجوان طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ

عوامی معاملات کیسے نمٹائے جاتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں تمام سچائیاں چھپالی جاتی ہیں۔ پھر جب وہ بڑے ہو کر سچائی کو دریافت کرتے ہیں تو ان کو شدید جذباتی دھچکا پہنچتا ہے۔ وہ قومی اور اجتماعی آدرشوں سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے اگر نوجوانوں کو سچ سچ سب کچھ بتا دیا جاتا تو پھر ان کو ملکی نظام کی خرابیوں کا اندازہ ہو جاتا۔ ممکن ہے کہ وقت آنے پر وہ خرابیوں کو دور کرنے کی تگ ودو کرتے۔

تعلیمی پالیسیاں اور منصوبے بنانے والوں کا ایک گناہ یہ ہے کہ وہ دوسروں اور خاص طور پر نوجوانوں کی اخلاقی اصلاح وتربیت کے لیے انہیں ضروری سمجھتے ہیں۔ میرا نقطہ نظر اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص اس وقت تک اچھا استاد نہیں بن سکتا۔ جب تک وہ اپنے آپ سے یہ وعدہ نہ کرے کہ وہ تدریس کے دوران کبھی بھی سچ پر پردہ نہیں ڈالے گا۔ اس کو دوسروں سے نہیں چھپائے گا۔ نہایت احتیاط سے بنائی جانے والی جہالت بھی کمزور ہوا کرتی ہے اور سچائی کا سامنا کرتے ہی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔

اس دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جو تعریف وتوصیف کے مستحق ہیں۔ نوجوانوں کو یہ سکھانا اچھی بات ہے کہ یہ لوگ کس طرح قابل تعریف ہیں۔ ان کی خوبیاں اور کارنامے کون کون سے ہیں جنہوں نے ان کو عظمت عطا کی ہے، مگر یہ بالکل اچھی بات نہیں ہے کہ ہم لفنگوں اور بدمعاشوں کے مکروفریب پر پردہ ڈال کر ان کے گن گانے کی تربیت دینے لگیں۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ حالات و حقائق کے علم سے قنوطیت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ وہ تعجب کے صدمے کے ساتھ ناگہانی انداز میں حاصل ہو لیکن اگر علم سچائی تک رسائی حاصل کرنے کی خواہش کے زیر اثر ہونے والے سائنسی مطالعے کے دوران بتدریج حاصل ہو اور اس میں حالات وواقعات کے اچھے پہلوؤں کا علم بھی شامل کیا جاتا رہے تو پھر وہ قنوطیت کا سبب نہیں بنے گا۔ بہر طور سیدھی سی بات یہ ہے کہ تصدیق کرنے کے وسائل سے محروم نوجوانوں کو جھوٹ اور فریب کی تعلیم دینے کا کوئی اخلاقی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔

جمہوریت کی بقا اور ترقی کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ استاد نوجوانوں میں اس قسم کی رواداری اور برداشت کا مادہ پیدا کرنے کی کوشش کرے جو مختلف قسم کے لوگوں کو سمجھنے کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔ انسان اپنے طور پر طریقوں اور رواجوں کے عادی ہو جاتے ہیں اور ان کو مثالی سمجھ

لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مختلف قسم کے طور طریقے اور رواج دیکھتے ہیں تو ان سے نفرت کرتے ہیں اور ان کو گھٹیا خیال کرتے ہیں۔ غالباً یہ ردعمل انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ چیونٹیوں اور درندوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ کوئی مختلف وجود ہتھے چڑھ جائے تو اس کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں نے جسمانی یا ذہنی طور پر کبھی سفر نہیں کیا ہوتا، وہ اپنے عقیدوں اور رسموں کے غلام ہوتے ہیں۔ تو جب کبھی ان کو اپنے سے مختلف عقیدوں اور طور طریقوں سے پالا پڑتا ہے تو ان کو برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ ان کو فوراً ہی گھٹیا، احمقانہ، کافرانہ اور ناقابل برداشت قرار دے دیتے ہیں۔ اس قسم کی جاہلانہ عدم برداشت مہذب فکر و نظر کے بالکل برعکس ہے اور اس کو ہماری پر ہجوم دنیا کو درپیش شدید ترین خطرات میں ایک سمجھنا چاہیے۔ تعلیمی نظام کا ایک اہم مقصد اس رویے کی اصلاح ہونا چاہیے مگر فی زمانہ اس پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ ہر ملک میں قوم پرست جذبوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور سکول کے بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ ان کا ملک دنیا کا بہترین ملک ہے اور یہ کہ دنیا بھر کے ملکوں کے باشندے اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے ان کے اپنے ملک کے شہریوں کے مقابلے میں کمتر اور گھٹیا ہیں۔ اجتماعی ہسٹریا تمام انسانی جذبوں سے زیادہ سفاک اور جنون خیز ہے۔ اس ہسٹریا سے نجات پانے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ بچوں کو بار بار سنی جانے والی باتوں پر یقین کرنے پر اکسایا جاتا ہے۔ ان کو یہ درس نہیں دیا جاتا کہ ہم کو صرف ان باتوں کو قبول کرنا چاہیے جن کی کوئی عقلی بنیاد ہو یا جن کا کوئی معقول ثبوت موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ ان ساری خرابیوں کی ذمہ داری اساتذہ پر عائد نہیں ہوتی۔ وہ نصاب خود منتخب کرنے کا اختیار نہیں رکھتے اور وہی کچھ پڑھانے پر مجبور ہیں جو صاحبان اقتدار چاہتے ہیں۔ پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ صرف اساتذہ ہی بچوں کی ضرورتوں اور تقاضوں سے بہترین طور پر آگاہ ہوتے ہیں۔ روزمرہ کے ربط و تعلق کے باعث وہی بچوں کی پرواہ کرتے ہیں، لیکن یہ طے کرنے کا اختیار ان کو نہیں دیا جاتا کہ بچوں کو کیا کچھ پڑھایا جائے یا یہ کہ درس و تدریس سے وابستہ افراد کو زیادہ اختیارات حاصل ہونے چاہیں۔ ان کو اپنے معاملات خود طے کرنے کے زیادہ مواقع ملنے چاہیں۔ ان کو حکام اور تنگ نظر مذہبی صاحبان کی دخل اندازی سے زیادہ محفوظ ہونا چاہیے۔

ہمارے زمانے میں کوئی بھی اس امر سے اتفاق نہ کرے گا کہ طبی عملے کو غیر طبی حکام کی نگرانی میں دے دیا جائے اور اس کو ان حکام کی مرضی کے مطابق اپنے پیشہ ورانہ فرائض سرانجام دینے کو

کہا جائے۔ظاہر ہے کہ یہ احمقانہ طرز عمل ہوگا۔اس کا جواز صرف اس وقت پیدا ہوسکتا ہے جب طبی افراد اپنے پیشہ ورانہ فرائض سے مجرمانہ غفلت برتنے لگیں۔ڈاکٹر کا کام مریض کا علاج کرنا ہوتا ہے۔استاد بھی ایک طرح کا ڈاکٹر ہے جس کا کام طفولیت کے مریضوں کا علاج کرنا ہوتا ہے۔اچھا،اب ڈاکٹر کو آپ آزادی دیتے ہیں کہ وہ مریض کا معائنہ کرے،اس کی بیماری اور اس کے اسباب کا تعین کرے اور پھر اپنے علم کے مطابق اس کا علاج شروع کردے۔لیکن استاد کو اس قسم کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔اس کو یہ اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر یہ طے کرے کہ بچوں کو کیا کچھ پڑھانا چاہیے اور کیسے پڑھانا چاہیے۔چند بڑی تاریخی قسم کی یونیورسٹیوں نے اپنی شہرت اور ساکھ کی بنیاد پر خودمختاری حاصل کر رکھی ہے لیکن تعلیمی اداروں کی بھاری اکثریت پر ان لوگوں کا کنٹرول ہے جن کو تعلیمی امور کا تجربہ نہیں۔گویا وہ ایسے مسائل حل کرتے ہیں اور ایسے معاملات طے کرتے ہیں جن کے بارے میں وہ علم رکھتے ہیں اور نہ ہی تجربہ۔ہماری دنیا بہت زیادہ منظم ہے اور مزید ہوتی چلی جارہی ہے۔اس قسم کی دنیا میں آمریت اور مطلق العنانیت کی راہ روکنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ عوامی خدمات سرانجام دینے والی جماعتوں کی خاص حد تک خودمختاری قائم رکھی جائے۔ان جماعتوں میں اساتذہ سرفہرست ہیں۔

فنکار،فلسفی اور ادیب کی طرح استاد بھی اس وقت اپنا کام تسلی بخش طریقے سے کرسکتا ہے۔جب اس کو آزادی کا ماحول دستیاب ہو اور جب وہ محسوس کرے کہ وہ کسی بیرونی اتھارٹی کی ہدایت پر عمل کرنے کی بجائے اپنی باطنی تخلیقی تحریک کی پیروی کررہا ہے۔تب وہ خود کو ایک خودمختار فرد تصور کرتا ہے اور داخلی خوشی اور اپنی ذات کی تکمیل کے لیے اپنے فرائض احسن طور پر ادا کرتا ہے۔آج کی دنیا میں فرد کے لیے گنجائش نکالنا دشوار ہے۔وہ کسی مطلق العنان مملکت میں ٹاپ پر ایک منتظم اعلیٰ کے طور پر وجود رکھ سکتا ہے،لیکن ذہن کی قلمرو مردوں اور عورتوں کے روزگار کو کنٹرول کرنے والی عظیم منظم قوتوں کی خودمختاری کو قائم رکھنا روز بروز دشوار ہوتا جارہا ہے۔دنیا نے اگر خود کو اپنے بہترین ذہنوں سے حاصل ہونے فوائد سے محروم نہیں کیا تو پھر اس کو تنظیم بندی کے باوجود ان ذہنوں کو گنجائش اور آزادی عطا کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ کار ڈھونڈنا ہی ہوگا۔اس کے لیے ضروری ہے کہ ارباب اختیار خود کو کسی حد تک لگام دیں اور شعوری طور پر اس امر کو تسلیم کرلیں کہ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں کہ گنجائش اور آزادی دینا ضروری ہوتا ہے۔

یورپ کی بیداری کے زمانے میں پوپ اس امر کو تسلیم کرتے تھے اور انہوں نے اپنے عہد کے فنکاروں کو کسی قدر آزادی دی بھی تھی۔ تاہم لگتا ہے کہ ہمارے عہد کے صاحبان اقتدار کو غیر معمولی جوہر قابل کے لیے اپنے دل میں احترام محسوس کرنے میں زیادہ دقت پیش آتی ہے۔ ہمارے عہد کا ہیجان اور اضطراب کلچر کے نفیس پھول کے لیے سازگار نہیں ہے۔ عام شہری خوف زدہ ہیں لہٰذا وہ ان آزادیوں کو برداشت کرنے میں آمادہ نہیں ہیں جن کی ان کو کوئی ضرورت دکھائی نہیں دیتی۔ شاید ہمیں زیادہ پرسکون زمانوں کا انتظار کرنا ہوگا۔ تب ہی تہذیب کے تقاضے ایک بار پھر پارٹی سپرٹ کے مطالبوں پر غالب آسکیں گے۔ دریں اثنا ضروری ہے کہ کم از کم چند لوگ تنظیم کے امکانات کی حدود کا احساس رکھتے رہیں۔ ہر نظام میں شگاف اور استثناء موجود رہنے چاہئیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ آخر کار انسان کی بہترین صلاحیتوں اور امکانات کو روند ڈالے گا۔



تاریخ کے بارے میں

دانشوروں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے جن علوم کے مطالعوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں ماضی کے مطالعہ سے زیادہ ناگزیر اور کوئی نہیں ہے۔اپنی پوزیشن کے شعور کے لیے یہ جاننا لازم ہے کہ دنیا کس طرح اس مقام تک پہنچی جہاں سے ہمارا انفرادی حافظہ شروع ہوتا ہے۔ مذاہب، ادارے اور قومیں کس طرح مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی صورت پذیر ہوئی ہے۔ ادوار گزشتہ کے عظیم افراد سے شناسائی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے عقیدوں اور رواجوں سے مختلف عقیدوں اور رواجوں کو جاننے کے لیے بھی تاریخ ہی ہماری مدد کرتی ہے۔تاریخ صرف تاریخ دانوں کے لیے قابل قدر رہوتی ہے اور نہ اس کی اہمیت محض مخطوطات اور دستاویزات کے مسلمہ طالب علم تک محدود ہوتی ہے، بلکہ تاریخ ان سب لوگوں کے لیے اہم ہوتی ہے جو انسانی زندگی کا فکری جائزہ لینے کے اہل ہوتے ہیں۔تاہم تاریخ کی اہمیت اس قدر گونا گوں ہے کہ جن کے دل اس کی بعض جہتوں کے گرویدہ ہو جاتے ہیں، وہ باقی سب کچھ بھول جانے کے خطرے سے دوچار رہتے ہیں۔

(1)

پہلی بات یہ ہے کہ تاریخ اس لیے قابل قدر ہے کہ وہ سچی ہے۔مانا کہ صرف سچائی تاریخ کی واحد خوبی نہیں، مگر یہ بنیاد ضرور ہے اور دیگر اقدار کی شرط بھی ہے۔یہ امر کم از کم اغلب دکھائی دیتا ہے کہ تمام علم کسی نہ کسی حد تک اچھا ہوتا ہے۔اب معاملہ یہ ہے کہ ہر تاریخی واقعہ کے علم میں کوئی اور قدر موجود نہ ہو، تب بھی اچھائی کا یہ عنصر اس میں ضرور شامل ہوتا ہے، لگتا ہے کہ جدید مورخین کے نزدیک صرف سچائی ہی تاریخ کی قدر ہے۔اس بنیاد پر وہ چاہتے ہیں کہ مورخ اپنی ذات کی مکمل نفی

کر دے اور صرف دستاویزات کو ہی اہمیت دے۔ ان کو خدشہ لاحق رہتا ہے کہ مورخ کی شخصیت کے درآنے سے سچائی کو پیچھے ہٹنا پڑے گا اور تاریخ میں فسانہ شامل ہو جائے گا، چنانچہ یہ صاحبان ہر شے کو معروضیت پر قربان کر دینا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو صرف معروضیت درکار ہے۔ ان مورخین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان کو صرف حقائق بیان کرنا چاہیں۔۔۔ اور ان حقائق کو کسی طور زبان مل جائے تو صرف ان کو بولنے کا موقع دینا چاہیے۔ اس موقف سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام حقائق یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ تاریخ رقم کرتے ہوئے اس نظریئے کی مکمل طور پر پابندی نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی یہ نظریہ بہت سے ذہنوں کو ایک آدرش مہیا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کہ جس کی طرف تحقیق بتدریج بڑھ سکتی ہے۔

اس رائے کی مخالفت کرنا فضول ہوگا کہ تاریخ کو دستاویزات کے مطالعے پر موسس ہونا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ صرف دستاویزات ہی اس امر کی شہادت کو شامل رکھتی ہیں کہ کون کون سے واقعات واقعی پیش آئے تھے۔ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ جھوٹی تاریخ کی کوئی قابل ذکر قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ تاریخ کی چند بہترین کتابوں سے قطع نظر معاملہ یہ ہے کہ تاریخ کی پچاس کتابوں کے مقابلے میں کسی ایک دستاویز میں زیادہ زندگی ہوتی ہے۔ محض اس وجہ سے کہ اس میں وہ کچھ شامل ہے جو حقیقی ماضی کے وقت سے تعلق رکھتا ہے، اس میں ایک عجیب سی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ واقعہ کے بعد لکھی جانے والی تاریخ بہ مشکل ہی ہم کو یہ احساس دلا سکتی ہے کہ اس تاریخی واقعہ کے کردار مستقبل سے بے خبر تھے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ آخری دور کے رومنوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی سلطنت پستی کی طرف لڑھک رہی ہے۔ یا یہ کہ چارلس اول اپنی پھانسی جیسے بدنام واقعہ سے بے خبر تھا۔

اچھا، اگر دستاویزات سوچ بچار کی بنیاد پر لکھی جانے والی تاریخ سے کئی اعتبار سے بدتر ہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مورخ کا کام کیا رہ جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے پہلی بات جو ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ مورخ کا کام انتخاب کرنا ہے۔ یہ ایک عام سی بات ہے اور میرا خیال ہے کہ سب لوگ اس کو تسلیم کر لیں گے۔ مورخ کے پاس عام طور پر ڈھیر سارا مواد ہوتا ہے اور وہ سارے کے سارے مواد کو شامل نہیں کر سکتا لہٰذا وہ اس میں سے بعض چیزیں چن لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا مطلب باقی مواد کو مسترد کرنا یا کم از کم نظر انداز کر دینا

ہے۔ یہ ہوئی عام سی بات، لیکن عام طور پر اس امر کا احساس نہیں کیا جاتا کہ انتخاب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مورخ کے پاس حقائق کی قدر و قیمت کا کوئی معیار ہوتا ہے، چنانچہ وہ ان حقائق کو چن لیتا ہے جو اس کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ماضی کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے صرف سچائی ہی مقصد نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ تمام حقائق مساوی طور پر سچے ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا انتخاب تبھی ممکن ہے جب سچائی کے طور پر کوئی اور معیار پیش نظر ہو۔ ایسے کسی معیار کا وجود بالکل واضح ہے۔ مثال کے طور پر کوئی یہ نہ کہے گا کہ گرام مونٹ نے سترہویں صدی کے انگلستان میں شاہ چارلس دوم کی حکومت کی بحالی سے متعلقہ جو چھوٹے چھوٹے سکینڈل ریکارڈ کیے تھے، وہ اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ پائڈ مونٹیز کے قتل عام پر لکھے ہوئے خطوط جن کے ذریعے ملٹن نے، کرامویل کے نام پر، یورپ کے مجہول حکمرانوں کی ہمت بندھائی تھی۔

خیر، کوئی نکتہ چین یہ کہہ سکتا ہے انتخاب کا واحد سچا اصول خالص سائنسی اصول ہے۔ یعنی مورخ کو چاہیے کہ وہ ان حقائق کو اہمیت دے جو عمومی قوانین کی تشکیل کی طرف لے جاتے ہوں۔ بظاہر یہ معیار اہم دکھائی دیتا ہے، مگر ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ پیش بینی کرنا کم و بیش محال ہے کہ آیا کبھی تاریخ سائنس بن سکے گی۔ یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ موجودہ زمانے میں اس قسم کی کوئی سائنس موجود نہیں ہے۔ حقائق و واقعات پر اہمیت کے سائنسی معیار کے اطلاق کے لیے ضروری ہے کہ دو یا زیادہ مفروضے بنائے جائیں۔ ان میں سے ہر ایک حقائق و واقعات کی بڑی تعداد کی وضاحت مہیا کرے۔ پھر کوئی فیصلہ کن، امر واقعہ تلاش کیا جائے جو ان مفروضوں میں سے کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح عطا کر دے۔ استقرائی علوم میں حقائق صرف نظریات کے حوالے سے اہم ہوا کرتے ہیں۔ جب نئے نظریات سامنے آتے ہیں تو وہ نئے حقائق و واقعات کو اہمیت عطا کرتے ہیں لیکن یہ مشکل ہی یہ تصور کیا جائے گا کہ تاریخ ایسے مرحلے تک پہنچ چکی ہے۔ یا جلد ہی پہنچنے والی ہے جہاں اس قسم کے معیار اس کے حقائق و واقعات پر قابل اطلاق ہوں گے۔ لگتا ہے کہ سچائی کے ایک مجموعہ کے طور پر تاریخ ایک طویل عرصے تک کم و بیش مکمل طور پر بیانیہ علم ہی رہے گی۔ یہاں ہم جس قسم کی تعمیمات کا ذکر کر رہے ہیں --- ماسوائے معاشیات کے دائرہ کار کے --- وہ زیادہ تر اس قدر بے جواز ہیں کہ ان کی تردید کرنا بھی فضول ہی ہوگا۔ برک نے یہ استدلال پیش کیا

تھا کہ تمام انقلاب بالآخر فوجی آمریتوں پر منتج ہوتے ہیں۔ یوں اس نے پنولین کی پیش گوئی کی تھی۔ جہاں تک اس کا استدلال کرامویل کی مماثلت پر مبنی تھا جو اس کے استدلال کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا لیکن آپ اس امر کو یقینی طور پر ایک سائنسی قانون کا درجہ نہیں دے سکتے کہ تمام انقلابات کا نتیجہ فوجی آمریت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ ماننے والی بات ہے کہ کسی قانون کو مستحکم کرنے کے لیے ہمیشہ بہت سی مثالیں ضروری نہیں ہوا کرتیں، بشرطیکہ بنیادوں اور متعلقہ واقعات کو آسانی سے جدا کرنا ممکن ہو۔ لیکن تاریخ میں چھوٹے اور حادثاتی نوعیت کے اس قدر زیادہ واقعات قابل اطلاق ہوتے ہیں کہ وسیع اور سادہ مثالیں ممکن نہیں رہتیں۔

تاریخ کو مکمل طور پر یا کم از کم بنیادی طور پر بے قاعدہ اور غیر یقینی علم کے طور پر پیش کرنے والے اس نظریئے کے خلاف ایک اور نکتہ بھی موجود ہے۔ جب ہمارا بنیادی مقصد قوانین کو دریافت کرنا ہو تو پھر ہم ان قوانین کو ایسے حقائق کے مقابلے میں فی نفسہ زیادہ قابل قدر قرار دیتے ہیں جن کو یہ قوانین منضبط کرتے ہیں۔ فلکیات کی مثال لیجیے۔ قانون کشش ثقل کو جاننا کسی خاص شب بلکہ یوں کہیئے کہ سال بھر کی راتوں میں کسی ایک سیارے کی پوزیشن کو جاننے سے کہیں بہتر ہے۔ اس قانون میں ایک تاب ناکی، سادگی، بالادستی کا احساس ہے جو بصورت دیگر غیر دلچسپ تفصیلات کو روشن کر دیتا ہے۔ حیاتیات میں بھی یہی معاملہ ہے۔ جب تک نظریہ ارتقاء نے عضویاتی ڈھانچوں کے سراسیمہ کرنے والے تنوع کو منضبط کر کے بامعنی نہ بنایا تھا، تب تک صرف مشاق فطرت پرستوں کو ہی اس کے خاص خاص حقائق سے دلچسپی تھی۔ تاریخ کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ تمام نہیں تو اکثر تاریخی حقائق و واقعات کی اپنی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ لوگ ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ علتی قوانین کے ذریعے ان کو باہم منضبط کرنے کے امکان کے بغیر ہی وہ مطالعہ کے قابل ہوتے ہیں اور ان کا معالعہ کیا بھی جاتا ہے۔

اکثر اوقات تاریخ کے مطالعے کی سفارش موجودہ سیاسی مسائل کے حوالے سے اس کی افادیت کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ اس حوالے سے تاریخ کی افادیت بہت زیادہ ہے۔ تاہم ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس مطالعے سے جس قسم کی رہنمائی حاصل ہونے کی توقع کرتے ہیں، اس کا بہت احتیاط کے ساتھ تعین کر لیا جائے۔ ناپختہ اور عامیانہ مفہوم میں ''تاریخ کی تعلیمات'' علتی قوانین کی دریافت کو پہلے سے فرض کر لیتی ہیں اور عموماً یہ بہت ہی

عمومی قسم کے قوانین ہوتے ہیں۔ بلاشبہ بعض صورتوں میں اس قسم کی تعلیمات بے ضرر ہو سکتی ہیں، لیکن نظری اعتبار سے وہ بہت ہی خام ہوتی ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے دوران عام طور پر آزادی اور جمہوریت کی قدر و قیمت کے بارے میں دلائل یونان اور روم سے لیے جاتے تھے۔ اب اس رویے کا زیادہ رواج نہیں رہا۔ تاہم ہمارے زمانے میں بھی کئی لوگ اسی طرز و فکر کے حامل ہیں۔ وہ اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق یونان و روم کی عظمت یا زوال کو ان اسباب سے منسوب کرتے ہیں۔

اس سے زیادہ عجیب و غریب اور کیا بات سننے میں آ سکتی ہے کہ اہل روم کے فن خطابت کا اطلاق انقلاب فرانس کے حالات پر کر دیا جائے۔ نمائندہ اداروں اور طباعت کی سہولتوں سے محروم نیز غلامی پر مبنی کسی شہری ریاست کی تنظیم جدید جمہوریتوں سے اس قدر مختلف شے ہے کہ ان دونوں کے درمیان بہت ہی ہی مبہم قسم کی مماثلت کے سوال کوئی مماثلت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شہنشاہیت کے بارے میں دلائل قدما کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ اچھا تو کیا، مثال کے طور پر، ہم یہ مان لیں کہ روم کی سلطنت اپنی سرحدوں میں مسلسل توسیع کے سبب برباد ہو گئی یا جیسا کہ موسمین ہم کو یقین دلاتا ہے کہ دریائے رہائین اور ڈینیوب کے درمیانی علاقے کے جرمنوں کو فتح کرنے میں ناکامی روم کی سب سے زیادہ مہلک غلطیوں میں سے ایک تھی؟ مصنفین اپنے اپنے تعصبات کے مطابق اس قسم کے دلائل ہمیشہ پیش کرتے رہیں گے۔ اگر دلائل میں تھوڑی بہت سچائی موجود ہو تو بھی زمانہ حال پر ان کا اطلاق ممکن نہ ہوگا۔

یہ خرابی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ تاریخ کسی عمومی فلسفیانہ نظریئے کا درس دیتی ہے اور اس کو ثابت کرتی ہے --- مثلاً یہ کہ حق ہی بالآخر قوت ثابت ہوتا ہے یا یہ کہ آخر کار سچ کا بول بالا ہوتا ہے یا یہ کہ ترقی سماج کا عالمگیر قانون ہے۔ ان تمام نظریوں کو اپنی تائید و حمایت کی خاطر وقت اور مقام کے محتاط انتخاب اور اس کے ساتھ ساتھ اقدار کی جعل سازی درکار ہوتی ہے۔ کارلائل اس خطرے کی ناگوار حد تک واضح مثال ہے۔ پیورٹن ازم کے معاملے میں اپنے اس رویے کے باعث وہ کرامویل کے تمام غیر قانونی اور ناعاقبت اندیش اقدامات کو واجب ٹھہرانے لگا تھا۔ یہ کہنا محال ہے کہ اس نے بادشاہت کی بحالی کی توجیہ کس طرح کی تھی۔ دوسرے امور میں وہ اس سے بھی زیادہ گمراہ ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ اکثر اوقات یہ جاننا مشکل ہوتا

ہے کہ حق کس طرف ہے لیکن قوت کا معاملہ اور ہے۔ وہ سب کو نظر آ جاتی ہے۔ لہٰذا یہ نظریہ کہ ''حق قوت ہے'' ہولے ہولے اس عقیدے میں بدل جاتا ہے کہ ''قوت حق ہے''۔ اس طرح فریڈرک، نپولین اور بسمارک کی مدح سرائی کی راہ کھلتی ہے اور سیاہ فام انسانوں کے لیے بے رحم قسم کی حقارت اور توہین کے جذبے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

خیر، یہ تو ماننا ہی ہوگا کہ حالات حاضرہ کے حوالے سے تاریخ کا ایک فریضہ ہے۔ مگر یہ فریضہ نہ تو زیادہ براہ راست ہے اور نہ زیادہ واضح اور طے شدہ۔ وہ فیصلہ کن بھی کم ہی ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ پہلے قدم کے طور پر اس فریضے کا تعلق چھوٹے موٹے مسلمہ اصولوں یا چھوٹی موٹی عمومی سچائیوں کو تجویز کرنے سے ہے۔ یہ اصول ایسے ہونے چاہئیں کہ جب وہ پیش کیے جا چکے ہوں تو ان کی سچائی کو، ان کے سامنے لانے والے واقعات کی مدد کے بغیر دیکھا جا سکے۔ معاشیات میں عموماً یہی معاملہ پیش آتا ہے جہاں اکثر متعلقہ محرکات سادہ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک سبب کے باعث سٹریٹجی میں بھی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ جہاں کہیں حقائق و واقعات سے ایک سادہ استخراجی استدلال اخذ کیا جا سکے، وہاں تاریخ مفید ہدایات مہیا کر سکتی ہے۔ لیکن ان کا اطلاق صرف وہیں ہوگا جہاں مقصد سامنے لایا گیا ہو۔ گویا یہ ہدایات محض تکنیکی قسم کی ہوں گی۔ وہ مقصد کے انتخاب میں مدبر کی رہنمائی نہیں کر سکیں گی۔ البتہ چند حدود کے اندر وہ یہ واضح کر سکیں گی کہ دولت مندی یا جنگ میں فتح جیسے بعض زیادہ صریح مقاصد کس طرح حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

(2)

ویسے تاریخ کی ایک اور بھی افادیت ہے جو زیادہ بڑی بھی ہے۔ بات یہ ہے کہ تاریخ تخیل میں وسعت پیدا کرتی ہے اور عمل و احساس کے ایسے امکانات پیش کرتی ہے جو غیر تربیت یافتہ ذہن میں نہیں آ سکتے تھے۔ وہ ماضی کی زندگیوں کے ایسے عناصر منتخب کرتی ہے جو اہم اور دقیع تھے۔ وہ ہمارے خیالات کو شاندار مثالوں سے بھر دیتی ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں عظیم تر مقاصد کی آرزوئیں پیدا کر دیتی ہے۔ تاریخ حال کا رشتہ ماضی سے جوڑتی ہے اور یوں مستقبل کو بھی حال سے منضبط کر دیتی ہے۔ وہ قوموں کی نشوونما اور عظمت کو نمایاں کر دیتی ہے اور ہم کو اس قابل بناتی ہے کہ ہم اپنی امیدوں کو اپنی زندگی کے دور سے آگے تک پھیلا سکیں۔ ان تمام طریقوں سے تاریخ

کاعلم تدبر اور ہمارے روزمرہ کے خیالات کو ایک ایسی پنہائی اور وسعت عطا کرتا ہے جس سے وہ لوگ محروم رہتے ہیں جن کا ذہنی منظر زمانہ حال تک محدود رہتا ہے۔

اگر یہ جائزہ لینا مقصود ہو کہ ماضی ہمارے لیے کیا کچھ کرسکتا ہے تو پھر ان نئی قوموں پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے جن کی توانائی اور کارجوئی یورپ کے لیے رشک کا باعث بن رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان قوموں میں ایک نئی قسم کا انسان ابھر رہا ہے جو یورپ کی بیداری یا قدیم یونان کے پیریکلیز کے عہد کی تمام تر رجائیت پسندیوں سے لبریز ہے، اس کو یقین ہے کہ اس کی زیادہ طاقتور کوششوں کے باعث جلد ہی وہ سب کچھ حاصل ہو جائے گا جو اس کی پچھلی نسلوں کے لیے محال رہا تھا۔ ماضی کی ان نسلوں کو جن مقاصد نے متحرک کیا تھا، یہ نیا انسان ان سے بے خبر ہے اور ان کو حقارت کی نظر سے بھی دیکھتا ہے۔ وہ ان پیچیدہ مسائل کا شعور نہیں رکھتا جن کو وہ نسلیں حل کرنے کے درپے تھیں۔ اس نئے انسان نے نسبتاً سادہ کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ یوں اس کا اعتماد بڑھ گیا ہے اور وہ سمجھنے لگا ہے کہ مستقبل اس کا ہے۔ لیکن جن لوگوں کی پال پوس ان افراد اور کارناموں کی یادگاروں سے لدے پھندے ماحول میں ہوئی ہے جن کی یاد کو وہ عزیز رکھتے ہیں، وہ یہ اعتماد پیدا کرنے والے خیالات اور جذبوں کے بارے میں شک و شبہات میں مبتلا ہیں، لگتا ہے کہ یہ مساوی رجائیت اس شئے کی بھرپور جستجو کے ذریعے قائم رکھی جارہی ہے جو آسانی سے قابل حصول ہے۔ حالات حاضرہ کا ماضی کی تاریخ کے پس منظر میں جائزہ لینے کی عادت کے ذریعے امیدوں کو آدرشوں میں تبدیلی نہیں کیا جارہا ہے۔ جو کچھ بھی حال سے مختلف ہے، اس پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ آج کے ذہن کے لیے اس امر کو ہضم کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے کہ عظیم افراد ان لوگوں کے درمیان رہتے تھے جنہوں نے مایا دیوی کے عروج میں کوئی حصہ نہ لیا تھا یا یہ کہ دانش ان لوگوں کو نصیب ہوسکتی ہے جن کے خیالات پر مشین حاوی نہیں ہے۔ عمل، کامیابی اور تبدیلی نئے دور کے نعرے ہیں۔ کسی کے پاس یہ سوالات پوچھنے کی فرصت نہیں ہے کہ آیا عمل شریفانہ ہے، کامیابی کا تعلق کسی اچھے مقصد سے ہے اور یہ کہ آیا اس کے سوا کسی اور شعبے میں بھی تبدیلی اچھی ہے، اس رویئے کے خلاف جہاں تمام تر محنت اور زندگی کے مقاصد کی لگن بے معنی دوڑ میں اوّل آنے پر صرف کردی جاتی ہے، تاریخ اور ماضی کے احساس کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادت بہترین تریاق ہے۔ کسی اور دور کے مقابلے میں ہمارے زمانے کو اس قسم کے تریاق زیادہ درکار ہیں۔

عظیم کارناموں کا ریکارڈ وقت کا شکست نامہ ہے۔ یہ ریکارڈ کارناموں اور کارنامے سرانجام دینے والوں کو مرنے نہیں دیتا بلکہ ان کی قوت اور اثر و رسوخ کو ان کے خاتمے کے بعد بھی طویل عرصوں تک پھیلا دیتا ہے۔ ماضی کے بارے میں غور و فکر پر خواہش اور عمل کی ضرورت اثر انداز نہیں ہوتی۔ لہٰذا ہم اس کے حوالے سے خیر و شر کی قدر، انسانوں کے مطلوبہ مقاصد اور ان کے اختیار کردہ طریقوں کو زیادہ وضاحت سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ کبھی کبھار حال کا جائزہ یوں لیا جاتا ہے جیسے کہ وہ پہلے ہی ماضی میں تبدیل ہو چکا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ اس میں کون سے ایسے عناصر ہیں جو دنیا کے مستقل ورثے کا حصہ بن جائیں گے اور جو آج کی تمام نسلوں کے اس جہان سے گزر جانے کے بعد بھی زندہ رہیں گے اور زندگی بخش ثابت ہوں گے۔ اس غور و فکر کی روشنی میں جملہ انسانی تجربے کی کایا پلٹ جاتی ہے اور جو کچھ گھٹیا یا نجی ہے وہ خارج ہو جاتا ہے۔ جوں جوں ہماری دانائی میں اضافہ ہوتا ہے، توں توں زمانوں کی وراثت ہمارے اُفق میں وسعتیں پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ سیکھتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان انسانوں کے لیے ہماری عقیدت بڑھتی چلی جاتی ہے جن کی جانثاری کی بدولت یہ ساری دولت ہم تک پہنچتی ہے۔

رفتہ رفتہ عظیم زندگیوں پر گیان دھیان کے ذریعے پُر اسرار قسم کا رابطہ ممکن ہو جاتا ہے جو ہماری روحوں میں موسیقی کی لہروں کی طرح اتر جاتا ہے۔ دور ماضی سے عظیم انسانوں کی آوازیں ہمیں پکارتی ہیں۔ وہ جنت کی ہواؤں سے مخاطب ہوتی ہیں اور جنت کی ہوائیں بعد کے زمانوں کے عظیم افراد کو داستان سناتی ہیں۔ عظیم افراد تنہا نہیں ہیں۔ رات کی سیاہیوں سے ان کی آوازیں آتی ہیں جو پہلے روانہ ہو چکے ہیں۔

تاریخ مگر محض افراد کا ریکارڈ نہیں ہے -- چاہے وہ افراد بہت عظیم الشان ہی کیوں نہ ہوں تاریخ داستان حیات ضرور ہے، مگر وہ صرف افراد کی نہیں ہوتی بلکہ مجموعی طور پر انسانیت کے طویل جلوس کی کہانی بنتی ہے۔

❁

ایٹمی دور میں بین الاقوامی مسائل حل کرنے کے طریقے

میرا خیال ہے کہ مندرجہ ذیل باتوں پر کسی کو اختلاف نہیں ہے:

(1) بڑے پیمانے پر ایٹمی جنگ شروع ہو جائے تو وہ نہ صرف متحارب فریقوں کے لیے بلکہ پوری نسل انسانی کے لیے ہولناک تباہی کا باعث بنے گی۔ اس جنگ سے کوئی ایسا نتیجہ برآمد نہ ہوگا جس کی کوئی عقل مند شخص خواہش کر سکے۔

(2) جب کوئی چھوٹی جنگ شروع ہوتی ہے تو اس امر کا کافی خدشہ موجود ہوتا ہے کہ وہ بڑی جنگ میں تبدیل ہو جائے گی۔ چھوٹی جنگیں جاری رہنے کی صورت میں بالآخر یہ خدشہ کم وبیش ایک یقینی امر بن جائے گا۔

(3) اگر تمام موجودہ ایٹمی ہتھیار تباہ کر دیے جائیں اور اقوام عالم یہ طے کر لیں کہ وہ نئے ہتھیار نہیں بنائیں گی، تب بھی کسی بڑی جنگ کی صورت میں پہلا موقع ملنے پر برسر پیکار قومیں ممنوعہ ہتھیار بنالیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کی مکمل تباہی اور نئے ہتھیار نہ بنانے کے سمجھوتے کے باوجود ایٹمی جنگ کا خطرہ موجود رہے گا۔

مذکورہ بالا تینوں حقائق سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ہم ہولناک تباہی سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں لازمی طور پر ہر قسم کی جنگوں سے بچنے کا طریقہ ڈھونڈنا چاہیے --- ان میں چھوٹی بڑی اور ارادتاً ایٹمی یا غیر ایٹمی ہر قسم کی جنگیں شامل ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ تمام لوگ، کم وبیش فیصلہ کن انداز میں --- اس نتیجے کو تسلیم کرتے ہیں جنہوں نے اس موضوع کا مطالعہ کیا ہے، اس کے باوجود مشرق ومغرب کے سیاست دان جنگوں کی روک تھام کے لیے کوئی منصوبہ نہیں بنا سکے ہیں۔ ایٹمی

تعطل نمایاں ہونے کے بعد سے مشرق ومغرب کی حکومتوں نے ایک پالیسی اختیار کر رکھی ہے جس کو (1950ء کے عشرے میں) امریکی وزیر خارجہ جان ڈلس صاحب ''دہانہ گیری'' کا نام دیتے ہیں۔ (اس سے مراد یہ پالیسی ہے کہ جنگ میں شامل ہوئے بغیر مناقشت کا سلسلہ قائم رکھا جائے۔ گویا چھیڑ چھاڑ محدود ہونی چاہیے اور نوبت کو جنگ تک نہ پہنچنے دینا چاہیے) مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ پالیسی ایک ایسے کھیل سے اخذ کی گئی ہے جو بہت امیر امریکیوں کے بیٹے کھیلا کرتے ہیں۔ اس کھیل کو ''چکن'' کہا جاتا ہے۔

یہ کھیل ایک لمبی سیدھی سڑک پر کھیلا جاتا ہے۔ سڑک کے درمیان میں سفید لائن لگی ہوئی ہے۔ دو مخالف کاریں مخالف سمتوں سے نہایت تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف بڑھتی ہیں۔ ہر کار نے اپنے ایک طرف کے پہیے سفید لائن کے اوپر رکھے ہوتے ہیں۔ جوں جوں وہ ایک دوسرے کے نزدیک آتی ہیں، ان کے درمیان تصادم اور اس کے نتیجے میں دونوں کی تباہی کا خطرہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اگر دونوں میں سے ایک کار دوسری سے پہلے سفید لائن سے ہٹ جاتی ہے تو دوسری کار والا اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ''چکن'' کا نعرہ لگاتا ہے۔ وہ جیت جاتا ہے اور سفید لائن سے ہٹ کر جانے والا ہار جاتا ہے۔ ہارنے والے کا خوب مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ یہ کھیل صرف امیر زادے ہی کھیلتے ہیں، لہٰذا اس کو زوال پذیر اور غیر اخلاقی قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ اس کھیل میں صرف کھلاڑیوں کی جان کو ہی خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

جب سیاست دان اسی قسم کا کھیل کھیلتے ہیں تو صرف اپنی زندگیوں کو خطرے میں نہیں ڈالتے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگی بھی داؤ لگا دیتے ہیں۔ لیکن ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ دونوں طرف کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی سیاسی رہنما تو بہت زیادہ دانائی اور جرات مندی کا مظاہرہ کر رہے ہیں جب کہ دوسری طرف کے سیاست دان قابل ملامت اور مورد الزام ٹھہرائے جانے کے لائق ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ احمقانہ سا رویہ ہے۔ اس قسم کا ناقابل یقین حد تک خطرناک کھیل کھیلنے کے ذمہ داری دونوں جانب کے سیاست دانوں پر عائد ہوتی ہے۔ دونوں قابل ملامت ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کھیل کی چند باریاں زیادہ نقصان دہ ثابت نہ ہوں۔ لیکن جلد یا بدیر یہ محسوس کیا جانے لگے گا کہ جنگ ہارنے کی شرم ایٹمی ہتھیاروں کے ہاتھوں تباہ ہو جانے سے بھی زیادہ دہشت ناک اور ناقابل برداشت ہے۔ یوں وہ لمحہ آ جائے گا کہ فریقین میں سے کوئی بھی دوسرے سے ''چکن''

کا نعرہ سننے پر تیار نہ ہوگا۔ دونوں مرنے مارنے پر تل جائیں گے۔ جب وہ لمحہ آجائے گا تو دونوں طرف کے سیاست دان دنیا کو تباہی کے بھیانک غار میں دھکیل دیں گے۔

ہوسکتا ہے کہ عملی سیاست دان اس امر کا اعتراف کر لیں، مگر ساتھ ہی وہ یہ دعویٰ بھی کر دیں گے کہ یہ سب کچھ ناگزیر ہے اور اس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ اگر ایک فریق عالمی جنگ کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہے اور دوسرا فریق جنگ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے تو پھر سیدھی سی بات ہے کہ جو فریق جنگ کے لیے تیار ہے۔ وہ تمام مذاکرات میں اپنی بات منوانے کی پوزیشن میں ہوگا اور دوسرے فریق کو بالکل ہی بے بس کر دے گا۔ اس صورت حال کے پیش نظر کوئی عملی سیاست دان یہ کہے گا کہ "جناب کسی سمجھدار فریق کے لیے شاید یہ بات مثالی حد تک دانش مندانہ ہوسکتی ہے کہ وہ جنونی فریق کے آگے جھک جائے اور یوں تباہ کن جنگ کا خطرہ ٹال دے، لیکن یہ بات ہوش مندانہ ہو یا نہ ہو، کوئی غیرت مند قوم اس قسم کا طرز عمل برداشت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ہم دہانہ گیری اور ہتھیار ڈالنے میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے پر مجبور ہیں۔

حالیہ برسوں میں مشرق و مغرب دونوں کی پالیسیاں اسی نقطہ نظر کے حوالے سے طے ہوئی ہیں۔ تاہم میں اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ صرف دہانہ گیری اور ہتھیار ڈالنا ہی متبادل ہیں۔ صورت حال مختلف قسم کے طرز عمل کا تقاضا کرتی ہے جو حصول قوت کے محرک کے زیر اثر نہ ہو بلکہ اس کے پیچھے فریقین کی عمومی بھلائی اور مشترک مفادات کا محرک کارفرما ہو۔ سب سے پہلے ایک نفسیاتی قسم کے اقدام کی ضرورت ہے۔ مقصد اور رویے میں تبدیلی آنی چاہیے اور یہ تبدیلی اسی وقت بامقصد ہوگی جب دونوں فریقوں میں احساس پیدا ہو۔ جہاں تک سرکاری سطح کا تعلق ہے، ابتدا غالباً غیر وابستہ اقوام کی طرف سے ہونی چاہیے۔ تاہم یہ بات بھی ضروری ہے کہ مشرق و مغرب کے وابستہ ممالک کے ایسے افراد اور گروہ مطلوبہ رویے کی سب سے پہلے وکالت کریں، جو قابل احترام سمجھے جاتے ہوں۔

مشرق و مغرب دونوں کو یکساں طور پر دیا جانے والا استدلال مندرجہ ذیل قسم کا ہوگا۔۔۔ ہر فریق کے چند بنیادی مفادات ہیں جن کو وہ قربان کرنے پر تیار نہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی خود کو تباہ کیے بغیر شکست نہیں دے سکتا۔ فریقین کے بعض مفادات باہم متصادم ہیں جو ان کے درمیان کشیدگی کا باعث بنتے ہیں جب کہ ان کے کئی مفادات مشترک بھی ہیں۔ لیکن کشیدگی اور کشمکش کا

باعث بننے والے مفادات ان کے مشترکہ مفادات کے مقابلے میں بہت معمولی ہیں، ان کے مشترکہ مفادات میں سب سے اہم مفاد بقا کا ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کی ماہیت نے اس کو مشترکہ مفاد بنادیا ہے۔

امریکی یا ان میں سے بعض ایسی دنیا کو پسندیدہ قرار دے سکتے ہیں جس میں روسیوں کا کوئی وجود نہ ہو۔ یہ معاملہ دوسری طرف بھی ہوسکتا ہے یعنی روسی یا ان میں سے بعض ایسی دنیا کو سہانی قرار دے سکتے ہیں جو امریکیوں کے وجود سے پاک ہو لیکن امریکہ اور روس دونوں کسی ایسی دنیا کی خواہش نہیں کر سکتے جس میں امریکی اور روسی دونوں قومیں ہی موجود نہ ہوں۔ اچھا، بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ دیکھئے کہ اگر امریکہ اور روس کے درمیان ایٹمی جنگ ہوتی ہے تو وہ دونوں کو لے ڈوبے گی۔ دونوں تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ امن کو قائم رکھنا ان دونوں ملکوں کا مشترکہ مفاد ہے۔ گویا ان کی مشترکہ بقا کو ان دونوں ملکوں کی پالیسی کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔

باہمی سمجھوتے اور اشتراک کا دوسرا محرک ہتھیاروں کی دوڑ کے بوجھ سے نجات پانا ہے۔ موجودہ پالیسیاں جاری رہیں تو پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ بوجھ بڑھتا چلا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ مہنگے ہتھیار ایجاد ہوتے رہیں گے اور زیادہ سے زیادہ لیبر کو روزمرہ استعمال کی اشیاء کی پیداوار سے ہٹا کر ہلاکت آفرین ہتھیاروں کی تیاری میں جھونکا جاتا رہے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ ہی عرصے میں فریقین کی آبادی غربت کی سطح پر اتر آئے گی۔ مختلف حالات میں مفید ثابت ہونے والی ایجادات کی افادیت ختم ہو جائے گی کیونکہ پیداوار میں اضافہ کی ہر تدبیر جنگی مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کے لیے مزید لیبر فارغ کرنے لگے گی۔ اگر فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے سے پہلے حماقت اور جنون کے اس بوجھ سے نجات پانا چاہے گا تو اس کو شکست کا خطرہ مول لینا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہولناک خطرے سے پیدا ہونے والے اس تلخ ماحول میں فریقین کم و بیش ہر قیمت پر یہ ہولناک کھیل جاری رکھنا چاہیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان کشیدگی کے خاتمے سے نہ صرف خرابیاں ختم ہو جائیں گی بلکہ نتیجے کے طور پر بہت سی اچھائیاں بھی پیدا ہوں گی۔ سائنس نے ہم کو ایسے طریقے مہیا کر دیئے ہیں جن کی مدد سے دنیا کے تمام حصوں میں معیار زندگی بلند کیا جا سکتا ہے اور خوش حالی

پیدا کی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر غریب ملکوں میں ان کے ذریعے خوش حالی کا انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ایشیاء اور افریقہ میں اگر آج بھی زندگی کا معیار امریکہ کے مقابلے میں پست ہے تو اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے انسانی حماقت۔ ہتھیاروں کی دوڑ اگر جاری رہی تو آپ دیکھیں گے کہ امریکہ کا معیار زندگی بھی آخر کار دنیا کے غریب ترین حصوں کی سطح تک بتدریج گر جائے گا۔ یوں سائنسی ترقی نے جس عالمی خوشحالی کو ممکن بنا دیا ہے، اس کی جگہ عالمی غربت کا دور دورہ ہو جائے گا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مشرق و مغرب کی موجودہ دشمنی صرف مادی طریقوں سے نقصان دہ نہیں ہے۔ درحقیقت جذبہ و اخلاق کے معاملے میں زیادہ ہی نقصان دہ ہے۔ اعلیٰ ترین سرکاری حکام صاف طور پر ہم کو بتا چکے ہیں کہ اگر برطانیہ ایٹمی جنگ میں شریک ہو گیا تو شہری آبادی کو بچانے کی کسی سنجیدہ کوشش کے بجائے ان لوگوں کو تھوڑی دیر مزید زندہ رہنے پر توجہ دی جائے گی جو دشمن پر میزائلوں اور بموں کے حملے کرنے کے ذمہ دار ہیں تاکہ وہ اس مدت میں دشمن کے مزید لاکھوں کروڑوں افراد کو موت کے منہ میں دھکیل سکیں۔ آخری وقت تک محاذ پر ڈٹے رہنے والے جب مریں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ ان کی قوم پہلے ہی موت کے منہ میں جا چکی ہے لیکن (یہ فرض کیا جاتا ہے کہ) ان کے دل میں یہ خوشی ہوگی کہ انہوں نے دشمن سے بدلہ لے لیا ہے۔

ان باتوں کے ذریعے میں خاص طور پر برطانوی پالیسی کو ہدف تنقید نہیں بنا رہا ہوں۔ یہ کوئی انوکھی پالیسی نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دونوں مخالف گروہوں سے تعلق رکھنے والے ملکوں کی پالیسیاں اس قسم کی ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات ان پالیسیوں کی تائید مذہب سے بھی حاصل کر لی جاتی ہے اور بہت سے لوگ خلوص دل سے، مگر مغالطہ آمیز طریقے سے، یہ سمجھتے ہیں کہ روحانی طور پر بھی اس قسم کی پالیسیوں کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس رویے کو ممکن بنانے والی ذہنیت۔ چاہے جس قدر بھی مخلصانہ ہو، وہ اخلاقی اعتبار سے دہشت ناک ہے اور ان لوگوں کے فکر و احساس میں زہر گھول دیتی ہے جو اس کو قبول کر لیتے ہیں۔

یہ تمام اسباب، نہ صرف مشابہت پسند محرکات بلکہ ذاتی مفاد کے سادہ ترین تقاضے بھی، اس امر کو ضروری بنا دیتے ہیں کہ مشرق و مغرب کو اب اپنے اختلافات جنگ یا جنگ کی دھمکیوں کے ذریعے حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اگر یہ تو میں اس نتیجے کو ثابت کرنے والے سادہ

اور واضح استدلال کو یکساں طور پر قبول کر لیں تو پھر اختلافات سے نمٹنے کے دوسرے طریقوں کی تلاش ناممکن نہ رہے گی۔ اب تک ان اقوام کے درمیان سمجھوتے اس لیے مشکل رہے ہیں کہ ان کی حقیقی خواہش ہی موجود نہیں۔ کوئی فریق سمجھوتے کی خواہش صرف اس وقت کرتا ہے کہ جب وہ اس کی سفارتی کامیابی کا پروانہ ہو، لیکن فریقین کو اگر اس حقیقت کا احساس ہو جائے کہ سمجھوتوں کا وجود سفارتی کامیابیوں سے کہیں زیادہ اہم معاملہ ہے تو پھر وہ دیکھیں گے کہ بے لاگ سمجھوتوں تک پہنچنا ہرگز اس قدر دشوار نہیں جس قدر کہ سمجھا جاتا ہے۔

میں یہاں جس نقطہ نظر کی وکالت کر رہا ہوں، اس کے حامیوں کو صاف طور پر اس امر کی وضاحت کر دینی چاہیے کہ اس کا مقصد مغرب کے خصوصی مفادات کی تائید کرنا ہے اور نہ ہی مشرق کے خصوصی مفادات کی وکالت کرنا ہے۔ اس کا مقصد کسی ایک فریق کو ترجیح دینا بھی نہیں ہے۔ فریقین کو یہ نکتہ پوری طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ان کے باہمی تضادات اور جھگڑے موجود رہے تو وہ بالآخر دونوں کی تباہی کا باعث بن جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر انہوں نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور آپس میں صلح و امن سے رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تو ان کو بے پناہ فوائد حاصل ہوں گے۔



عالمی حکومت

فنی وجوہ کی بناء پر سماجی وحدتوں کی حدود میں توسیع زیادہ فائدہ مند ہوگئی ہے۔ مارکس نے معاشیات کے شعبے میں اس دعویٰ کو دنیا بھر میں روشناس کرایا تھا۔ تاہم اس شعبے کے بعض اطلاقات کی طرف اس کی توجہ نہ گئی تھی۔ کامرس کا اب جس قدر رد جود رہ گیا ہے۔ وہ اقوام کے درمیان تجارت کا معاملہ بن گئی ہے۔ اس میں سوداگر کا کردار حکومتوں نے خود سنبھال لیا ہے۔ کسی صنعتی اور زرعی ملک کے درمیان مثلاً برطانیہ اور ارجنٹائن کے مابین، معاشی رابطے و رشتے اہم ہیں۔ ان دونوں کی خودمختار ممالک ہونے کی حیثیت باہمی تجارت کو کٹیلا بنا دیتی ہے جو حکومتوں اور قوموں کے درمیان نفرت کا سبب بنتا ہے۔ بلاشبہ یہ واہیات سی بات ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ قصائی کو روٹی کی اور نان بائی کو گوشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا دونوں ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ لہٰذا مناسب سی بات ہے کہ ان کے درمیان اچھے تعلقات ہونے چاہیں۔ لیکن اگر قصائی اپنے طور پر ایک خودمختار ملک ہے اور نانبائی ایسا ہی ایک اور ملک ہے اور ان کے درمیان گوشت کے ٹکڑوں اور روٹیوں کے تبادلے کی شرح کا تعین بندوق چلانے کی مہارت نے کرنا ہے تو پھر ان کے مابین اچھے تعلقات کا خدا ہی حافظ ہے۔

ہمارے آج کے زمانے میں بین الاقوامی تجارت کی صورت حال بالکل اسی قسم کی ہے۔ اگر یہ صورت واقعی پیش نہ آتی تو ہم مان ہی نہ سکتے تھے کہ نسل انسانی کی حماقتیں اس سطح تک گر سکتی ہیں۔ قوموں کا ایک دوسرے پر معاشی انحطاط گزشتہ تمام ادوار کے مقابلے میں بڑھ چکا ہے۔ تاہم وہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستی اور خیر سگالی کے جذبوں کا باعث بننے کے بجائے نفرتوں اور عداوتوں کا سبب بن رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارا معاشی نظام نجی منافع کے نظام سے ابھرا ہے اور دوسری وجہ قومی خودمختاریاں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ معاشیات کا ریاست

کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قریبی تعلق بنتا جا رہا ہے۔ یوں وہ زیادہ سے زیادہ سیاست کے تابع ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مارکس کا کہنا تھا کہ سیاست معیشت کا تعین کرتی ہے اور یہ بات اس نے اس لیے کہی تھی کہ وہ ابھی تک اٹھارھویں صدی کی عقل پرستی کے زیر اثر تھا اور سمجھتا تھا کہ لوگوں کی سب سے بڑی خواہش دولت کا حصول ہوتی ہے۔ مارکس کے زمانے کے بعد کے تجربے نے ثابت کیا ہے کہ کچھ اور شے ہے جس کی خواہش لوگ اپنی دولت مندی سے بھی زیادہ کرتے ہیں --- اور وہ یہ ہے کہ دوسروں کو غریب رکھا جائے۔ جونہی تجارت افراد کے بجائے اقوام کا معاملہ بن جاتی ہے تو فوجی قوت لازمی طور پر اس میں ایک بڑا کردار ادا کرنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معیشت پر سیاست کا غلبہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

سماجی وحدت کے بڑھتے ہوئے حجم کے فوائد اگر کسی شعبے میں سب سے زیادہ نمایاں ہوئے ہیں تو وہ جنگ کا شعبہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندانوں سے قبائل تک، قبائل سے اقوام تک اور اقوام سے اقوام کی گروہ بندیوں تک، وحدتوں کے بڑھاؤ میں جنگ نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ تاہم اب یہ حقیقت بعض لوگوں پر آشکار ہونے لگی ہے کہ اگرچہ بڑی وحدتیں فتح و نصرت کا سبب بنتی ہیں، تاہم ایک شے ایسی بھی ہے جو فتح سے بھی بہتر ہے اور وہ جنگ سے اجتناب اور کنارہ کشی ہے۔

ماضی میں جنگیں عام طور پر فائدہ مند مہم جوئیاں ہوا کرتی تھیں۔ جب کوئی فریق جیت جاتا تھا تو لوٹ مار شروع کر دیتا تھا۔ وہ مفتوحین کا سب کچھ لوٹ کر لے جاتا تھا۔ یہ لوٹ مار وحشی قبیلوں تک محدود نہ تھی بلکہ مذہبی جوش و خروش کے نام پر لڑنے والے بھی لوٹ مار میں کسی سے پیچھے نہ رہا کرتے تھے، کئی قوموں نے لوٹ مار کے ذریعے ہی دولت کے انبار لگائے تھے۔ خیر، وہ زمانے گزر گئے۔ ہمارے دور میں معاملہ بالکل مختلف ہو گیا ہے۔ جنگ اب پہلے کی طرح مفید نہیں رہی۔ اس صورت حال کے اسباب دو ہیں۔ ایک یہ ہے کہ جنگی ہتھیار بے حد مہنگے ہو گئے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جدید جنگوں سے تعلق رکھنے والے سماجی گروپ بہت بڑے ہو گئے ہیں۔

یہ سوچنا درست نہیں ہے کہ جدید طرز زندگی کی جنگیں پرانے زمانے کی سادہ قسم کی جنگوں سے زیادہ ہلاکت آفرین ہیں اور ان میں انسانوں کی کہیں زیادہ تعداد لقمہ اجل بن جاتی ہے۔ ماضی کی جنگوں میں فریقین کے مارے جانے والے افراد کا تناسب کم و بیش وہی تھا جو جدید زمانے

کی جنگوں میں رہا ہے۔ یہ بھی دیکھئے کہ میدان جنگ میں کام آنے والوں کے علاوہ بیماریاں بھی خوب تباہی مچایا کرتی تھیں۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم اور وسطی زمانوں میں طاعون جیسی وبائیں پوری پوری فوجوں کو چت کر دیتی تھیں اور وہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی تھیں۔ ایسا تاریخ میں ایک دو بار نہیں ہوا بلکہ اس کی آپ کو بار بار مثالیں ملیں گی۔ بلاشبہ ایٹم بم کی شان و شوکت اور رعب داب بہت زیادہ ہے۔ تاہم اس قسم کے ہتھیاروں کے استعمال سے بھی انسانوں کی تباہی کی شرح اس قدر زیادہ نہ ہوگی جتنی کہ پرانے زمانے کی بعض جنگوں میں رہی تھی۔ ایک مثال دیکھئے: ایک اندازے کے مطابق دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان کی آبادی میں پچاس لاکھ نفوس کا اضافہ ہوا تھا۔ اس کے مقابلے میں چند صدیاں پہلے تیس سالہ جنگ کے دوران جرمنی کی آبادی آدھی رہ گئی تھی۔ گویا ہم یہ اصول نہیں بنا سکتے کہ جوں جوں ہتھیار زیادہ تباہ کن ہوتے چلے جاتے ہیں توں توں جنگ میں مرنے والوں کا تناسب بڑھتا چلا جاتا ہے۔

بہرطور ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے استعمال میں ایک نیا خطرہ مضمر ہے۔ یہ خطرہ صرف اپنی قسم کے اعتبار سے نیا نہیں بلکہ وہ گزشتہ جنگوں کے مقابلے میں اپنی شدت کے لحاظ سے بھی بڑا ہے۔ اس خطرے کا تعلق اس امر سے ہے کہ ہم کو ریڈیو ایکٹی وٹی کے طوفان اٹھانے کے نتائج کا علم نہیں ہے۔ آئن سٹائن سمیت بعض صاحبان کا کہنا ہے کہ ان بموں کے استعمال سے ہمارے سیارے پر ہر قسم کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ یہ نوبت نہ آئے تو بھی یہ ضرور ہوگا کہ عظیم زرخیز علاقے بنجر ہو جائیں گے اور رہائش کے قابل نہ رہیں گے۔ علاوہ ازیں بڑے بڑے علاقوں کی آبادیاں صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گی۔ میں نہیں کہتا کہ جنگ میں ایٹمی توانائی کے استعمال سے یہ نتائج لازماً پیدا ہوں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ فی الحال اس بارے میں کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تاہم ان نتائج کے پیدا ہونے کا خدشہ ضرور موجود ہے اور اگر واقعی ایسا ہوا تو پھر پچھتانے کا موقع بھی نہ رہے گا۔

جنگ و جدل میں حملے کی قوت اور دفاع کی قوت کے مابین ایک قسم کا تعلق سا ہوتا ہے۔ اچھے وقت وہ ہوتے ہیں جب دفاعی قوت مضبوط ہو اور برے وہ کہ جب حملے کی شدت زیادہ ہوتی ہے۔ آج کے سائنسی زمانے میں یہ خطرہ ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ حملہ آور کسی لمحے واقعی تباہ کن برتری حاصل کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر جرثومیاتی جنگ میں دشمن کا صفایا ہو سکتا ہے مگر ساتھ ہی یہ ممکن

ہے کہ حملہ آور بھی اس کی لپیٹ میں آ کر تباہ ہو جائے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ سائنسی مہارت میں اضافے نے جنگ کو زیادہ خطرناک بنا ڈالا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ کسی خاص لمحے پر وہ زیادہ مہلک نہ ہو۔

فنا پذیری کے علاوہ بھی جدید طرز کی جنگ گزشتہ ادوار کی اکثر جنگوں سے کئی اعتبار سے بدتر ہو گی ہے۔لیبر کی پیداواری صلاحیت کے بڑھنے سے پہلے کے مقابلے میں آبادی کے زیادہ بڑے حصے کو جنگ و جدل کے معاملات کے لیے مخصوص رکھنا ممکن ہو گیا ہے۔اس کے علاوہ جدید دنیا کی جنگ میں روزمرہ کی زندگی کے عمل میں پڑنے والا خلل پہلے وقتوں کی اکثر جنگوں سے بڑھ گیا ہے۔ایٹمی ہتھیاروں کے خوف نے بڑے بڑے شہروں کی صورت میں آبادی کے اجتماع کو غیر معقول بنا دیا ہے۔امریکیوں کا ملک وسیع و عریض ہے اور وہاں آبادی کا دباؤ کم ہے۔چنانچہ وہ نیویارک کی آبادی کو ایک بڑے علاقے میں پھیلانے پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔برطانیہ کے پاس ایسی کوئی گنجائش نہیں، چنانچہ انگریزوں کے پاس اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے کہ وہ بڑی تعداد میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ دیں۔اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں کی جنگیں نسبتاً خوش گوار تھیں اور آرام دہ بھی۔ان جنگوں میں زیادہ تر جنگجو ہی آمنے سامنے ہوا کرتے تھے اور انہی کو جنگ کی زیادہ تر مصیبتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔اب زمانہ اور ہے۔چنانچہ اب جنگ کی صورت میں شہری آبادیوں کو زیادہ مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔مجھے وہ وقت یاد ہیں کہ جب جنگ کے دوران عورتوں اور بچوں کو نقصان پہنچانا مردانگی کی شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا، مگر یہ پرانی باتیں ہیں۔ان کے زمانے بیت گئے۔

ان سارے اسباب کی بنا پر جنگ پہلے کے مقابلے میں زیادہ وبال بن چکی ہے۔اس صورت حال میں اگر مہذب زندگی کو بچانا مقصود ہے تو پھر جنگوں کا انسداد ضروری ہے۔۔۔شاید ہمیں یوں کہنا چاہیے کہ نہ صرف مہذب زندگی بلکہ ہر قسم کی زندگی کے بچاؤ کے لیے جنگ کی لعنت کو ختم کرنا پڑے گا۔یہ معاملہ اس قدر ضروری ہے کہ ہم کو سیاسی فکر کی نئی صورتوں کو قبول کرنے یا ان نئے مسئلوں کا احساس کرنے سے نہیں کترانا چاہیے جن کو ماضی میں نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔

جنگ کو چالاک سفارت کاری اور مصلحتوں کے ذریعے عارضی طور پر روکا جا سکتا ہے، مگر یہ طریقہ کار یقینی طور پر کامیاب نہیں ہو سکتا۔بات یہ ہے کہ جب تک ہمارا موجودہ سیاسی نظام قائم

رہے گا، تب تک وقتاً فوقتاً بڑی بڑی جنگیں بھی ہوتی رہیں گی۔ان سے نجات نہ مل پائے گی۔جنگوں سے نجات اس وقت تک بالکل ہی محال ہے جب تک دنیا مختلف خودمختار قوموں میں منقسم ہے، جن میں سے ہرایک کے پاس مسلح افواج ہیں اور جن میں سے ہرکوئی کسی جھگڑے کی صورت میں اپنے حقوق کا خود ہی مادر پدر آزاد منصف ہے۔صرف ایک ہی راستہ ہے جس کے ذریعے دنیا کو جنگ سے محفوظ کیا جا سکتا ہے اور وہ ایک عالمگیر اتھارٹی کا قیام ہے جس کو دنیا بھر کے تباہ کن ہتھیاروں پر اجارہ داری حاصل ہو۔اس اتھارٹی کو عالمی حکومت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

کوئی عالمی حکومت جنگوں کی روک تھام اس وقت کر سکتی ہے جب اس کے پاس خاص قسم کے اختیارات ہوں۔مثلاً سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تمام بڑے جنگی ہتھیار اس حکومت کے قبضہ قدرت میں ہونے چاہئیں اور ان کو استعمال کرنے کے لیے خاصی تعداد میں مسلح افواج بھی ہونی چاہئیں۔اس امر کو یقینی بنانے کے لیے ہر قسم کے ضروری اقدامات لازمی طور پر کیے جانے چاہئیں کہ مسلح افواج ہر حال میں اس مرکزی، یعنی عالمی، حکومت سے وفادار رہیں گی۔عالمی حکومت کو ان فوجوں کے استعمال کے لیے اصول وضوابط طے کرنے چاہئیں۔ان میں سے اہم ترین یہ ہونا چاہیے کہ دو ریاستوں کے درمیان کسی قسم کا جھگڑا پیدا ہونے کی صورت میں دونوں لازمی طور پر عالمی حکومت کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دیں گی۔اگر کوئی ریاست کسی دوسری ریاست کے خلاف قوت کا استعمال کرتی ہیں تو اس امر کو جرم سمجھا جائے گا اور عالمی حکومت اپنی مسلح افواج کے ذریعے اس جرم کی سزا دے گی۔امن کو قائم رکھنے کی خاطر یہ اختیارات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، ان اختیارات کے حاصل ہونے سے کئی دوسرے اختیارات خود بخود مل جائیں گے۔قانون سازی اور عدالتی فرائض ادا کرنے کے لیے ادارے درکار ہوں گے۔فوجی شرائط پوری ہونے سے اس قسم کے ادارے فطری طور پر وجود پذیر ہونے لگیں گے۔مشکل اور بنیادی مسئلہ مرکزی اتھارٹی کو ناقابل مزاحمت قوت مہیا کرنا ہے۔

عالمی حکومت جمہوری ہو سکتی ہے اور آمرانہ بھی۔ریاستی وحدتوں کی رضامندی سے وجود میں آ سکتی ہے اور فتوحات کے ذریعے بھی۔ممکن ہے کہ کسی ریاست کی قومی حکومت دنیا کو یا اس کے بڑے حصے کو فتح کر لے اور یوں عالمی حکومت کی بنیاد رکھ دے۔دوسری طرف وہ ایسی اتھارٹی بھی ہو سکتی ہے جس میں تمام ملکوں کو، یا متبادل طور پر یوں کہیے کہ تمام انسانوں کو، مساوی حقوق حاصل

ہوں گے۔

جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ عالمی حکومت وجود میں آئی تو اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ بعض خطوں میں اس کے قیام پر اتفاق ہوگا جب کہ باقی حصوں کو فتح کر کے اسے حکومت کے دائرہ اختیار میں لانا پڑے گا۔ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اقوام کے دو گروپوں کے مابین عالمی جنگ چھڑ جائے جس میں فتح یاب ہونے والا گروپ شکست خوردہ اقوام کو غیر مسلح کر دے اور پھر زمانہ جنگ کے دوران وجود میں آنے والے باہمی اشتراک کے ذمہ دار اداروں کے ذریعے دنیا پر حکومت کرنا شروع کر دے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جنگ کی تلخیاں ختم ہوتی چلی جائیں گی اور یوں شکست خوردہ قوموں کو بھی عالمی حکومت میں مساوی حیثیت ملنے لگے گی۔ میرا نہیں خیال کہ انسانی نسل اس قدر دانائی کی حامل ہے یا ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی اس قدر صلاحیت ہے کہ وہ محض رضامندی کی اساس پر عالمی حکومت قائم کر سکے۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ عالمی حکومت کو وجود میں لانے اور ابتدائی برسوں میں اس کی حفاظت کرنے کی خاطر قوت کے ایک عنصر کی ضرورت ہوگی۔

یہ بجا ہے کہ ابتدا میں دنیا کے بعض حصوں میں قوت کی ضرورت پڑ سکتی ہے، تاہم قوموں کے باہمی جھگڑوں کے اہم اسباب کو ختم کیے بغیر لبرل اور جمہوری نظام وجود میں آ سکتا ہے اور نہ ہی اس کو مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔ میں روزمرہ کے چھوٹے موٹے اختلافات کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ ان اہم امور کی طرف توجہ دلا رہا ہوں جن پر قومیں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ مسائل دیکھئے کہ آیا جنوب مشرقی ایشیاء کا خطہ اس طرح پُر ہجوم رہے گا یا یہ کہ جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا ہمیشہ سفید فام لوگوں کے قبضے میں رہیں گے؟ تضاد کے اس قسم کے حقیقی اسباب کا بنیادی طور پر تین مسائل سے تعلق ہے۔ ان تین قسم کے مسائل میں آبادی، نسل اور عقیدے کے مسائل شامل ہیں۔

آبادی کے مسئلے کا خاصا چرچا ہے۔ تاہم میں اس کے سیاسی پہلوؤں کے بارے میں چند لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ معاملہ یہ ہے کہ آبادی کا مسئلہ حل کئے بغیر دنیا کے غریب حصوں کو امیر حصوں کی سطح تک یا اس کے نزدیک لانا بھی ممکن نہ ہوگا۔ یہ امر بالکل عیاں ہے کہ جب تک پوری دنیا میں ایک حد تک معاشی مساوات پیدا نہیں ہوتی تب تک قوموں کے درمیان حسد اور نفرت پیدا کرنے

والے اسباب موجود رہیں گے اور یہ اسباب عالمی حکومت کو طاقتور قوموں کی طرف سے قوت کے استعمال کا محتاج بنا دیں گے۔ اس قسم کی صورت حال غیر مستحکم، خطرناک اور ناگوار ہو گی۔ عالمی حکومت کی مضبوط بنیاد صرف ایک حد تک مساوات اور باہمی رضامندی پر ہی رکھی جا سکتی ہے اور یہ مقصد اس وقت حاصل ہو گا جب دنیا کی مفلس اقوام کو تعلیم مہیا کی جائے گی، ان کے وسائل کو جدید بنایا جائے گا اور آبادی میں اضافے کی شرح پر قابو پایا جائے گا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے طویل زمانے درکار ہوں گے، مگر یہ ضروری نہیں ہے ذرا دیکھئے تو سہی کہ اقوام مغرب نے کس قدر تیزی سے ترقی کی ہے۔ ڈیڑھ دو سو سال پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی وہ معاشرہ نہیں آ سکتا تھا جو مغربی دنیا نے حاصل کر رکھا ہے۔

زیر بحث حقائق ہمیں جس نتیجے کی طرف لیے جا رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اگرچہ عالمی حکومت کے قیام تک بڑی جنگوں سے بچنا محال ہے تاہم خود عالمی حکومت اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتی جب تک تمام اہم ملکوں کی آبادی میں اضافہ کم و بیش رک نہ جائے۔ فی الحال اس امر کا امکان کم ہی ہے۔ اس لیے ہمارا نتیجہ مایوس کن دکھائی دے سکتا ہے، لیکن اس معاملے کا دوسرا پہلو بھی ہے جو اس قدر یاس انگیز نہیں۔ پرانے وقتوں میں اکثر بچے عالم طفولیت میں ہی مر جایا کرتے تھے، بالغ افراد میں شرح اموات بہت زیادہ تھی اور ہر ملک کی آبادی کا بیشتر حصہ قابل نفرت قسم کی غربت میں زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ اب کئی اقوام بچوں کی شرح اموات کو معقول حد تک کم کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ اس طرح انہوں نے بالغ افراد کی شرح اموات کو بھی کم کر لیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مفلوک الحالی کا بھی خاتمہ کر دیا ہے۔ شرح پیدائش میں کمی کے بغیر یہ ساری کامیابیاں حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔

جو قومیں اب تک بیماری اور مفلوک الحالی کی گرفت میں ہیں، وہ ان ترقی یافتہ اقوام کے نقش قدم پر چل کر آگے بڑھ سکتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نسل انسانی کے لیے ایک نئی امید پیدا ہو گئی ہے۔ موجودہ خرابیوں کے اسباب کو اچھی طرح سمجھے بغیر یہ امید پوری نہیں ہو سکتی۔ تاہم ہم کو چاہیے کہ اس امید پر زیادہ زور دیں۔ انسان اپنے مقدر کا مالک ہے۔ اس کے مصائب فطرت نے

پیدا نہیں کیے ہیں، بلکہ خود اس کی اپنی حماقتوں یا چالاکیوں نے پیدا کیے ہیں۔ وہ اپنے وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھا کر مسرت وشادمانی پا سکتا ہے۔



کام اور معاوضہ

بہتر سماج تخلیق کرنے کی جدو جہد کرنے والوں کو مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک مزاحمت فطرت کی طرف سے ہوتی ہے اور دوسری اپنے جیسے انسانوں کی طرف سے۔ سرسری طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت سے ہونے والی مزاحمت سے سائنس نمٹتی ہے جب کہ سیاست اور سماجی تنظیم انسانوں کی طرف سے ہونے والی مزاحمت پر غالب آنے کے طریقے ہیں۔

معاشیات کی حتمی حقیقت یہ ہے کہ فطرت صرف محنت کے نتیجے کے طور پر ہی کار آمد اشیاء مہیا کرتی ہے۔ اپنی خواہشوں کی تسکین کے لیے تھوڑی بہت محنت کی ضرورت سیاسی نظام ہم پر مسلط کرتا ہے اور نہ ہی محنت کش طبقوں کے استحصال کی وجہ سے وہ ضروری ہوتی ہے۔ اس کا سبب تو طبعی قوانین ہیں۔ دوسرے تمام لوگوں کی طرح اصلاح کاروں کو بھی ان قوانین کا لازماً اعتراف کرنا چاہیے اور ان کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔ کسی رجائی معاشی منصوبے کو قابل عمل قرار دینے سے پہلے ہم کو لازمی طور پر یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا پیداوار کے طبعی حالات کوئی نا قابل تبدیلی ویٹو تو مسلط نہیں کرتے یا کہ سائنس اور تنظیم کے حوالے سے ان کو کافی حد تک تبدیلی کرنا ممکن ہے۔

اس مسئلے کا جائزہ لیتے ہوئے دو منضبط نظریوں پر غور کر لینا چاہیے۔ ان میں سے پہلا مالیتھوس کا نظریہ آبادی ہے۔ دوسرا نظریہ زیادہ مبہم ہے مگر مقبول بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ناگزیر حد تک کم از کم ضروریات سے زیادہ پیداوار صرف اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ اکثر لوگ زیادہ سے زیادہ وقت رنگارنگی سے عاری یا تکلیف دہ کام پر محنت کریں اور یوں ان کے پاس مہذب زندگی کے تقاضے پورے کرنے یا معقول قسم کی تفریح کے لیے کم وقت بچے۔ میرا نہیں خیال کہ امید پرستی کی راہ میں حائل یہ دونوں رکاوٹیں کسی گہرے تجزیے کے سامنے ٹھہر سکتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پیداوار کے طریقوں میں تکنیکی ترقی کا امکان اس قدر زیادہ ہے کہ کم از کم آنے والی کئی صدیوں کے

دوران اشیائے صرف میں اضافے اور اوقات کار میں کمی کے ذریعے عام خوشحال پھیلانے میں کوئی ناقابل عبور قسم کی رکاوٹ کھڑی نہ ہو سکے گی۔

کروپوٹکن نے اس موضوع کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے۔سیاست کے عمومی نظریوں کے بارے میں اس کے خیالات پر آپ کی رائے چاہے جو بھی ہو لیکن زراعت کے امکانات پر اس نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ نمایاں طور پر فکر انگیز ،ٹھوس اور متاثر کن ہے۔بات یہ کہ اشتراکی اور انتشار پسند حضرات عام طور پر صنعتی زندگی کی پیداوار ہیں۔ان میں سے صرف گنتی کے چند لوگ خوراک کی پیداوار کے موضوع پر کسی قسم کا عملی علم رکھتے ہیں۔کروپوٹکن کا معاملہ اور ہے۔اس کی دو کتابیں ''روٹی کی فتح''اور''کھیت ،فیکٹریاں اور ورکشاپیں''تفصیلی معلومات سے بھرپور ہیں اور وہ امید پرستی کے لیے بہت سا جواز مہیا کرتی ہیں۔میرے خیال میں اس امر کی تردید نہیں کی جا سکتی۔کہ یہ دونوں کتابیں ایسے امکانات کو سامنے لاتی ہیں کہ جن پر بصورت دیگر ہم میں سے صرف چند لوگ ہی یقین رکھ سکتے تھے۔

مالیتھوس کا کہنا یہ تھا کہ آبادی ہمیشہ وجود کی حد تک بڑھنے کا رجحان رکھتی ہے اور یہ کہ جب خوراک کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کی پیداوار زیادہ مہنگی ہو جاتی ہے۔لہٰذا ان استثنائی مختصر وقفوں سے قطع نظر جب نئی دریافتیں عارضی تخفیف کا موجب بنتی ہیں،انسانوں کی بھاری اکثریت کو ہمیشہ پست ترین سطح پر رہنا ہی پڑتا ہے۔اس سطح سے مراد بقا اور توالد کی سطح ہے۔جب اس نظریئے کا اطلاق دنیا کی مہذب نسلوں پر کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان نسلوں کی شرح پیدائش میں تیز رفتار کمی کے باعث یہ نظریہ غلط ثابت ہو رہا ہے۔خیر،شرح پیدائش میں اس کمی کے علاوہ اور بھی اسباب موجود ہیں جن کی وجہ سے کم از کم مستقبل قریب کی حد تک اس نظریئے کو قبول کیا جا سکتا ہے۔مالیتھوس کی تحریر کے بعد کی صدی کے دوران اجرت کمانے والے طبقوں کی سہولتوں کے معیار میں بہت اضافہ ہوا۔اگر محنت کے نتائج کی تقسیم کا کوئی منصفانہ نظام رائج ہوتا تو پھر سہولتوں کا معیار اور بھی زیادہ بلند ہو سکتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں محنت کی پیداواری صلاحیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔پرانے وقتوں میں جب ایک شخص کی محنت اس کی اپنی ناگزیر ضرورتوں سے صرف کچھ ہی زیادہ پیدا کرتی تھی تو اوقات کار میں کوئی بڑی کمی محال ہوا کرتی تھی۔اسی طرح آبادی کے اس حصے میں کوئی بڑا اضافہ بھی ممکن نہ ہوتا تھا جو زندگی کی ناگزیر

ضرورتوں سے کچھ زیادہ سہولتوں سے بہرہ ور ہوتا۔

پیداوار کے جدید طریقوں نے اس صورت حال پر قابو پالیا ہے۔ حالیہ برسوں میں نہ صرف بہت سے لوگ کرایہ یا سود سے حاصل ہونے والی آرام دہ آمدنی سے لطف اٹھاتے رہے ہیں بلکہ دنیا کے اکثر مہذب ملکوں کی تقریباً نصف آبادی اشیائے صرف کی پیداوار کے عمل میں شریک ہونے کے بجائے جنگ میں شریک رہی یا پھر جنگی ضروریات تیار کرتی رہی۔ آبادی کا دوسرا نصف حصہ جنگ جاری رہنے کی صورت میں اور بھی زیادہ غریب ہو جاتا۔ بہر حال امن کے زمانے میں اس دوسرے نصف حصے کے بوجھ میں اضافہ کیے بغیر پہلے نصف حصے کو فارغ رکھا جاسکتا ہے۔ اچھا اگر ان لوگوں کو فارغ رکھنے کے بجائے پیداواری عمل میں شریک کرلیا جائے تو وہ جو کچھ پیدا کریں گے وہ موجودہ اجرتوں سے ماورا قابل تقسیم فالتو پیداوار ہوگی۔

خیر، یہ کہا جاسکتا ہے کہ آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ خوراک کی قیمتوں میں اضافہ لازماً ہوگا۔ قنوطیت پسند ہمیں جتلائیں گے کہ آخر کار ایک ایسا وقت بھی آجائے گا جب خوراک اس قدر مہنگی ہو جائے گی کہ اجرت پر گزارہ کرنے والے عام لوگوں کے پاس خوراک کے علاوہ کچھ اور خریدنے کے لیے کم وبیش کچھ نہ بچے گا۔ یہ بات مان لینی چاہیے کہ اگر طویل عرصوں تک آبادی میں اضافہ کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہا تو پھر اس قسم کا وقت ضرور آجائے گا۔ اگر روئے زمین پر آبادی اسی قدر گنجان ہو جائے جتنی کہ آج کل لندن میں ہے تو پھر بلاشبہ آبادی کی ساری لیبر کو بچے کھچے علاقوں میں زراعت کے ذریعے ضروری خوراک حاصل کرنے کے کام پر لگانا پڑے گا۔ تاہم یہ فرض کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ آبادی میں اضافہ لامتناہی طور پر جاری رہے گا۔ اس قسم کا اگر کوئی امکان ہے بھی تو وہ اس قدر دور افتادہ ہے کہ عملی مقاصد کی خاطر ہم اس کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔

دور دراز اندیشوں سے کروپوٹکن کے پیش کردہ حقائق کی طرف واپس آتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنی تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ارتکازی کاشت کے طریقوں کو بروئے کار لا کر کسی خاص علاقے میں پیدا ہونے والی خوراک کی مقدار میں اس سے کہیں زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے۔ جتنی کہ اکثر بے خبر لوگ ممکن خیال کرتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ پیداوار کے یہ طریقے خیالی نہیں ہیں، بلکہ ان سے پہلے ہی کام لیا جا رہا ہے۔ کروپوٹکن ایسے

طریقوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ جن کی مدد سے محنت کے اوقات میں کمی کر کے بھی پیداوار کی یہ سطح برقرار رکھی جاسکتی ہے۔ درحقیقت وہ یہ بھی کہتا ہے کہ زرعی کام کا بڑا حصہ ایسے لوگ بھی کر سکتے ہیں کہ جن کے اصل پیشے زیادہ بیٹھنے کے متقاضی ہوتے ہیں۔ وہ یہ کام صرف اس قدر وقیمت میں کر سکتے ہیں جو کہ ان کو صحت مند رکھنے میں معاون ہو۔ وہ تقسیم محنت کے شدید قسم کے نظریئے کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اس کے بجائے وہ ''یکجہتی'' کا حامی ہے۔ وہ ایک ایسے سماج کو وجود میں لانا چاہتا ہے جس میں ہر فرد جسمانی اور ذہنی دونوں قسم کا کام کرے۔ جس میں صحت مند جسم کا مالک ہر شخص محنت کرنے والا ہو اور جس کا ہر کارکن کھیت میں کام کرے اور کارخانے میں بھی۔

کرو پوٹکن نے پیداوار کے متعلق اپنے ان خیالات کو نراج پسندی کی وکالت کے لیے استعمال کیا ہے۔ مگر میرے خیال میں دونوں کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔ ان پیداواری طریقوں کو ریاستی اشتراکیت کے ماتحت بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ بعض حالات میں ان کو سرمایہ داری نظام کے اندر بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

خیر بات یہ ہے کہ یہاں تک ان طریقوں میں ہماری دلچسپی کسی خاص معاشی نظام کو دوسرے نظاموں پر برتری دینے کی غرض سے نہیں ہے۔ اس کے بجائے ہماری دلچسپی اس وجہ سے ہے کہ یہ نئے طریقے محنت کی پیداواری اہلیت کے بارے میں شبہات کو دور کرنے اور ایک نئی دنیا کی تعمیر کے بارے میں ہماری امیدوں کو سہارا دینے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں نے صنعت کے بجائے زراعت کے شعبہ کو اس لیے چنا ہے کہ عام خیال یہ ہے کہ زیادہ مشکلات زراعت کے حوالے سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ سرسری طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب صنعتی پیداوار بڑے پیمانے پر ہو تو وہ ارزاں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس شعبے میں یہ خدشہ موجود نہیں ہے کہ مانگ میں اضافے سے سپلائی کی لاگت بڑھ جائے گی۔

آیئے اب ہم پیداوار کے مسئلے کا خالص فنی اور مادی پہلوؤں سے نکل کر اس کے انسانی عامل کا رخ کریں اور انسانوں کو محنت پر آمادہ کرنے والے محرکات، پیداوار کی موثر تنظیم کاری کے امکانات نیز پیداوار کے تقسیم کے ساتھ تعلق کا جائزہ لیں۔ موجودہ نظام کا دفاع کرنے والوں کا موقف یہ ہے کہ معاشی محرک کے بغیر انسانوں کو موثر انداز کی محنت پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اجرت کا نظام ختم کر دیا جائے تو انسان اس محنت ومشقت سے انکار کر دیں

گے ۔ جو سماج کو قابل برداشت آسائش مہیا کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ معاشی محرک کو ناگزیر قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیداوار اور تقسیم کے مسائل آپس میں مل جاتے ہیں۔ اشتراکیت اور نراجیت کو قبول کرنے والے اکثر لوگوں کی بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دنیا کی چیزوں کی زیادہ منصفانہ تقسیم کا کوئی نظام وجود میں لایا جائے۔ لہٰذا ہم کو یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ وہ تقسیم کے جن نظاموں کی وکالت کرتے ہیں، کہیں وہ پیداوار میں کمی کا باعث تو نہ بن جائیں گے۔

تقسیم کے سوال پر اشتراکیت اور نراجیت میں ایک بنیادی قسم کا اختلاف موجود ہے۔ اشتراکیت ... یا یوں کہیئے کہ کم از کم اس کی اکثر صورتیں ۔ کام کا معاوضہ ادا کرنے کا عمل جاری رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کا موقف یہ بھی ہے کہ بڑھاپا اور بیماری جیسی صورت حال سے قطع نظر فرد کی کام کرنے کی رضامندی معاشرے میں اس کے زندہ رہنے کی شرط ہونی چاہیے۔ دوسری طرف نراج پسند کسی شرط کے بغیر ہر فرد کو اس کی ضرورت کے مطابق عام اشیاء مہیا کرنے کو نصب العین بناتے ہیں۔ البتہ وہ چیزیں جو اس قدر عام نہیں ہیں یا جن کی سپلائی کو لامحدود طور پر نہیں بڑھایا جاسکتا، ان کا راشن کیا جائے گا اور ان کو آبادی میں یکساں طور پر تقسیم کردیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نراج پسند فرد پر محنت کرنے کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتے۔ تاہم ان کا کہنا ہے کہ ضروری محنت و مشقت کو اس حد تک خوشگوار بنایا جاسکتا ہے کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ رضا کارانہ طور پر اس محنت و مشقت کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اشتراکیوں کا طرز فکر بالکل مختلف ہے۔ وہ محنت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کو ذمہ داری بناتے ہیں۔ بعض اشتراکی تمام کارکنوں کا معاوضہ یکساں بنانا چاہتے ہیں جب کہ بعض دوسرے اشتراکی اس حد تک نہیں جاتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس کام کو زیادہ قابل قدر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا معاوضہ عام قسم کے کام کے مقابلے میں زیادہ ہونا چاہیے۔ مختلف قسم کے یہ تمام نظام سرمایہ اور اراضی کی مشترکہ ملکیت کا تقاضہ کرتے ہیں۔ تاہم مثالی معاشرہ کے بارے میں وہ ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ سب ایک دوسرے سے مختلف معاشرہ تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔

آمدنی میں عدم مساوات کو قبول کرنے والی اشتراکیت اور ہمارا موجودہ سماجی نظام دونوں محنت کے لیے معاشی محرک کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا اس موضوع پر دونوں میں کوئی بڑا اختلاف نہیں ہوسکتا۔ ہمارے موجودہ نقطہ نظر کے مطابق اس میں مضمر اختلافات اچھائی کے لیے

ہی ہوں گے۔ ہمارے موجودہ نظام میں بہت سے لوگ محض اس لیے فراغت اور خوشحالی سے لطف اندوز ہوتے ہیں کہ اتفاق سے ان کو اراضی یا سرمایہ ورثے میں مل جاتا ہے۔ بہت سے دوسرے لوگ صنعتی یا مالیاتی شعبے میں اپنی سرگرمیوں کے باعث ایسی آمدنی کے مالک بن جاتے ہیں جو ان کی سماجی افادیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ دوسری طرف اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسے موجد اور دریافت کنندہ بھی سرمایہ کاروں کے ہتھکنڈوں یا عوام کی بے نیازی کے سبب صلے سے محروم رہ جاتے ہیں جن کے کام کی بہت زیادہ سماجی افادیت ہوتی ہے۔ ان کو کبھی صلہ ملتا بھی ہے تو بہت تاخیر سے۔ بہتر معاوضے والا کام صرف ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے جنہوں نے بہت مہنگی تربیت حاصل کی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا انتخاب بھی عموماً میرٹ کے بجائے مقدر کے حساب سے ہی ہوتا ہے۔

اجرت کمانے والے کو رقم اس لیے نہیں ملتی کہ وہ محنت کرنے پر آمادہ ہوتا ہے بلکہ اس کو معاوضہ اس لیے ملتا ہے کہ وہ آجر کے لیے مفید ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایسی وجوہ کی بنا پر بھی محتاجی کے گڑھے میں گر سکتا ہے جن پر اس کا کوئی بس نہیں ہے۔ وہ اس قسم کی ناداری اور محتاجی کے خوف میں مسلسل مبتلا رہتا ہے اور جب بھی اس کی گرفت میں آجاتا ہے تو اس کو ناروا دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ اکثر اوقات اس کی سماجی قدر اور بھی کم ہو جاتی ہے۔ پیداوار کے نقطہ نظر سے یہ ہمارے موجودہ نظام کی برائیوں میں سے چند ایک ہیں۔ اشتراکیت کے کسی بھی نظام میں ان خرابیوں کے دور ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

یہاں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ محنت کے لیے معاشی محرک کی کس حد تک ضرورت ہوتی ہے، اس مسئلہ کو حل کرتے وقت ہم کو دو سوالات پر غور کرنا ہوگا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اگر معاشرہ ہنرمندانہ اور سماجی طور پر زیادہ قابل قدر کام مناسب مقدار میں جاری رکھنا چاہتا ہے تو کیا معاشرہ کو اس کے لیے زیادہ معاوضہ بھی ادا کرنا چاہیے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا کام کو اس قدر پرکشش بنایا جاسکتا ہے کہ اگر کام نہ کرنے والوں کو بھی مساوی حصہ ملتا رہے تو بھی کام کرنے والو کی کمی نہ رہے اور یوں کام چلتا رہے؟

پہلے سوال کا تعلق اشتراکیوں کے دو مکتبہ ہائے خیال کی تقسیم سے ہے۔ جو اشتراکی زیادہ اعتدال پسند ہیں وہ بسا اوقات یہ کہا کرتے ہیں کہ اشتراکی سماج میں بھی مختلف قسم کے کاموں

لیے غیر مساوی معاوضہ کا نظام قائم رہنا چاہیے۔ زیادہ شدت پسند اشتراکیوں کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ وہ تمام کارکنوں کے لئے مساوی معاوضہ کی وکالت کیا کرتے ہیں۔ یہاں ہم نے جو دوسرا سوال پیش کیا ہے اور اشتراکیوں اور نراج پسندوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے، نراج پسند کہتے ہیں کہ کسی شخص کو محض اس لیے اشیائے صرف سے محروم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کام نہیں کرتا ،اشتراکی اس موقف کو تسلیم نہیں کرتے۔ عام طور پر وہ یہ چاہیں گے کہ زندگی کی سہولتیں صرف ان لوگوں کو ملیں جو محنت کرتے ہیں۔

ہمارا دوسرا سوال پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ بنیادی ہے۔اس پر فوری بحث کی ضرورت ہے۔اس بحث کے دوران پہلے سوال کے بارے میں چند اہم باتیں بھی سامنے آجائیں گی۔

اُجرتیں یا مفت کی شراکت؟

اجرت کے نظام کے خاتمے کو نراج پسند اور اگلے مرحلے کے اشتراکی دونوں نے کم وبیش نعرہ کی صورت دے رکھی ہے لیکن یہ صرف نراج پسند ہیں جو اس نعرہ کو استعمال کرنے کا واقعی حق رکھتے ہیں۔نراج پسند، معاشرے کا جو تصور پیش کرتے ہیں، اس میں عام قسم کی اشیائے صرف کسی امتیاز کے بغیر تمام لوگوں کو دستیاب ہوں گی۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے آج کے زمانے میں پانی سب کو دستیاب ہوتا ہے۔اس نظام کے حامی ہم کو یاد دلایا کرتے ہیں کہ آج کے زمانے میں پہلے ہی کئی چیزیں اور سہولتیں تمام لوگوں کو یکساں طور پر دستیاب ہیں جبکہ پچھلے وقتوں میں ان کے لیے رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ وہ اس سلسلے میں سڑکوں اور پلوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ ٹراموں اور مقامی ٹرینوں کی مفت سہولت بڑی آسانی سے مہیا کی جاسکتی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ خوراک کی تمام عمومی اقسام ان تمام لوگوں کو مہیا کی جاسکتی ہیں جو ان کا تقاضا کریں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس قسم کی خوراک کو امکانی مانگ کے مطابق پیدا کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جس کو کروپٹکن نے یہ ثابت کرکے واضح کیا تھا کہ اراضی کو غیر محدود طور پر پیداواری بنایا جاسکتا ہے۔اگر اس نظام کو زندگی کی تمام ضروریات تک پھیلا دیا جائے تو پھر تمام افراد کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کو یقینی بنایا جاسکتا اور اس امر کی پروا باقی نہ رہے گی کہ افراد اپنا وقت کس طرح

گزارتے ہیں۔یعنی پھر یہ مطالبہ نہ کیا جائے گا کہ جولوگ کام کرتے ہیں ان کو معاوضہ دیا جائے اور جو کام نہیں کرتے ان کو معاوضہ سے محروم رکھا جائے۔

اب رہا ان چیزوں کا معاملہ جن کی پیداوار کو لامحدود طور پر نہیں بڑھایا جاسکتا، جو عیش و عشرت اور لطف ومزے کی چیزیں ہوتی ہیں تو ان کے بارے میں نراج پسندوں کا کہنا ہے کہ وہ بھی قیمت کے بغیر تقسیم کی جائیں گی۔تاہم ان کی تقسیم کے لیے راشن کا نظام اپنایا جائے گا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے اشیاء جس قدر بہم ہوں گی ،ان کو آبادی میں مساوی طور پر تقسیم کردیا جائیگا۔نراج پسند خود تو یہ نہیں کہتے ،لیکن لگتا ہے کہ اس قسم کی اشیائے عیش وعشرت یا دیگر نادر ونایاب اشیاء کے لیے قیمت جیسی کسی شے کا تعین کرنا ہی پڑے گا۔تا کہ سب لوگ آزادی سے یہ انتخاب کرسکیں کہ وہ اپنا حصہ کس طرح لیں گے۔مثلاً کوئی شخص عمدہ شراب کو ترجیح دے گا، دوسرا ہوانا کے اعلیٰ سگار پسند کرے گا، تیسرا تصاویر یا پھر شاندار فرنیچر حاصل کرنا چاہے گا۔غالباً نراج پسند چاہیں گے کہ ہر شخص کو اس کی پسندیدہ شے مل جائے۔اس قسم کی دنیا میں پیداوار کا معاشی محرک بالکل ختم ہو جائے گا۔اس کے بعد بھی کام اور محنت کو جاری رکھنے کے لیے دوسرے محرکات سامنے آجائیں گے۔

کیا اس قسم کا نظام ممکن ہے؟ پہلی بات تو فنی ہے۔یعنی آیا فنی طور پر یہ ممکن ہے کہ زندگی کی اشیائے ضرورت کی فراہمی اس قدر بڑھ جائے کہ جب کسی عورت یا مرد کا جی چاہے وہ عوامی سٹور پر جائے اور اپنی ضرورت کے مطابق حاصل کرلے؟

ہم لوگ چیزیں خریدنے اور ان کی قیمت ادا کرنے کے تصور کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اس نظام کا خاتمہ پہلی نظر میں بالکل مضحکہ خیز حد تک وہم زاد لگتا ہے۔ہم کو اس کا یقین ہی نہیں آتا۔بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتنا نا قابل یقین نہیں جتنا کہ بظاہر دکھائی دیتا ہے۔فرض کیجئے کہ ہم کو روٹی مفت ملنے لگی ہے۔تو پھر بھی ہم کو محدود مقدار سے زیادہ اس کی خواہش نہ ہوگی۔آج کے حالات میں بہت سے لوگوں کے پاس اس قدر دولت ہے کہ روٹی پر ان کی آمدنی کا بہت ہی قلیل حصہ صرف ہوتا ہے۔لہذا ان کو روٹی کے استعمال پر نظر رکھنے یا اس کو کم کرنے کی قطعی طور پر ضرورت نہیں ہوتی۔اس کے باوجود وہ جس قدر روٹی کھاتے ہیں، اس قدر روٹیاں تمام آبادی کو زراعت کے بہتر طریقے کی مدد سے مہیا کی جاسکتی ہے۔(زمانہ جنگ کی بات البتہ مختلف ہے۔)

لوگوں کو فطری طور پر روٹی کی محدود مقدار درکار ہوتی ہے۔ کچھ حصہ وہ ضائع بھی کرتے ہیں۔ لیکن عام طور پر اس کی مقدار بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ نراج پسند مثال دیا کرتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں لوگوں کو مہیا کی جانے والی پانی کی مقدار پر پابندی نہیں ہے۔ وہ جس قدر پانی چاہیں استعمال کر سکتے ہیں لیکن یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ شاید ہی کوئی شخص بغیر ضرورت کے پانی کا نلکا کھلا رکھتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور بات یہ ہے کہ مثالی معاشرے میں عام لوگ چیزوں کا زیاں پسند نہ کریں گے اور ضائع کرنے والے کو اچھا نہ سمجھیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہم ان تمام اشیائے صرف کے معاملے میں غیر محدود سپلائی کا اصول قبول کر سکتے ہیں جن کی مانگ کی حد ہوتی ہے اور وہ حد امکانی پیداوار سے کم رہتی ہے۔ یہی معاملہ تمام ضروریات زندگی کے بارے میں بھی پیش آ سکتا ہے جن میں اشیائے صرف کے علاوہ تعلیم جیسی ضروریات بھی شامل ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ان کی پیداوار کو موثر طریقے سے منظم کیا جائے اگر ابتدائی مرحلے سے لے کر اعلیٰ ترین درجے تک کی تعلیم مفت کر دی جائے تو بھی نوجوان لوگ ایک حد سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کرنا چاہیں گے۔ ہاں اگر ان کی سوچ کا انداز نراجی حکومت سراسر بدل ڈالے، تو پھر اور بات ہے۔ یہی معاملہ سادہ خوراک، سادہ لباس اور دوسری بنیادی ضرورتیں پوری کرنے والی چیزوں کا ہے۔

خیر، میرے خیال میں ہم نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مفت شراکت کے نراجی منصوبے میں کوئی فنی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔

سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فرد بالکل کوئی کام نہ کرے اور پھر بھی اس کو آرام و آسائش کا عمومی معیار حاصل ہو جائے تو کیا معاشرے کے ضروری کام ہوتے چلے جائیں گے؟

اکثر لوگ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس سوال کا جواب نفی میں دے دیں گے۔ خاص طور پر اپنے ملازموں کی سستی و کاہلی کی مذمت کرتے رہنے کے عادی آجروں کو یقین ہوگا کہ وہ اس وقت تک کوئی کام نہ کریں گے جب تک ان کو نوکری سے نکالے جانے اور اسکے نتیجے میں بھوکوں مرنے کا ڈر نہیں ہوگا۔ مگر کیا یہ بات اسی قدر یقینی ہے جس قدر سرسری طور پر دکھائی دیتی ہے؟ کام اگر ویسا ہی رہے جیسا کہ آج کل عموماً ہوتا ہے تو پھر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے ان کے دلوں میں مفلسی و محتاجی کا خوف اتارنا ہوگا۔ تاہم ضروری نہیں ہے کہ کام ہمیشہ موجودہ انداز کی طرح پُر ہول ماحول میں خشک اور وبال جان ہی رہے۔ اگر لوگوں کو کام کرنے کی

ترغیب دینے کی بجائے ان کو کام پر مجبور کرنے کی روش بدلنی ہے تو پھر کام کو خوشگوار بنانا ہوگا۔ جب تک کام کو مجموعی طور پر دل پذیر نہیں بنایا جائیگا تب تک یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکے گا کہ معاشرے کو اچھی صورت عطا کر دی گئی ہے۔ اچھا تو کیا یہ امر ناگزیر ہے کہ کام ناگوار اور تکلیف دہ ہی رہے؟

آج کل بہتر معاوضے کا کام، بزنس اور پیشہ ور طبقوں کا کام، زیادہ تر پر لطف ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کام کا ہر لمحہ ہی لطف لینے کے قابل ہوتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا کہ اس قسم کا کام کرنے والے شخص کی زندگی مجموعی طور پر اس فرد کی زندگی سے زیادہ خوشگوار ہوتی ہے جس کی آمدنی کوئی کام کیے بغیر پہلے شخص جتنی ہو۔ اگر کسی شخص نے اپنی ذہنی صحت اور زندگی کا ولولہ برقرار رکھنا ہے تو پھر اس کے لیے ایک خاص حد تک جدوجہد اور مسلسل کیریئر کی کوئی صورت اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بہت سا کام کسی معاوضے کے بغیر کیا جاتا ہے۔ انسانی فطرت کے بارے میں مسرت انگیز اور پر امید نظریہ رکھنے والے صاحبان مجسٹریٹ کے فرائض کو گندے نالے صاف کرنے کے کام کی طرح ناگوار قسم کے امور میں شامل کریں گے۔ لیکن کوئی قنوطی شخص آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اخلاقی برتری اور انتقام جوئی کے مزے اس قدر شاندار ہیں کہ بہت سے بزرگ شرفاء کسی معاوضے کے بغیر ہی بے بس بدبختوں سے جیلیں بھرنے کا کام کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ یہ بھی دیکھیئے کہ خود کام سے حاصل ہونے والے لطف کے علاوہ ہمسائیوں کی اچھی رائے حاصل کرنے کی آرزو اور موثر ہونے کا احساس بھی بہت سے لوگوں کو فعال رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

بہر حال بہت سے لوگ کہیں گے کہ جس قسم کے کام کو رضا کارانہ طور پر منتخب کیا جاتا ہے، اس کو ہمیشہ استثنائی سمجھنا چاہیے۔ اس کے برخلاف ضروری کام کا بہت بڑا حصہ ہمیشہ ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آرام دہ زندگی میسر ہو تو پھر کون شخص ہے جو کوئلے کی کان میں کام کرنے یا کسی بحری جہاز میں کوئلہ جھونکنے کا کام کرنا چاہے گا؟ میرے خیال میں ہم کو یہ بات مان لینی چاہیے کہ ضروری طور پر کیے جانے والے کام کا بڑا حصہ ناگوار رہے گا یا کم از کم تکلیف دہ حد تک یکسانیت کا مارا ہوا ہوگا۔ لہٰذا نراجی قسم کے نظام کو قابل عمل بنانے کی خاطر اس نوع کا ضروری کام کرنے والوں خصوصی مراعات دینی ہوں گی۔ اب اس میں بھی شبہ نہیں کہ ایسی خاص مراعات دینے سے نراج پسندی کی منطق کو ضرور ضعف پہنچے گا۔ تاہم میں یہ کہوں گا کہ اس سے نراجی نظام

پلٹ نہیں جائے گا۔

توجہ اور سوچ بچار سے ضروری کام کے بیشتر حصے کو خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ آج بھی صورتحال یہ ہے کہ عموماً طویل اوقات کار ہی کام کو اذیت ناک بناتے ہیں۔ اگر کام کرنے کے گھنٹوں کو کم کر کے، مثال کے طور پر، چار کر دیا جائے تو جس کام کو اب بوجھ سمجھا جاتا ہے اس کا بڑا حصہ قابل برداشت ہو جائے گا۔ یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں ہے۔ بہتر تنظیم کاری اور زیادہ سائنسی طریقوں کی مدد سے اوقات کار کو آسانی سے کم کیا جا سکتا ہے۔ اگر جیسا کہ کروپوٹکن نے مشورہ دیا ہے، زرعی کام قابل نفرت مفلسی کے جال میں پھنسے ہوئے کسی جاہل کھیت مزدور کی عمر بھر کی بے زبان جانوروں جیسی محنت ہونے کے بجائے صنعتی یا ذہنی کام کرنے والی عورتوں اور مردوں کا کبھی کبھار کا پیشہ بن جائے... زرعی محنت کے لیے بوسیدہ روایتی طریقوں کے بجائے اگر اس میں نئے طریقوں اور نئی ایجادوں سے کام لیا جائے تو پھر زرعی کام افسردگی اور کسل مندی کا موجب ہونے کے بجائے ولولہ انگیز بن سکتا ہے۔ تب زرعی کام کرنے والوں کے لیے ان کا کام صحت اور زندگی کا وسیلہ بن جائے گا۔

نراج پسندوں کا کہنا ہے کہ جیسا معاملہ زراعت کا ہے، ویسا ہی صنعت کا بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ سرمایہ داروں کے زیر انتظام چلنے والی بڑی بڑی تنظیمیں محنت کشوں کے مفادات پر صرف اس قدر توجہ دیتی ہیں جتنی کہ ٹریڈ یونینیں ان سے زبردستی حاصل کر لیتی ہیں۔ اگر یہ تنظیمیں بتدریج خود مختار بن جائیں اور پیدا کاران میں خود طریقوں، حالات اور اوقات کار جیسے تمام مسائل کا فیصلہ کر سکیں تو پھر صنعتی شعبے میں کم و بیش لامحدود مثبت تبدیلیاں آ جائیں گی۔ کثافت اور شور کا تقریباً خاتمہ ہو جائے گا۔ صنعتی علاقوں کی وحشت انگیزی خوبصورتی میں بدل جائے گی۔ پیداوار کے سائنسی پہلوؤں میں دلچسپی تمام پیدا کاروں میں پھیل جائے گی اور فنکار کو تخلیق میں حاصل ہونے والے لطف جیسا کوئی احساس اس سارے کام کو تحریک دینے لگے گا۔ یہ ساری باتیں محض خواب و خیال لگتی ہیں لیکن معاشی خود مختاری سے ان کو حقیقت کا روپ دیا جا سکتا ہے۔ ہم مان سکتے ہیں کہ ان طریقوں کی مدد سے دنیا کے لازمی کام کے بہت بڑے حصے کو بالآخر اس حد تک خوشگوار بنانا ممکن ہو جائے گا کہ جن لوگوں کو محنت مزدوری کے بغیر بھی زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کا سامان مل جاتا ہے، وہ بھی کاہلی اور بے کاری پر یہ کام کرنے کو ترجیح دینے لگیں گے۔ جہاں تک بقیہ کام کا

تعلق ہے تو آیئے ہم اعتراف کر لیں کہ وہ کام کرنے والوں کو مراعات، اعزازات یا اشیاء کی صورت میں خصوصی انعامات دینے پڑیں گے مگر اس امر کو کسی بنیادی قسم کے اعتراض کا سبب نہیں بننا چاہیے۔

بلاشبہ ان ساری مثبت تبدیلیوں کے بعد بھی آبادی کا ایک حصہ ایسا رہے گا جو کام پر آمادہ نہ ہوگا اور غیر مصروف اور آرام طلب رہے گا۔ اگر یہ حصہ بہت چھوٹا ہو تو پھر اس کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ تساہل پسندوں میں فنکاروں، کتابیں لکھنے والوں اور تجریدی ذہنی امور میں دلچسپی لینے والوں کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ گویا اس گروہ میں وہ لوگ آ جائیں گے جن کو جیتے جی کوئی منہ نہیں لگاتا مگر مرنے کے بعد ان کی پوجا کی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو یہ نادر اور انمول موقع مل جائے گا کہ وہ لوگوں کی طرف سے ان کے فن یا اس کی افادیت کے اعتراف کے بغیر ہی پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھ سکیں۔ کون جانتا ہے کہ کتنے لوگوں کو محنت و مشقت کی چکی نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ہی نہیں دیا۔ کتنے مصور اور کتنے فلسفی ہیں جن کو افلاس نے کچل دیا اور وہ اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کیے بغیر ہی زندگی کے دن کاٹ گئے۔

اب تک ہم نے نراجی منصوبے کے حق میں دلائل دیئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ دلائل یہ دکھانے کے لیے کافی ہیں کہ اگر اس منصوبے پر عمل ہو جائے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے، تاہم ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس منصوبے کو آزمانا دانش مندی کی بات ہوگی۔

تقسیم کے بارے میں نراجی تجاویز کے قابل عمل ہونے کا مسئلہ، بہت سے دوسرے مسائل کی طرح، کمیت کا مسئلہ ہے۔ ان تجاویز کے دو حصے ہیں۔ اول یہ کہ تمام طلب گاروں کو تمام اشیائے صرف بلا رکاوٹ مہیا کی جائیں۔ دوم یہ کہ کسی فرد پر نہ تو کسی کام کی ذمہ داری ڈالی جائے اور نہ ہی کام کے لیے کوئی معاشی صلہ مقرر کیا جائے۔ ان دونوں تجاویز کو الگ الگ کرنا محال ہے، اور نہ ہی وہ نراج پسندی کے پورے نظام کو شامل حال رکھتی ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کے بغیر نراجی نظام ممکن نہ ہو سکے گا۔ جہاں تک ان دونوں میں سے پہلی تجویز کا تعلق ہے، کئی اشیائے صرف کے معاملے میں اس پر اب بھی عمل ہو سکتا ہے۔ کچھ عرصے بعد بہت سی دوسری اشیاء پر بھی اس کا اطلاق ممکن ہو جائے گا۔ یہ ایک لچک پذیر منصوبہ ہے کیونکہ حالات کے مطابق کسی شے کو مفت مہیا جانے والی اشیاء کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے یا اس فہرست سے خارج کیا جا سکتا

ہے۔اس کے بہت سے اور مختلف اقسام کے فائدے ہیں اور لگتا ہے کہ دنیا کا چلن اس سمت میں ہے۔میرے خیال میں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ نراجی نظام کے اس حصے پر رفتہ رفتہ عمل کیا جا سکتا ہے اور یوں ان کی خواہش پر بتدریج پوری طرح عمل کرنے کا مرحلہ آ سکتا ہے۔

جہاں تک دوسری یعنی اس تجویز کا تعلق ہے کہ نہ تو کسی سے اس کی مرضی کے خلاف محنت و مشقت لی جائے اور نہ ہی محنت و مشقت کے لیے کوئی مالی صلہ ہونا چاہیے۔تو میں اس کو زیادہ مشکوک سمجھتا ہوں۔نراج پسند ہمیشہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جب ان کے منصوبوں پر عمل ہوگا تو کم و بیش ہر فرد کام کرنا چاہے گا۔اس تصور کے حق میں عام لوگوں کی رائے سے زیادہ کچھ کہا جا سکتا ہے، پھر بھی اس بارے میں شبہات قائم ہی رہیں گے کہ آیا یہ ایک قابل عمل تجویز ہے۔جس معاشرے میں لوگوں کو معاشی دباؤ کے باعث محنت و مشقت کی عادت ہو چکی ہو، اس میں رائے عامہ غالباً اکثر لوگوں کو کام کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔تاہم یہ امر غیر یقینی ہے کہ آیا اس قسم کی صورتحال مستقل طور پر برقرار رہے گی۔رائے عامہ کو حقیقی طور پر موثر بنانے کی خاطر سماج کو چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم کرنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈنا ضروری ہوگا۔ان میں سے ہر گروپ کو اس کی پیداوار کے مساوی اشیاء استعمال کرنے کی اجازت دینی ہوگی۔اس طرح یہ گروپ معاشی محرک کی گرفت میں آ جائیں گے۔اب چونکہ ان میں سے ہر گروپ چھوٹا ہوگا اس لیے وہ محسوس کرے گا کہ جب اس کا کوئی ایک رکن بھی محنت سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے تو پورے گروپ کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ اس کا اجتماعی حصہ کم ہو جاتا ہے۔اچھا اس قسم کا نظام قابل عمل ہو سکتا ہے مگر یہ نہ بھولیے کہ یہ نراج پسندی کی رُوح کے خلاف ہے اور اس کے معاشی نظام کے بنیادی خطوط کو ملیا میٹ کر دے گا۔

اس مسئلے پر قدامت پسند اشتراکیت کا رویہ نراج پسندی کے رویے سے بہت مختلف ہے۔ ''کمیونسٹ مینی فسٹو'' میں جن زیادہ فوری اقدامات کی وکالت کی گئی ہے، ان میں سب کے لیے محنت کی مساوی ذمہ داری اور صنعتی لشکروں، خاص طور پر زراعت کے لیے، کی تشکیل کے امور شامل ہیں۔اشتراکی نظریہ یہ ہے کہ عموماً محنت ہی محنت سے حاصل ہونے والے ثمرات سے لطف اندوز ہونے کا حق عطا کرتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس معاملے میں استثنائی صورتیں موجود ہیں۔مثال کے طور پر بچوں اور بزرگوں پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔اسی طرح مریضوں کے معاملے میں بھی

رعایت سے کام لینا ہوگا۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی آپ کو یہی سلوک کرنا ہوگا جن کے کام کی معاشرے کو عارضی طور پر ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ان کا اپنا قصور نہیں ہے۔

بہر طور ہمارے زیر بحث مسئلے پر اشتراکیت کا بنیادی موقف یہ ہے کہ محنت کرنے کے اہل تمام افراد کو محنت پر مجبور کیا جائے۔ اس کے لیے بھوکوں مرنے کے خطرے یا پھر فوجداری قانون سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ بلاشبہ اشتراکی نظام میں محنت کی اسی صورت کو تسلیم کیا جائے گا جو حکام کے نزدیک پسندیدہ ہوگی۔ اگر کوئی شخص اشتراکیت یا حکومت وقت کے کسی تصور کے خلاف کتابیں لکھنی شروع کردے تو یقینی طور پر اس کو کام تسلیم نہ کیا جائے گا۔ اسی طرح سرکاری طور پر پسندیدہ سٹائل سے مختلف انداز میں تصویریں بنانے کو بھی کام تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص ڈرامے تیار کرنے کے لیے مرا جارہا ہے تو اس کو سرکاری سنسر کی ترجیحات پر نظر رکھنی ہوگی۔ اثر ورسوخ یا رشوت ستانی کے ذریعے حکام کی خوشنودی حاصل کیے بغیر کوئی نیا خیال یا کوئی نئی سوچ دینے کی اجازت نہ ہوگی۔

اشتراکی ان نتائج کی پیش بینی نہیں کرپاتے۔ اس کی وجہ ان کا یہ وہم ہے کہ اشراکی ریاست پر اسی قسم کے لوگ حکمران ہوں گے جس قسم کے لوگ آج کل اس کی وکالت کررہے ہیں۔ یہ واقعی ایک وہم ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ اشتراکی ریاست کے حکمران موجود اشتراکیوں سے اتنی ہی مشابہت رکھتے ہوں گے جتنی کہ آج کل کے چرچ کے صاحبان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں سے رکھتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ کسی غیر مقبول اصلاح کی وکالت عموماً وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو مثالی طور پر بےلوث ہوتے ہیں۔ اور جن کے دلوں میں دوسروں کی خدمت کرنے کا بے مثال ولولہ موجزن ہوتا ہے۔ لیکن جب اصلاحی منصوبہ نافذ ہوجاتا ہے تو پھر ویسے ہی جاہ طلب لوگ اقتدار میں آجاتے ہیں۔ جیسے جاہ طلب ہر زمانے میں قوموں پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ اس قسم کے لوگ کبھی بھی مخالفت کو برداشت کرتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کی آزادی کا احترام کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ نراجی منصوبے میں خطرات مضمر ہیں تو اشتراکی منصوبہ بھی ان سے پاک نہیں ہے۔ اس میں بھی کم از کم اتنے ہی خطرات مضمر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم جن خرابیوں کی پیشن گوئی کرتے رہے ہیں۔ وہ اب واقعی موجود ہیں۔ تاہم اشتراکیوں کا مقصد دنیا کی خرابیوں کا

علاج کرنا ہے۔ وہ اس دلیل پر مطمئن نہیں ہو سکتے کہ وہ چیزوں کو مزید خراب نہ ہونے دیں گے۔

نراج پسندوں کو آزادی کے معاملے میں فوقیت حاصل ہے۔ جب کہ اشتراکیوں کو محنت کی ترغیبات مہیا کرنے میں برتری حاصل ہے۔ کیا ہم ان دونوں نکات کو ملا نہیں سکتے؟ میرے خیال میں تو ہم ایسا کر سکتے ہیں۔

ابھی ہم نے دیکھا کہ اگر اکثر لوگ اعتدال سے محنت کریں اور ان کی محنت اسی قدر بار آور ہو جتنی کہ سائنس اور تنظیم کاری سے ہو سکتی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تمام لوگوں کو ضروریات زندگی مہیا نہ کی جا سکیں۔ ہم کو کوئی خدشہ لاحق تھا تو وہ بس یہ تھا کہ آیا نراجی نظام میں محنت و مشقت کرنے کے محرکات اس قدر طاقتور رہیں گے کہ وہ اکثر لوگوں کو آسانی سے محنت پر آمادہ کر سکیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ معاشی محرک کے خاتمے سے لوگ محنت کرنا چھوڑ دیں گے۔ وہ یہ تو نہیں سوچیں گے کہ اگر زندگی کی ضرورتیں محنت و مشقت کے بغیر ہی پوری ہو سکتی ہیں تو پھر جان کیوں جوکھوں میں ڈالی جائے۔ کام کرنے کے بجائے فراغتوں کے مزے کیوں نہ لوٹے جائیں۔ خیر یہ ایسا مسئلہ نہیں کہ جس سے نمٹنا مشکل ہو۔ چنانچہ آسانی سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کی ضروری اشیاء تو تمام لوگوں کو مفت مہیا کی جائیں لیکن ضرورت سے اوپر کی چیزیں صرف ان لوگوں کو دی جائیں جو محنت و مشقت کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اب کسی وجہ سے محنت کرنے کے قابل نہیں رہے مگر جب ان کو کوئی رکاوٹ پیش نہ تھی تو وہ محنت سے جی نہ چراتے تھے۔ آج کے زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو سرمایہ کاری سے تھوڑی بہت آمدنی ہوتی ہے اور وہ اپنی بنیادی ضروریات پوری کر لیتا ہے تو وہ فارغ ہو کر گھر نہیں بیٹھ رہتا۔ بلکہ کم و بیش ہمیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اشیائے تعیش حاصل کرنے کی خاطر کوئی نہ کوئی معاوضے والا کام تلاش کرتا رہتا ہے۔ ہم فرض کر سکتے ہیں کہ یہاں ہم جس معاشرے کا تصور پیش کرر ہے ہیں۔ اس میں بھی لوگوں کا طرز عمل ایسا ہی رہے گا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص آرٹ، سائنس یا فکر کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے کسی نامانوس کام کو کرنے کی خواہش محسوس کرے گا۔ اس کو اپنی خواہش کی تکمیل کا پورا موقع دیا جائے گا۔ شرط بس یہ ہو گی کہ وہ عیش و عشرت کے بجائے سادہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو۔ جہاں تک چند ایسے لوگوں کا تعلق ہے جو کسی طور کام پر آمادہ نہیں ہوتے اور محنت و مشقت سے بھاگتے

ہیں...... جو آج کے زمانے میں آوارہ گرد یا جوگی وغیرہ بن جاتے ہیں۔ان کو بے ضرر قسم کی زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے گا۔البتہ ان کو یہ موقع نہ دیا جائے گا کہ وہ اپنی تعداد میں اس قدر اضافہ کرلیں کہ وہ محنت ومشقت کرنے والوں پر بار گراں بن کررہ جائیں۔اس طریقے سے آزادی کے تقاضوں کو محنت مشقت کے کسی معاشی محرک کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔میرے خیال میں اس ملاپ سے وجود میں آنے والا نظام خالص نراج پسندی یا خالص قدامت پسند اشتراکیت کے مقابلے میں کامیابی کے کہیں زیادہ امکانات کا حامل ہوگا۔۔

ہم یہاں جس منصوبے کی وکالت کر رہے ہیں اس کو روزمرہ کی زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ضروریات زندگی پوری کرنے والی ایک خالص حد تک چھوٹی آمدنی کو تمام لوگوں کے لیے یقینی بنایا جانا چاہیے۔تمام لوگوں میں وہ لوگ آجاتے ہیں جو کام کرتے ہیں اور وہ بھی جو کام نہیں کرتے ہیں۔اس سے زیادہ آمدنی کے حق دار وہ لوگ ہوں گے جو کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس کو معاشرہ مفید سمجھتا ہے۔یہ محض بنیاد ہے۔اس پر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔میرے خیال میں اس کام کے لیے ہمیشہ زیادہ معاوضہ ادا کرنا ضروری ہے جس کے لیے زیادہ مہارت درکار ہوتی ہے یا جس کو سماجی طور پر زیادہ مفید سمجھا جاتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ عام کام کے مقابلے میں اس قسم کا کام زیادہ دلچسپ ہوتا ہے اور اس کا احترام بھی زیادہ کیا جاتا ہے۔لہٰذا اہلیت رکھنے والے لوگ اس قسم کا کام کرنے کو ترجیح دیتے رہیں گے۔تاہم مثال کے طور پر ہم ان لوگوں کو درمیانی قسم کا معاوضہ دے سکتے ہیں جو محنت کے معمول کے گھنٹوں سے نصف وقت تک کام کرنا چاہیں گے۔ اس طرح ہم ان لوگوں کو دوسروں سے نسبتاً زیادہ معاوضہ دے سکتے ہیں جو ناپسندیدہ یا ناگوار کام کرنے پر تیار ہوں۔

اس قسم کا نظام اشتراکیت سے مکمل طور پر موافق ہے البتہ نراج پسندی سے اس کی مطابقت مشکل ہی ہے۔

❁

سائنس اور ثقافت

اخبارات کے عام قاری کے لیے سائنس سے مراد کمپیوٹر، ٹیلی ویژن، ہوائی جہاز اور اس قسم کی دیگر سنسنی خیز کامیابیاں ہیں، لیکن میں یہاں سائنس کے اس پہلو پر کچھ کہنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس پہلو میں سائنس ایسے بے ربط ٹکڑوں پر مشتمل ہوتی ہے کہ جن میں لوگوں کی دلچسپی جدید تر اشیاء کی آمد تک ہی قائم رہتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی سائنس کی یہ ایجادات صبر آزما طریقوں سے مرتب ہونے والے علم کے اس نظام کے بارے میں کچھ نہیں بتاتیں جس میں سے کم وبیش اتفاقی حادثے کی وجہ سے عملی طور پر ایسے مفید نتائج سامنے آجاتے ہیں جو عام لوگوں کے لیے گہری دلچسپی کا باعث بن جاتے ہیں۔

سائنس کی وجہ سے فطرت پر ہماری گرفت بڑھتی چلی جارہی ہے۔ بلاشبہ یہ گرفت سائنسی تحقیق کو جاری وساری رکھنے کا کافی جواز ہے مگر اس جواز کا بہت چرچا ہوتا ہے اور اس کو یوں بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کہ دوسرے جواز نظر انداز ہونے لگتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دوسرے جواز کم اہم نہیں ہیں۔ میں یہاں سائنسی تحقیق کو جاری رکھنے کے ان دوسرے اسباب کا ذکر کروں گا۔ خاص طور پر میں ہمارے عالمی نقطہ نظر کی تشکیل میں ذہن کی سائنسی عادت کو عینی اہمیت پر کچھ کہنا چاہوں گا۔

جدید اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی تاریخ میں وائرلیس ٹیلی گرافی، سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ہم اس کی مثال لیتے ہیں۔ وہ ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں پائے جانے والے فرق کو اچھی طرح نمایاں کردیتی ہے۔ اس ایجاد کو ممکن بنانے کے لیے جس قدر سنجیدہ قسم کی ذہنی محنت درکار تھی، وہ کم وبیش سب کی سب تین افراد نے کی۔ ان کے نام فراڈے، میکس ویل اور برنز ہیں۔ ان صاحبان نے الیکٹرو میگنیٹزم کا جدید نظریہ ترتیب دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے روشنی اور الیکٹرو

میگنیٹک لہروں کی عینیت کو ظاہر کیا۔ان کا دریافت کردہ نظام بے حد ذہنی دلچسپی کا حامل ہے۔ یہ سارا کام اجتماعی ذہنی قوت کا ایک ایسا مظاہرہ کرتا ہے جس پر فیاض روحیں خوشی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ان صاحبان کی دریافتوں کو ٹیلی گرافی کے عملی نظام کے لیے استعمال کرنے کی خاطر کئی میکانکی تفصیلات کو موافق بنانے کا کام باقی رہ گیا تھا۔ یہ کوئی سادہ اور آسان کام نہ تھا۔اس کے لیے مخترعانہ تدبیر اور اختراع پسندی درکار تھی۔

عام طور پر اس امر کو غیر متنازعہ سمجھا جاتا تھا کہ ذہن کی ترتیب کے لیے اور ثقافت کی تشکیل کر نے والے باعلم اور غیر شخصی رویئے کو فروغ دینے کے لیے ادبی تعلیم سائنس پر مبنی تعلیم سے اعلیٰ تر ہو تی ہے۔ یہاں تک کہ سائنس کے سرگرم حامی بھی یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ثقافت کو افادیت کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتے۔ ثقافت کا احترام کرنے والے سائنس دان بھی جب کلاسیکی علوم کے ماہرین سے ملتے ہیں تو مان لیا کرتے ہیں کہ ان کا علم، یعنی سائنس کلاسیکی اور انسانی علوم سے کسی قدر کم درجے کی شے ہے۔ یہ اعتراف وہ محض تکلف سے نہیں کرتے بلکہ دل سے اس بات کو مانتے ہیں۔ جب تک سائنس دانوں میں یہ رویہ موجود ہے وہ اپنی توثیق کرتا رہے گا۔ وہ یاد دلاتا رہے گا کہ سائنس کے داخلی طور پر قابل قدر پہلو محض مفید امور کے لیے قربان کر دیئے جاتے ہیں اور اس منظم سرد ئے کو قائم رکھنے پر کم ہی توجہ دی جاتی ہے۔ جس کے ذریعے ذہن کا اعلیٰ تر معیار تشکیل پاتا ہے اور اس کو مزید فروغ بھی ملتا ہے۔

بہر طور سائنس کی مفروضہ تعلیمی قدر میں اگر واقعی کوئی کمتری موجود ہے تو میں یہ کہوں گا کہ یہ خود سائنس کا قصور نہیں ہے بلکہ یہ اس روح کا قصور ہے جس کے مطابق سائنس کا درس دیا جاتا ہے ۔سائنس پڑھانے والے اگر اس کے جملہ امکانات کو محسوس کریں تو پھر مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ ترین ذہنی خوبیاں پیدا کرنے والی ذہنی عادتوں کو پروان چڑھانے کی صلاحیت کم از کم ضرور ہے جتنی کہ ادب میں ہے۔اور خاص طور پر یونانی اور لاطینی ادب میں ہے۔ یہ بات کہہ کر میں کلاسیکی تعلیم کی تحقیر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں خود اس کے فوائد سے مستفید نہیں ہوا ہوں۔ یونانی اور لا طینی مصنفین کے بارے میں میرا کم وبیش تمام علم ان کے تراجم کا مرہون منت ہے، لیکن مجھے اس بارے میں قطعی کوئی شبہ نہیں ہے کہ یونانی اس تمام تعریف کے بجا طور پر حقدار ہے جو ان کی کی جاتی ہے اور یہ کہ یونانی مصنفین سے بے خبری بہت بڑا اور سنجیدہ قسم کا نقصان ہے۔ یہاں میں اپنا

استدلال ان پر نکتہ چینی کی بجائے سائنس کی فراموش شدہ خوبیوں کی طرف توجہ دلا کر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کلاسیکی تعلیم میں ایک خامی تو ایسی ہے کہ وہ خلقی لگتی ہے۔ اور وہ خامی یہ ہے کہ کم وبیش سارا زور ہی ماضی پر دے دیا جاتا ہے، جو صورت حال مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے اور جس کا احیاء ممکن نہیں ہے، اس کے مطالعے سے حال اور مستقبل کے بارے میں تنقید کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ زمانہ حال کی خوبیوں پر ماضی کا مطالعہ توجہ نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یونانی تہذیت کے طالب علم ان خوبیوں سے آسانی کے ساتھ بے نیاز اور بے خبر ہو جاتے ہیں۔ نئی اور فروغ پذیر اشیاء گنوار، بھونڈی اور گھٹیا محسوس ہونے لگتی ہیں اور وہ حساس ذوق کے حامل شخص کے لیے صدمے کا باعث بنتی ہیں۔ وہ ان سے بیزار ہو کر ماضی کے گنبد میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ کسی خوبی کو اس کے خاتمے سے پہلے تسلیم نہ کرنے کی عادت عام طور پر مکمل کتابی زندگی سے پیدا ہو جاتی ہے۔ مکمل طور پر ماضی پر مبنی ثقافت ترقی کی راہیں مسدود کر دیتی ہے۔ مردہ پرست ثقافت آگے نہیں بڑھ سکتی۔ وہ بانجھ ہو جاتی ہے۔ اس کے پھلنے پھولنے کی صلاحیتیں فنا ہو جاتی ہیں۔

مشرق اور مغرب میں ہر جگہ ماضی اور مستقبل کے علمبردار دونوں کی خوبیوں کو یکجا کرنے کے بجائے ایک دوسرے کے ساتھ ختم نہ ہونے والی لڑائی میں الجھے رہتے ہیں۔

یہ فکر نہ صرف یونان و روم کی قدیم ادبیات کے بلا شرکت غیرے مطالعے کے خلاف بلکہ ثقافت کی ہر اس صورت کے خلاف بھی احتجاج کرتی ہے جو جامد و ساکن، روایتی اور محض علمی ہو کر رہ گئی ہو۔ چنانچہ یہ فکر ناگزیر طور پر ہم کو اس سوال کی طرف لے جاتی ہے کہ تعلیم کا حقیقی مقصد کیا ہے؟ تاہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرنے سے پہلے یہ مناسب بات ہوگی کہ ہم یہ جان لیں کہ یہاں ''تعلیم'' سے ہماری مراد کیا ہے اور ہم اس لفظ کو کس مفہوم میں استعمال کر رہے ہیں۔ میں اس کو تعلیم کے دو دوسرے مفاہیم سے ممتاز کروں گا۔ یہ دونوں بھی بالکل جائز مفاہیم ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارے مفہوم سے وسیع تر ہے جب کہ دوسرا اس کے مقابلے میں محدود ہے۔

وسیع تر مفہوم میں تعلیم سے مراد محض وہ کچھ نہیں ہے جو ہم درس و تدریس کے ذریعے حاصل کرتے ہیں بلکہ اس میں وہ سب کچھ بھی شامل کر لیا جاتا ہے جو ہم ذاتی تجربے کے ذریعے سیکھتے ہیں --- گویا اس سے مراد زندگی کے درس کے ذریعے کردار کی تشکیل ہے۔ تعلیم کا یہ پہلو بلا شبہ

بہت اہم ہے۔تاہم میں یہاں اس کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا کیونکہ یہ معاملہ اٹھانے سے ایسے موضوعات سامنے آجائیں گے۔جن کا ہمارے زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

محدود تر مفہوم میں تعلیم سے مراد محض وہ کچھ نہیں جو ہم درس و تدریس کے ذریعے حاصل کرتے ہیں بلکہ اس میں وہ سب کچھ بھی شامل کرلیا جاتا ہے جو ہم ذاتی تجربے کے ذریعے سیکھتے ہیں--- گویا اس سے مراد زندگی کے درس کے ذریعے کردار کی تشکیل ہے۔تعلیم کا یہ پہلو بلاشبہ
بہت اہم ہے۔تاہم میں یہاں اس کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا کیونکہ یہ معاملہ اٹھانے سے ایسے موضوعات سامنے آجائیں گے۔جن کا ہمارے زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

محدود تر مفہوم میں تعلیم کو درس و تدریس تک محدود رکھا جاسکتا ہے۔اس مفہوم میں ہم یہ کہیں گے کہ تعلیم سے مزید مختلف موضوعات پر معین معلومات کی فراہمی ہے کیونکہ اس قسم کی معلومات روزمرہ کی زندگی میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔ابتدائی تعلیم ---یعنی پڑھنا ،لکھنا اور حساب کتاب ---کم وبیش مکمل طور پر اسی ذیل میں آتی ہے۔اچھا یہ تدریس اہم تو ہے،لیکن یہ اس قسم کی تعلیم نہیں جس کا ہم یہاں ذکر کرنے والے ہیں۔

یہاں تعلیم سے جو شے میری مراد ہے،اس کو میں تدریس کے ذریعے چند خاص قسم کی ذہنی عادات ،ایک خاص قسم کے تصور حیات اور نظریہ جہان کی تشکیل قرار دے سکتا ہوں۔ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کس قسم کی ذہنی عادات اور کس قسم کے نقطہ نظر کی توقع درس و تدریس کے نتیجے کے طور پر کی جاسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے بعد ہم یہ طے کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ ہماری پسندیدہ عادات اور نقطہ نظر کی تشکیل میں سائنس کیا کردار ادا کرسکتی ہے۔

ہماری زندگی کا محور چند بنیادی جبلتیں اور محرکات ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد بہت کم نہیں ہوتی۔صرف وہی چیزیں ہمیں پسندیدہ اور اہم محسوس ہوتی ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طور ان جبلتوں اور محرکات سے ہوتا ہے۔کوئی ایسی فطری استعداد نہیں ہوتی جس کو عقل یا نیکی یا اس قسم کا کوئی اور نام دیا جاسکے اور جو ہماری فعال زندگی ،امیدوں اور خدشوں کو اس دائرے سے نکال سکے جس پر تمام خواہشوں کو پیدا کرنے والے ان بنیادی عوامل کی گرفت ہوتی ہے۔ان سب کی مثال شہد کی مکھیوں کی ملکہ جیسی ہوتی ہے جس کے ماتحت مکھیاں چھتے کو شہد سے بھر دیتی ہیں ،مگر ملکہ جب چھتے کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو مکھیاں نڈھال ہو جاتی ہیں اور مر جاتی ہیں اور چھتہ متوقع شہد سے خالی ہو

جاتا ہے۔

ہر مہذب فرد میں ہر بنیادی محرک کا یہی عالم ہوتا ہے۔ اس محرک کے گرد اس سے جنم لینے والی ثانوی خواہشوں کا ہجوم بن جاتا ہے۔ وہ فرد کو متحرک رکھتی ہیں۔ وہ زندگی کے پھولوں سے ان کی مٹھاس چوستا چلا جاتا ہے، لیکن اگر وہ بنیادی محرک فنا ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس سے متعلقہ ثانوی خواہشیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ یوں زندگی کا ایک پورا گوشہ ویران ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے جو کچھ پُر جوش اور ولولہ انگیز تھا اور جس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ذہن میں کوئی شکوک و شبہات سر نہ اٹھاتے تھے، اب وہی کچھ خشک و ویران، بے فائدہ اور واہیات محسوس ہونے لگتا ہے۔ مایوسی کے گہرے احساس کے ساتھ ہم پوچھتے ہیں کہ زندگی کا مطلب کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ تب شاید ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ یہ سب کچھ فضول اور بے معنی ہے۔ کسی خارجی مفہوم کی تلاش جو کسی باطنی ردعمل کو اجاگر کر سکے، ہمیشہ ہی ناکام رہتی ہے۔ بات یہ ہے کہ تمام مفہوم کو لازمی طور پر ہماری بنیادی خواہشوں سے منضبط ہونا چاہیے۔ بنیادی خواہشیں ہی معدوم ہوں یا دم توڑ چکی ہوں، تو پھر کوئی معجزہ بھی دنیا کی وہ قدر بحال نہیں کر سکتا جو ان خواہشوں نے اس کو عطا کر رکھی تھی۔

گویا تعلیم کوئی ایسا بنیادی محرک تخلیق نہیں کر سکتی جس سے غیر تعلیم یافتہ فرد محروم ہو۔ مقصد بس یہ ہو سکتا ہے کہ انسانی فطرت کے مہیا کردہ محرکات کے زیر اثر پیدا ہونے والے خیالات کی تعداد اور ان کی بوقلمونی کو بڑھا کر ان محرکات کا دائرہ وسیع کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کیا جائے کہ سب سے زیادہ پائیدار قسم کی تسکین کہاں تلاش کرنی چاہیے۔ جدید دور میں ''فطری آدمی'' کو کوئی ناگوار اور خطرناک قسم کی شے سمجھا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں اس واضح قسم کی سچائی سے غلط مفہوم منسوب کیے جاتے ہیں۔ غلط طور پر ''فطرت'' سے مراد تمام نفیس اور اعلیٰ خوبیوں کی نفی لی جاتی ہے۔ یوں بچوں کو نیکی اور خوبی کا علم دینے کی تگ و دو میں ان کو بھرپور انسان بنانے کے بجائے بل دار منافق بنا دیا جاتا ہے۔ نفسیات کا بہتر علم موجودہ نسل کو تعلیم کے شعبے میں ہونے والی اس قسم کی غلطیوں سے بچانے لگا ہے، لہٰذا ہم کو اس امر کی ضرورت نہیں رہی کہ ہم اس نظریے پر زیادہ وقت صرف کریں کہ تعلیم کا مقصد فطرت کا انسداد ہے یا اس کی راہ روکنا ہے۔

یہ تو ہم نے مان لیا ہے کہ فطرت ہی ہے جو خواہش کی بنیادی قوت مہیا کرتی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وحشی انسان کی طرح مہذب انسان میں بھی فطرت محرکات کے جوش و جذبات سے مغلوب ہو جانے والے، شکستہ و متفرق اور تند و تیز مجموعے سے عبارت ہوتی ہے۔ ہر محرک میں غور و فکر اور علم کا ایک عنصر بھی شامل حال ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے محرکات کے تصادم کا پہلے سے اندازہ کر لیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں متحد کرنے والے محرک کے ذریعے عارضی یا وقتی محرکات کو کنٹرول بھی کیا جاتا ہے۔ اسے متحد کرنے والے محرک کو ہم ''دانش'' کا نام دے سکتے ہیں۔ اس طریقے سے تعلیم جبلت کے گنوار پن کو ختم کرتی ہے اور علم کے وسیلے سے خارجی دنیا کے ساتھ فرد کے رابطوں کی بوقلمونی اور قدر و قیمت بڑھا دیتی ہے۔ اس طرح وہ الگ تھلگ لڑنے والی وحدت نہیں رہتا بلکہ دنیا کا شہری بن جاتا ہے۔ اس کی دلچسپیوں کے دائرے میں دور دراز کی قومیں، فضا کے دُور افتادہ حصے اور ماضی و مستقبل کے دور دراز کے معاملات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ بیک وقت وقوع پذیر ہونے والی خواہشوں کی شدت میں یہ کمی اور اس کے دائرے میں توسیع ہی اصل میں تعلیم کا بڑا اخلاقی مقصد ہیں۔

تعلیم کا ایک اور خالص عقلی مقصد اس اخلاقی مقصد سے منضبط ہے۔ اس کا تعلق ہم کو دنیا کو معروضی انداز میں دیکھنے اور تصور کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم محض اپنی ذاتی خواہشوں کے مسخ کرنے والے وسیلے کے بجائے، جہاں تک ممکن ہو، دنیا کو ویسے ہی دیکھیں جیسی کہ وہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مکمل طور پر معروضی نقطۂ نظر کا حصول محض ایک آدرش ہے، ہم زیادہ سے زیادہ معروضیت پا سکتے ہیں، مگر مکمل معروضیت کا حصول محال ہے۔

تعلیم کو ہماری ذہنی عادات اور ہمارا جہانی نظریہ بنانے کا عمل قرار دیا جائے تو پھر اس کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جائے گا کہ تعلیم کا عمل ہم کو اس آدرش کے کس قدر قریب لے جاتا ہے۔ گویا ہم کو یہ طے کرنا ہو گا کہ وہ معاشرے میں ہمارے مقام، تمام انسانی معاشرے کے اس کے غیر انسانی ماحول اور ہماری خواہشوں اور دلچسپیوں سے ہٹا کر غیر انسانی دنیا کا فہم حاصل کرنے میں ہماری کس قدر مدد کرتا ہے۔ اس معیار کو قبول کر لیا جائے تو پھر ہم سائنس پر توجہ دے سکتے ہیں اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ سائنس اس مقصد میں ہماری کس قدر مدد کرتی ہے اور یہ کہ آیا وہ تعلیمی عمل میں اپنے رقیبوں سے کسی اعتبار سے اعلیٰ تر ہے۔

(2)

ادب اور فن کے برخلاف سائنس دو متضاد اور پہلی نظر میں متصادم نظر آنے والی خوبیوں کی حامل ہے۔ پہلی خوبی فطری طور پر ضروری نہیں ہے، مگر ہمارے زمانے میں بلاشبہ موجود ہے۔ ان دونوں میں سے پہلی خوبی انسانی کامیابی کے بارے میں امید ہے۔ یہ خوبی اور اس سے پیدا ہونے والا رجائی نقطۂ نظر سائنس کے ایک اور پہلو کے اس نتیجے کو روک دیتا ہے جو بصورت دیگر یاس انگیز ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ بھی خوبی ہے اور میں یہاں تک کہوں گا کہ شاید یہ اس کی عظیم ترین خوبی ہے۔۔۔ میری مراد سائنسی سچائی کے معاملے میں انسانی جذبوں اور اس کے جملہ موضوعی آلات سے لاتعلقی ہے۔ سائنس کے مطالعے کو ترجیح دینے کے یہ تمام اسباب تشریح طلب ہیں۔ آیئے ہم پہلے سے آغاز کریں۔

ادب یا فن کا مطالعہ کرتے ہوئے ہماری توجہ ماضی پر اٹکی رہتی ہے۔ ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ یونان یا نشاۃ ثانیہ کے لوگ آج کے لوگوں سے بہتر تھے۔ پرانے وقتوں کی کامیابیاں ہمارے اپنے زمانے کی کامیابیوں کو سہارا دینے کے بجائے درحقیقت آج کے زمانے میں کوئی کارنامہ سرانجام دینے کو زیادہ مشکل بنا دیتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ فنکارانہ کامیابی افزائش پذیر معلوم نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی لگتا ہے کہ اس کا دارومدار محرک اور بصیرت کی ایک خاص قسم کی تازگی اور سادہ لوحی پر ہے جس کو تہذیب تباہ کرنے پر تلی رہتی ہے۔ اس قسم کے طرز احساس کی وجہ سے ہوتا یہ ہے کہ جن لوگوں کی تعلیم و تربیت پرانے زمانوں کی فنی اور ادبی تخلیقات پر ہوتی ہے، وہ ایک خاص قسم کی نازک مزاجی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ زمانہ حال سے ان کو بے زاری ہو جاتی ہے۔ اس سے فرار کی راہ جانی بوجھی تہذیب سوزی کے سوا دکھائی نہیں دیتی جو روایت کو نظر انداز کرتی ہے اور نئے پن کی تلاش میں انوکھے پن تک جا پہنچتی ہے۔ لیکن اس قسم کی تہذیب سوزی میں اس سادگی اور بے ساختگی کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا جس بڑا فن جنم لیتا ہے۔

فنی تخلیق کے سوا کسی اور ذہنی سرگرمی کو نمایاں نہ کرنے والی تعلیم سے جو مایوسی پیدا ہوتی ہے، اس سے وہ تعلیم بالکل محفوظ ہے جو سائنسی طریقہ کار کا علم مہیا کرتی ہے۔ سائنسی طریقہ کار کی دریافت، ریاضی محض کے دائرے سے باہر، ابھی کل کی بات ہے۔ چلئے سرسری طور پر بات کرتے

ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ابتدا گلیلیو کے زمانے سے ہوئی۔ اس مختصر مدت کے باوجود اس نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے اس کی کامیابیوں کی رفتار تیز ہوتی جارہی ہے۔ لوگوں نے سائنس میں بہت ہی اعلیٰ قدر و قیمت کی سرگرمی کو دریافت کرلیا ہے جس میں وہ فن کی طرح ترقی کے لیے مسلسل اعلیٰ تر ہونے والے نابغہ کے محتاج نہیں رہے۔ فن اور ادب کے برخلاف سائنس کی ترقی ایک مسلسل عمل ہو جاتی ہے۔ اس میں بعد کے زمانوں میں آنے والے لوگ اپنے پیش رو لوگوں کے کندھوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ سائنس میں ہوتا یہ ہے کہ کسی عظیم ذہانت و فطانت رکھنے والے شخص نے ایک طریقہ ایجاد کرلیا ہے تو کمتر صلاحیتوں والے ہزاروں لوگ اس طریقے کو استعمال کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سائنس کے شعبے میں مفید دریافتیں کرنے کے لیے کسی ماورائی قسم کی صلاحیتیں درکار نہیں ہوتیں۔ سائنس کی حویلی کو مستریوں اور مزدوروں کے ساتھ ساتھ داروغوں اور تعمیراتی ماہروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ فن کی دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ غیر معمولی اختراعی قابلیت کے بغیر سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔ سائنس میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کی دنیا میں معمولی صلاحیت رکھنے والا فرد بھی کسی بڑی کامیابی میں شریک ہوسکتا ہے۔

سائنس کی دنیا میں حقیقی نابغہ وہ ہے جو کوئی نیا طریقہ کار ایجاد کرتا ہے۔ شاندار دریافتیں عموماً جانشینوں کے حصے آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ نئے طریقہ کار کو زیادہ وسوسے سے استعمال کرسکتے ہیں اور ان کو اس نئے طریقہ کار کی خامیاں دور کرنے پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں پڑتا۔ مزید برآں ان کے کام کے لیے اس قدر ذہنی صلاحیتیں درکار نہیں ہوتیں جس قدر کہ کوئی نیا طریقہ کار ایجاد کرنے کے لیے مطلوب ہوتی ہیں۔ سائنس کی دنیا میں بے شمار قسم کے مختلف طریقے ہیں جو مختلف قسم کے مسائل کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ تاہم ان سب کے علاوہ کوئی ایسی شے بھی ہے جس کو آسانی سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خیر، آپ اس کو سائنس کا خصوصی طریقہ کار یا منہاج کہہ سکتے ہیں، ماضی میں اس کو استقرائی طریقہ کار بھی کہا جاتا تھا اور اس کا تعلق فرانسس بیکن سے جوڑا جاتا تھا۔ تاہم حقیقی استقرائی طریقہ کار بیکن نے دریافت نہیں کیا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ سائنس کے حقیقی طریقہ کار میں استخراج بھی اس قدر شامل ہے جس قدر کہ استقرا۔ یہی نہیں بلکہ منطق اور ریاضی بھی اسی قدر شامل ہیں جس قدر نباتات اور ارضیات۔ میں یہاں سائنسی طریقہ کار کی وضاحت کرنے کا مشکل کام اپنے ذمے نہیں لینا چاہتا۔ تاہم میں اس ذہنی مزاج کی

طرف اشارہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں جس میں سے سائنسی طریقہ کار پیدا ہوتا ہے۔ یہ مزاج ان دو خوبیوں میں سے دوسرا ہے جن کا ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ خوبیاں سائنسی تعلیم سے تعلق رکھتی ہیں۔

سائنسی نقطہ نظر کا مرکزی نقطہ اس قدر سادہ، واضح، پیش پا افتادہ بلکہ یوں کہیے کہ گھسا پٹا ہے کہ اس کا ذکر کرنے سے مذاق اڑایا جانے لگے۔ چلئے میں آپ سے اس کا ذکر کر ہی دیتا ہوں تو یہ جان لیجئے کہ سائنسی نقطہ نظر کا مرکزی نکتہ، یا سائنسی نقطہ نظر کی بنیاد اور جڑ یہ ماننے سے انکار کرنا ہے کہ ہماری اپنی خواہشیں، ذوق اور مفادات دنیا کا فہم حاصل کرنے کی کنجی مہیا کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تسلیم کرنے انکار کرنا ہے کہ ہماری خواہشیں، احساسات اور مفادات اس دنیا کو سمجھنے کا وسیلہ ہے۔ سائنسی نقطہ نظر کی اس سادگی سے وضاحت کی جائے تو وہ گھسی پٹی بدیہی صداقت کے سوا کچھ نہیں لگتا، لیکن جذباتی انگیخت پیدا کرنے والے معاملات میں اس نکتے کو مسلسل پیش نظر رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب دستیاب شہادت غیر یقینی اور غیر نتیجہ خیز ہو۔ آیئے، اس بات کی وضاحت کے لیے ہم چند مثالوں کا سہارا لیں:

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ارسطو کا خیال تھا کہ ستاروں کے لیے دائروں میں حرکت کرنا لازم ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ دائرہ مکمل ترین خم ہوتا ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ مخالف نقطہ نظر کی حمایت میں کوئی شہادت نہ ہونے کی بنا پر ارسطو نے ایک واقعاتی مسئلہ کو جمالیاتی اور اخلاقی بنیادوں پر حل کر لیا۔ تاہم اس معاملے میں ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ ارسطو کا استدلال غلط تھا۔ اب ہم کو معلوم ہے کہ اجرام فلکی کی حرکت کا راستہ کس طرح دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ دائرے کی شکل میں ہرگز حرکت نہیں کرتے۔ ان کی حرکت حقیقی طور پر بیضوی بھی نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی آسانی سے بیان کرنے کے قابل خم میں حرکت نہیں کرتے۔ کائنات میں طرز عمل کی سادگی کی تمنا کرنے والوں کے لیے یہ بات ناگوار ہو سکتی ہے لیکن ہم کو معلوم ہے کہ فلکیات کی سائنس میں اس قسم کی تمناؤں اور آرزوؤں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب یہ علم ہم کو بے زحمت اور آسانی سے قابل حصول لگتا ہے، مگر یہ سائنسی طریقہ کار کے اولین موجدوں اور خصوصاً گلیلیو کی جرات مندی اور بصیرت کی عطا ہے۔

دوسری مثال کے طور پر ہم مالیتھوس کا نظریہ آبادی لے سکتے ہیں۔ یہ مثال زیادہ موثر ہے

کیونکہ اب عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اس کا حقیقی نظریہ غلط ثابت ہو جانے کے باوجود مالیتھوس نے جو طریقہ کار استعمال کیا تھا اور اس کا جو اپنا انداز فکر تھا، اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ ڈارون نے اپنے فطری انتخاب کے نظریئے کا ایک اہم حصہ مالیتھوس کے نظریئے سے ہی حاصل کیا تھا اور وجہ اس کی یہ تھی کہ مالیتھوس کا نقطہ نظر حقیقی طور پر سائنسی تھا۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو تعریف یا الزام آرائی کا معروض نہیں بناتا بلکہ اس کو فطرت کا جزو سمجھتا ہے۔ وہ انسان کو ایسی شے سمجھتا ہے جو محض طرز عمل اور کردار کی حامل ہے۔ جس سے بعض مضمرات لازم طور پر برآمد ہوتے ہیں۔ اچھا، اب اگر انسان کا رویہ یا طرز عمل وہ نہیں جیسا کہ مالیتھوس نے فرض کیا تھا اور مضمرات بھی وہ نہیں جو اس نے اخذ کیے تھے، تو پھر صاف طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ مالیتھوس نے جو نتائج اخذ کیے، وہ درست نہ تھے لیکن اس سے اس کے طریقہ کار کی قدر و قیمت کو کوئی ضعف نہیں پہنچتا۔ اس کے نظریئے کی اشاعت کے بعد اول اول جو اعتراضات اس پر کیے گئے تھے، وہ عجیب وغریب تھے، چنانچہ یہ کہا گیا تھا کہ اس کا نظریہ مہیب اور یاس انگیز ہے، کسی نے یہ بھی نکتہ اٹھایا تھا کہ انسانوں کا رویہ ویسا نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ مالیتھوس نے فرض کیا ہے۔ اس قسم کے اور بھی کئی اعتراضات تھے۔ اور وہ سب کے سب ذہن کے غیر سائنسی رویوں پر دلالت کرتے تھے۔ ان کے برخلاف مالیتھوس کا انسان کو فطری مظہر قرار دینے کا پرسکون عزم انقلاب فرانس اور ارٹھارہویں صدی کے مصلحین کے مقابلے میں ایک اہم پیش رفت کی نشاندہی کرتا ہے۔

ڈارون ازم کے زیر اثر انسان کے بارے میں سائنسی رویہ اب بھی خاصا عام ہو چکا ہے۔ بعض لوگ اس رویئے کو بالکل فطری خیال کرتے ہیں تاہم بہت سے ایسے ہیں جو اب بھی اس رویئے کو مشکل اور مصنوعی عقلی بگاڑ قرار دیتے ہیں۔ بہر حال علم کا ایک شعبہ اب بھی ایسا ہے کہ جس کو سائنسی روح کی ہوا تک نہیں لگی۔ اس سے میری مراد فلسفہ ہے۔ فلسفی اور عوام یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کے حقیقی طور پر اہم مسائل سے سائنسی روح کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ جس طرح شیطان کے لئے مقدس تحریروں سے حوالے دے سکتے ہیں، اسی طرح فلسفی بھی سائنس سے حوالے دے سکتا ہے، مگر سائنسی رویئے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جاننے کی خواہش کے مفادات کے مقابلے میں باقی خواہشوں کو پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ وہ امیدوں، خوفوں، محبتوں، نفرتوں اور ساری مصنوعی جذباتی زندی کو دبا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم چیزوں کو اپنی امنگوں اور تعصبات سے ہٹ

کر دیکھنے کی تگ و دو کرنے لگتے ہیں۔

فلسفے کی دنیا میں ابھی تک اس قسم کا رویہ پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ کائنات کو ایک کل کے طور پر قیاس کرنے کی کم و بیش تمام کوششوں میں ایک خاص قسم کی محویت ذات کا عنصر موجود رہا ہے۔ یہ عنصر نجی نہیں، بلکہ انسانی ہے۔ ذہن یا اس کے کسی حصے، مثلاً فکر، ادراک یا ارادہ کو ایسا نمونہ قرار دیا جاتا ہے جس کی بنیاد پر کائنات کو تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس رویے کی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ اس قسم کی کائنات اجنبی اور عجیب دکھائی نہ دے گی اور ہم کو یہ سکون بخش احساس عطا کرے گی کہ ہر مقام گھر جیسا ہی ہے۔ کائنات کو بنیادی طور پر ترقی پذیر یا لازمی طور پر زوال پذیر تصور کرنے کا مطلب اپنی امیدوں اور خوفوں کو کائناتی اہمیت عطا کرنا ہے۔ یہ کوشش بجا ہو سکتی ہے۔ تاہم ابھی تک ہمارے پاس اس کو بجا خیال کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ جب تک ہم اس کے بارے میں اخلاقی لحاظ سے بے لاگ اصطلاحوں میں سوچنا نہ سیکھیں گے، تب تک ہم فلسفے میں سائنسی رویہ پیدا نہ کر سکیں گے۔ یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ اس قسم کا رویہ حاصل کرنے تک ہم مشکل ہی سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ فلسفہ کوئی ٹھوس نتائج حاصل کر سکتا ہے۔

ابھی تک میں نے زیادہ تر سائنسی روح کے منفی پہلو پر بات کی ہے، تاہم اس کی قدر و قیمت مثبت پہلو سے اخذ ہوتی ہے۔ تعمیر پسندی کی جبلت، جو کہ فن کارانہ تخلیق کا ایک بڑا محرک ہے، کسی رزمیہ نظم کے مقابلے میں زیادہ تسکین سائنسی نظام سے حاصل کر سکتی ہے۔ بے لاگ تجسس جو کہ کم و بیش ذہنی جدو جہد کا سر چشمہ ہے، وہ تعجب انگیز مسرت کے ساتھ یہ دیکھتا ہے کہ سائنس ایسے بھیدوں کو بھی افشا کر سکتی ہے جو کہ نا قابل دریافت محسوس ہوتے رہے ہیں۔ عظیم تر زندگی اور وسیع تر دلچسپیوں کی آرزو ہو یا تجی حالات اور یہاں تک پیدائش و موت کے بار بار رونما ہونے والے چکر سے نجات کی خواہش بھی، ان سب کی تسکین، کسی اور شے کے مقابلے میں سائنس کے غیر شخصی کائناتی نقطہ نظر میں زیادہ ہوتی ہے۔ شاندار کامیابی کی تحسین اور انسانی نسل کے لیے بے پناہ افادیت کے احساس کو بھی صاحب سائنس کی خوشیوں میں اضافہ کرنے والے عوامل کے طور پر شامل کر لینا چاہیے۔ گویا سائنس کے لئے وقف شدہ زندگی خوشیوں سے بھری ہوتی ہے --- اور یہ بھی ہے کہ اس کی خوشیاں اس دُکھ بھرے اور پُر جوش سیارے کے باسیوں کو حاصل ذرائع میں سے بہترین ذریعوں سے حاصل ہوتی ہیں۔

*

تعلیم کا منفی نظریہ

قریبی زمانے تک شاید ہی کسی کو اس بارے میں شبہ تھا کہ تعلیم کا کام بچے کو وہ تربیت دینا ہے جس کے مطابق اس کو زندگی بسر کرنی ہے۔ اسے اخلاقی اصولوں، محنت و مشقت کی عادات اور اس کے سماجی مقام کے حوالے سے علم کی کچھ مقدار مہیا کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم دینے کے طریقے بھی بہت سیدھے سادے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ طریقے گھوڑوں کی تربیت کے طریقوں سے زیادہ مختلف نہ تھے۔ گھوڑے کو سدھانے کے لیے اگر چابک سے کام لیا جاتا تو بچے کی تربیت کے لیے چھڑی استعمال کی جاتی تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے بھدے پن کے باوجود اس نظام نے مجموعی طور پر مطلوبہ نتائج پیدا کیے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں صرف ایک چھوٹی سی اقلیت ہی تعلیم حاصل کرتی تھی، لیکن اس اقلیت میں مخصوص عادات ...... جیسے ضبطِ نفس، سماجی ہم آہنگی، قیادت کی صلاحیت اور انسانی ضروریات کو نظر انداز کرنے والی درشتی ...... راسخ ہو جایا کرتی تھیں۔ اس نظام نے برطانیہ کو عظمت سے ہمکنار کیا اور برطانوی تہذیب کو ہندوستان اور افریقہ کے دور دراز علاقوں تک پھیلا دیا۔ میں اس کامیابی کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا اور مجھے یقین نہیں کہ اتنی تھوڑی محنت صرف کر کے کسی اور طریقے کی مدد سے یہ کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس نظام نے سخت کوشی کی عادت کو راسخ کر کے اور ذہنی شکوک و شبہات کی اہلیت کو ختم کر کے ایسے افراد تیار کیے جو پسماندہ اقوام پر حکومت کرنے کے لیے حکمران قوم کو درکار تھے۔ وہ اس سخت نظم و ضبط کو رائج کرنے کے قابل تھے جس کے تحت خود ان کی زندگی کا ابتدائی حصہ بسر ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس احساس سے بھی محفوظ رہے کہ جس شے کو وہ اپنی تعلیم خیال کرتے تھے، اس نے ان کو قوت ارادی کو مضبوط کرنے کی خاطر ان کی ذہانت اور جذبوں کو کچل دیا تھا۔ امریکہ میں یہ نتائج پیورٹن تحریک کی مدد سے اس

کے دور عروج میں حاصل کیے گئے۔

رومانوی تحریک بنیادی طور پر جذبوں کے نام پر قوت ارادی کی سابقہ ناموزوں اہمیت کے خلاف احتجاج کی حیثیت رکھتی تھی۔ بہت چھوٹے بچوں کے ساتھ سلوک کے معاملے میں اس تحریک نے کسی قدر اثر ڈالا۔ لیکن زیادہ تر تعلیمی حکام اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہونے والے تھے۔ صرف ہمارے اپنے زمانے میں ہی یہ ہوا ہے کہ زندگی سے متعلق ان کا عمومی رویہ تعلیمی نظریے پر حقیقی معنوں میں کوئی اثر ڈالنے لگا ہے۔ تاہم جس طرح معیشت میں عدم مداخلت کی پالیسی نے منظم منصوبہ بندی کی نئی اقسام کے لیے جگہ خالی کر دی ہے، اسی طرح تعلیم کے شعبے میں عدم مداخلت کی پالیسی، ایک ضروری مرحلہ رہتے ہوئے بھی، میرے خیال میں قطعی اور حتمی پالیسی نہیں رہی۔ ہم اس بات میں اس پالیسی کے حق میں کچھ کہیں گے اور پھر اس کی حدود کا تجزیہ کریں گے۔

تعلیم کے شعبے میں زیادہ سے زیادہ مہیا کرنے کا نقطہ ٹھوس دلائل کا حامل ہے۔ ہم اس بات سے آغاز کر سکتے ہیں کہ آزادی موجود نہ ہو تو پھر بالغوں کے ساتھ تصادم پیدا ہوتے ہیں۔ عام طور پر سختی کے نفسیاتی اثرات اس سے کہیں زیادہ گہرے ہوتے ہیں جتنے کہ حالیہ زمانے تک سمجھا جاتا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ جس بچے پر سختی کی جائے، اس میں نفرت کا جذبہ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ اگر وہ نفرت کا اظہار نہ کر سکے تو وہ اندر ہی اندر بڑھتی رہتی ہے۔ اور اس کی پوری زندگی میں زہر گھول دیتی ہے۔ چنانچہ بچے کو اگر نفرت باپ سے ہے تو پھر آگے چل کر وہ ملک، مذہب یا کسی غیر قوم کے خلاف نفرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یوں وہ انتشار پسند، لامذہب یا انتہا پسند بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب بچپن میں کسی شخص پر سختی سے کام لیا جائے تو بڑا ہونے پر وہ خود بھی نئی نسل کے ساتھ سختی سے کام لینے کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ یہ نہ ہو تو عام سا چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں خوش گوار سماجی اور ذاتی تعلقات سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت تباہ ہو جاتی ہے۔ ایک دن میں نے سکول میں درمیانے قد کے ایک بچے کو اپنے سے چھوٹے بچے کے ساتھ بدسلوکی کرتے دیکھا۔ جب میں نے اسے ڈانٹا تو اس کا جواب یہ تھا کہ ''بڑی عمر کے لڑکے مجھے مارتے ہیں، اس لیے میں بھی چھوٹوں کی مارتا ہوں، یہ مناسب بھی ہے۔'' سچ تو یہ ہے کہ اس لڑکے نے ان چند لفظوں میں نسل انسانی کی ساری تاریخ کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔

تعلیم میں جبر کا ایک اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کی اپج اور ذہنی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ نوجوانوں میں علم...... کم از کم اچھے خاصے علم...... کی فطری خواہش موجود ہوتی ہے۔ لیکن جب ان پر خواہش سے زیادہ یا ان کی صلاحیت سے زیادہ علم ٹھونسنے کی کوشش کی جائے تو ان کی فطری خواہش بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ جن بچوں کو زبردستی کھانے پر مجبور کیا جائے وہ روٹی سے بھاگنے لگتے ہیں۔ اسی طرح جن بچوں کو زبردستی پڑھنے پر مجبور کیا جائے وہ پڑائی سے دور بھاگنے لگتے ہیں۔ جب وہ سوچتے ہیں تو ان کی سوچ فطری اور بے ساختہ نہیں ہوتی۔ اس کے بجائے وہ محض اس لیے سوچتے ہیں کہ بڑوں کو خوش کر سکیں۔ گویا ان کی سوچ فطری تجسس سے پیدا نہیں ہوتی۔ بے ساختگی کا خاتمہ خاص طور پر فنکارانہ اور تخلیقی امور میں نقصان دہ ہوتا ہے۔ جن بچوں کو اپنی ذات کے اظہار کے بجائے درستی پر نظر رکھتے ہوئے ادب، مصوری یا موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے، وہ زندگی کے جمالیاتی پہلو سے بتدریج بددل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح تربیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے مشینی ایجادات میں بھی بچے کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کسی بچے کو سبق کے دوران عام پمپ کے اصول سکھانا شروع کر دیں تو وہ اس علم سے جان چھڑانے کی کوشش کرے گا۔ اس کے بجائے اگر آپ کے صحن میں پمپ نصب ہے اور آپ بچے کو اس کے قریب جانے سے منع کر دیتے ہیں تو پھر وہ فرصت کا سارا وقت اس پر سوچ بچار کرتا رہے گا۔ اس قسم کی بہت سے دقتیں سبق کو اختیاری کر دینے سے دور ہو سکتی ہیں۔ نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ استاد اور شاگرد میں کھچاؤ ختم ہو جائے گا اور اکثر طالب علم ا... د سے حاصل ہونے والے علم کی قدر کرنے لگیں گے۔ ان کی پیش رفت کی خواہش برقرار رہے گی کیونکہ پڑھنے کا کام ان کا اپنا انتخاب بن جائے گا۔ اور ان کے لاشعور میں نفرت کا انبار جمع نہ ہو گا۔ تقریر کی آزادی، سماجی آداب کے بوجھ سے آزادی اور جنسی علم کے حصول میں آزادی کے حق میں دلائل اس سے بھی وزنی ہیں جن پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

ان تمام وجوہ کی بناء پر تمام تعلیمی مصلحین مدرسوں میں زیادہ سے زیادہ آزادی مہیا کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ حق بجانب بھی ہیں۔ تاہم میرا خیال نہیں کہ مدرسے میں آزادی کو ایک قطعی اصول کی صورت دی جا سکتی ہے۔ اس کی کچھ حدود ہیں اور ان حدود کو جاننا ضروری ہے۔

واضح ترین مثالوں میں سے ایک کے طور پر صفائی کے مسئلے کو لے سکتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ آسودہ حال والدین کے بچوں کو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی صاف ستھرا رکھا جاتا ہے۔ والدین اپنے اس رویے کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ صفائی صحت کے لحاظ سے ضروری ہے۔ خیر، یہ بات تو درست ہی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ زور دینے کا محرک امارت کے اظہار کا جذبہ ہے۔ جب آپ دو ایسے بچوں کو دیکھیں جن میں سے ایک صاف ستھرا اور دوسرا گندا ہو تو فوراً ہی آپ کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ گندے بچے کے مقابلے میں صاف ستھرے بچے کے والدین زیادہ امیر ہیں۔ یہی ہے وہ بات جس کے لیے امارت پسند والدین اپنے بچوں پر صفائی کے سلسلے میں سختی کرتے ہیں۔ یہ جبر قابل نفرت ہے اور وہ بچوں کو ایسی باتوں سے روک دیتا ہے جو انہیں کرنی چاہئیں۔ صحت کے نقطہ نظر سے یہ بات مناسب ہے کہ دن میں دو بار بچوں کو صاف ستھرا بنایا جائے۔ یعنی صبح کے وقت اور پھر رات کو سونے کے وقت۔ ان دو تکلیف دہ لمحات کے درمیان جو وقت ہے، اس میں انہیں آزادی ہونی چاہیے تاکہ وہ خوب کھیلیں کودیں، کپڑے گندے کریں اور چاہیں تو کیچڑ سے لتھڑے ہاتھ منہ پر ملیں۔ بچوں کو ان خوشیوں سے محروم کرنے کا مطلب ان کی پیش قدمی کی صلاحیت، جستجو کی خواہش اور بھاگ دوڑ کی عادت کو کچلنا ہے۔ یہ باتیں اپنی جگہ درست ہیں، تاہم جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں صبح شام صفائی کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ اس صفائی کی خاطر بچے کے ساتھ سختی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ گرم ملکوں میں اس کا زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا کہ وہاں زیادہ کپڑے نہیں پہنے جاتے اور جسم کو ٹھنڈا رکھنے کی خاطر بچے خود ہی پانی میں ہاتھ پاؤں مار لیتے ہیں جو ان کی صفائی کے لیے اکثر و بیشتر کافی ہوتا ہے۔ البتہ ٹھنڈے ملکوں میں صفائی کے لیے خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ دانتوں کی صفائی کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ اگر ہم پرانے زمانے کے لوگوں کی طرح کچی خوراک کھانے والے ہوتے تو پھر دانتوں کو برش کرنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ اب جب تک ہم پکے ہوئے کھانے کھانے کی غیر فطری عادت قائم رکھیں گے تو پھر ہمیں دانتوں کو برش کرنے کا غیر فطری کام بھی کرنا ہی ہوگا۔ ''فطرت کی طرف واپسی'' کے مسلک کو اگر صحت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا مقصود ہے تو پھر اسے ہمہ گیر بنانا ہوگا۔ گویا ہمیں لباس اور پکے ہوئے کھانوں سے بھی ہاتھ کھینچنا ہوگا۔ تو جناب بات یہ ہے کہ اگر ہم اس حد تک آگے نہیں بڑھنا چاہتے تو پھر ہمیں اپنے بچوں کو بعض عادات سکھانی ہوں گی۔ جو اپنے طور پر نہ سیکھیں گے۔ لہٰذا صفائی اور حفظان

صحت کے معاملے میں اگرچہ موجودہ روایتی تعلیم نے بچوں کی آزادی کو ضرورت سے زیادہ محدود کر رکھا ہے، لیکن صحت کے نقطہ نظر سے کسی نہ کسی حد تک پابندی ناگزیر رہی ہے۔

وقت کی پابندی ایسی ہی ایک اور معمولی خوبی ہے جو مکمل طور پر آزاد تعلیم سے شاید پیدا نہ ہو سکے۔ یہ ایسی خوبی ہے جس کی ضرورت سماجی تعاون سے منضبط ہے۔ اس کا خدا سے، کسی صوفیانہ بصیرت یا ایسے ہی کسی دوسرے معاملے سے کوئی تعلق نہیں جس میں بلند پایہ صاحبان یا روحانیت پرستوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی درویش کو شراب نوشی کرتے دیکھیں تو ہمیں حیرت ہوگی۔ لیکن اگر وہی درویش کسی جگہ طے شدہ وقت پر نہ پہنچ سکے تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود زندگی کے روز مرہ امور میں وقت کی پابندی بے حد ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی کا کاروبار اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک کوئی انجن ڈرائیور یا ڈاکیا اپنا کام محض اس وقت کرے جب اسے باطنی اشارہ ملے۔ جدید معاشی اداروں کے کارکن اپنے کام پر تاخیر سے پہنچنے لگیں تو ان اداروں کا سارا کام ہی ٹھپ ہو جائے۔

یہ بجا سہی، لیکن وقت کی پابندی کی عادتیں آزاد ماحول میں سیکھنا دشواری ہے۔ اپنے موڈ کا غلام شخص بھی یہ عادتیں نہیں سیکھ سکتا شاید اسی لیے یہ عادتیں خود کو اعلیٰ ترین کامیابیوں سے ہم آہنگ نہیں کر سکیں۔ نیوٹن کا حال ہم جانتے ہی ہیں کہ وہ کھانے کے معاملے میں اکثر وقت کی پابندی کا خیال نہ کرتا تھا۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ کتا نیوٹن کا کھانا کھا جاتا اور اسے پتا بھی نہ چلتا۔ اکثر شعبے ایسے ہیں کہ ان میں اعلیٰ ترین کامیابیاں حاصل کرنے کی خاطر اپنی کسی کیفیت میں گم ہونا پڑتا ہے۔ تاہم حکمرانوں سے لے کر نچلے درجے تک کے جن لوگوں کے کام اس قدر مہارت اور یکسوئی کا تقاضا نہیں کرتے، وہ اگر وقت کے پابند نہ ہوں تو بہت سا نقصان ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں بچوں کو جدید زندگی کے کسی عام شعبے کے لیے تیار کرنا ہے تو پھر انہیں وقت کی پابندی کرنے کی عادت بھی سکھانا ہوگی۔ البتہ جو بچے شاعر، موسیقار یا ریاضی دان کے طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں، ان کا معاملہ مختلف ہے۔ انہیں وقت کی پابندی کا درس نہ دینا چاہیے۔ تاہم انسانیت کے ننانوے فی صد حصے کو وقت کے معاملے میں نظم و ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کو اگر ان کی ترنگ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ یہ نظم و ضبط نہیں سیکھ سکتے۔ نئے شہروں کے باسی صبح آٹھ بج کر ترپن منٹ پر اپنے اپنے کام کاج کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں، جبکہ ہمارے خیال میں قدیم زمانے کا وحشی شکار کے لیے

صرف اسی وقت تکلیف گوارا کرتا تھا جب اسے بھوک ستاتی تھی۔ اس لیے جو تعلیم اس وحشی کے لیے کافی ہوسکتی تھی، وہ آج کے انسانوں کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔

دیانتداری نسبتاً زیادہ سنجیدہ معاملہ ہے۔ جس پر انہی باتوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس اصلاح سے میری مراد کوئی ہوائی چیزیں نہیں ہیں۔ میرا مطلب تو دوسرے لوگوں کے مال ومتاع کا احترام ہے۔ انسانوں میں یہ احترام فطری طور پر موجود نہیں ہوتا۔ غیر منظم اور غیر تربیت یافتہ شخص کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی موقع ہاتھ آئے وہ دوسروں کی چیزوں پر قبضہ جمالیتا ہے۔ شاید تربیت یافتہ شخص بھی اکثر ایسا ہی کرتا ہے۔ تاہم نظم وضبط نے اس پر یہ بات واضح کردی ہے کہ اکثر اوقات چوری خطرے سے خالی نہیں ہوتی اور اس کے قابو آجانے کا امکان کافی ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ہمارے زمانے کے بعض انسان دوست لوگوں کے ذہن میں اس بارے میں ابہام پایا جاتا ہے۔ جب سے انہیں یہ معلوم ہوا ہے کہ چوری کرنے کی ایک نفسیاتی بیماری بھی موجود ہے، وہ تمام چوریوں کو اسی بیماری کا نتیجہ سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن یہ بات غلط ہے۔ چوری کرنے کی نفسیاتی بیماری کی حالت میں مریض اکثر اوقات ایسی چیزیں چراتا ہے جن کی اسے کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں وہ چوری کرتے ہوئے زیادہ احتیاط سے کام بھی نہیں لیتا۔ اس کے اس فعل کے اسباب نفسیاتی ہوتے ہیں۔ وہ جانے بوجھے بغیر محبت یا کوئی جنسی اہمیت رکھنے والی اشیاء پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اس نفسیاتی مرض کا علاج کسی سزا کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے تو نفسیاتی فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف معمولی چوریاں کسی طور پر بھی ان جانے میں نہیں کی جاتیں۔ عام چور خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔ لہٰذا اگر ان پر واضح کردیا جائے کہ ان کا یہ کام خود ان کے مفاد کے خلاف ہے تو انہیں چوری سے روکا جاسکتا ہے۔ اگر بڑے لوگ بچوں کے کسی گروہ کو آزاد چھوڑ دیں اور ان میں سے کوئی بچہ چوری کرے، بشرطیکہ وہ ان میں سے سب سے بڑا نہ ہو، تو دوسرے بچے اسے بری طرح پیٹیں گے۔ بڑے لوگ یہ کہہ کر اس سزا سے دامن چھڑا سکتے ہیں کہ ان کے نظام میں کوئی تعزیری ضابطہ نہیں۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ خود فریبی کا شکار ہوں گے۔ اس امر کا امکان زیادہ ہے کہ بچوں کا گروہ بے ساختہ طور پر جو تعزیری ضابطہ بنائے گا وہ بڑوں کے بنائے ہوئے ضابطے کے مقابلے میں زیادہ سخت اور کم قابل اعتماد ہوگا۔ لہٰذا خود چور کے لیے مجموعی طور پر بہتر بات یہ ہوگی کہ بالغ لوگ چوری کے واقعات کا محاسبہ کریں اور ایسے طریقے سے

ان سے نمٹیں کہ ان کے حوالے سے دوسرے بچوں کو اپنا غصہ نکالنے کا موقع نہ ملے۔ دوسروں کے مال کا احترام conditioned reflex کو تخلیق کیے بغیر مشکل ہی سے سکھایا جا سکتا ہے۔ ترغیب اور لالچ کے زیر اثر چوری کرنے والے کو پکڑے جانے کا امکان اصل سے کم دکھائی دیتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جس شخص کے لیے چوری کرنے کا موقع موجود ہو وہ اس ترغیب کے دام میں پھنس جاتا ہے۔ اکثر اوقات وہ بالآخر قابو بھی آ جاتا ہے۔

میرے خیال میں ایک اور معاملہ ایسا ہے جس میں آزادی کے بہت سے علمبرداروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ معاملہ یہ ہے کہ نوجوانوں کی زندگی میں معمول یا روٹین کی اہمیت وہ مناسب طور پر محسوس نہیں کر سکے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ روٹین کو بے لچک اور مطلق ہونا چاہیے۔ ایسے دن بھی زندگی میں ہونے چاہئیں جب روٹین کا چکر ٹوٹ جائے۔ مثلاً کسی تہوار کا دن یا عام چھٹیوں کے دن ہیں۔ تاہم مناسب بات یہ ہے کہ بچے کو پہلے سے اس قسم کی تبدیلیوں کی توقع ہونی چاہیے۔ بے یقینی کی زندگی ہمیشہ ہی اعصاب پر بُرا اثر ڈالنے والی ہوتی ہے۔ نوجوانوں کے لیے تو وہ خاص طور پر نقصان دہ ہوا کرتی ہے۔ آنے والے دنوں میں ہونے والی متوقع باتوں کا اگر بچے کو علم ہو تو وہ تحفظ محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنی دنیا کو محفوظ بنانا چاہتا ہے۔ جو کسی ضابطے کے ماتحت ہو۔ ہم نے فطرت کی یکسانیت کا جو تصور قبول رکھا ہے وہ بھی بڑی حد تک ابتدائی جرات بہت زیادہ پسندیدہ صفات ہیں، لیکن وہ بھی بنیادی تحفظ کے پس منظر ہی میں پروان چڑھتی ہیں۔

روٹین پسندی کے حق میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ اگر بچوں کو ہر وقت اپنی مصروفیت کا انتخاب خود کرنا پڑے تو وہ پریشانی اور اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اکثر اوقات دوسرے لوگ اس معاملے میں ان کی مدد کریں اور یہ کہ ان کا اپنا انتخاب محبت کرنے والے بالغوں کے طے کردہ دائرہ کار کے اندر رہے۔ بڑوں کی طرح بچے بھی کسی مشکل پر قابو پانے سے حاصل ہونے والی کامیابی کے احساس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ تاہم اس کام کے لیے مسلسل جدوجہد درکار ہوتی ہے اور دوسروں کی حوصلہ افزائی کے بغیر صرف چند بچے ہی اس قسم کی تگ و دو کر سکتے ہیں۔ استقامت سے اپنی راہ خود بنانے کی اہلیت بہت زیادہ قابل قدر ہے۔ چھوٹے بچوں میں یہ صلاحیت شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ اب اگر انہیں سخت گیر قسم کے نظم و ضبط میں رکھا جائے یا مکمل آزادی مہیا کر دی جائے تو پھر یہ اہلیت کبھی پروان نہیں چڑھتی۔ ایسا بے سوچ ڈسپلن، جیسا

کہ مثلاً جنگ کے زمانے میں سپاہیوں پر مسلط کیا جاتا ہے، وہ انسان کو بیرونی حکم کے بغیر از خود کوئی قدم اٹھانے کے نااہل بنا دیتا ہے۔ دوسری طرف بالپن کے پورے زمانے میں اگر بچے کو مکمل آزادی میسر رہے تو وہ کسی وقتی خواہش کی مزاحمت کرنے کی اہلیت حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اسی طرح وہ اس وقت کسی معاملے پر توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت حاصل نہیں کر پاتا۔ جب کہ اس کی دلچسپی کسی اور معاملے میں ہو۔ نہ ہی وہ اس لیے لذتوں کی مزاحمت کر سکتا ہے کہ وہ تھکاوٹ کا سبب بنیں گی جو کہ بعد کے فرائض پر اثر انداز ہوگی۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوت ارادی کو مستحکم بنانے کی خاطر آزادی اور نظم وضبط کی ایک لطیف آمیزش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی زیادتی سے قوت ارادہ کو ضعف پہنچتا ہے۔ ڈسپلن کی مناسب حدود کے تعین کی خاطر یہ بات اہم ہے کہ تمام ہنگامی ترنگوں کا نہ سہی، لیکن تمام تربیت کو بچے کے ارادے کا تعاون حاصل ہونا چاہیے۔ ہر وہ بچہ جسے ہمدرد بالغوں نے گھیر رکھا ہو، دل ہی دل میں محسوس کرتا ہے کہ وہ خود کسی حد تک احمق ہے اور وہ بڑی حد تک رہنمائی کے لیے ان لوگوں کا احسان مند ہوتا ہے۔ جن پر وہ اپنی بھلائی کے لیے اعتماد کر سکتا ہے۔ کھلاڑی فطری طور پر ڈسپلن کو قبول کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کھلاڑی کی کامیابی کی خواہش کی طرح جو بچے عقلی حالات کے خواہش مند ہوں وہ بھی ضروری نظم وضبط کے آگے سر جھکانے پر رضامند ہوتے ہیں۔ تاہم اگر ماحول ایسا ہو کہ جہاں ہر قسم کے نظم وضبط کو بدی سمجھا جاتا ہو تو پھر بچے اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ کم وبیش ہر قسم کی کامیابی کے لیے رضاکارانہ طور پر ڈسپلن کی پابندیوں کو قبول کرنا ضروری ہے۔ اگر بچوں کو سرکش اور بے مقصد زندگی بسر نہیں کرنی تو ان کے ذہن میں مشکلات سے گھرا ہوا نصب العین موجود رہنا چاہیے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم ہی ہے جو مکمل آزادی کے ماحول میں اس قسم کا نصب العین چن سکیں۔

بچوں کی تعداد زیادہ نہ ہو اور وہ صحیح قسم کے بالغوں کی نگرانی میں ہوں تو پھر ترغیب کے معاملے میں ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت تقریباً ختم ہو سکتی ہے۔ شفقت کے معاملے کو ہی لیجئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وعظ ونصیحت یا ڈانٹ ڈپٹ سے کسی کو شفیق اور محبت کرنے والا بنایا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس طریقے سے اسے کھلم کھلا ظلم وتشدد سے روکا جا سکتا ہے۔ شفیق ذہن کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ جبلی مسرت کا جذبہ موجود ہو اور ساتھ ہی ساتھ بزرگوں کے شفقت آمیز برتاؤ کی

مثال بھی موجود ہو۔ میرے خیال میں محض ایک اخلاقی اصول کے طور پر محبت وشفقت کا درس دینا فضول ہی ہے۔

یہ بات بے حد اہم ہے کہ ڈسپلن جس قدر بھی ہو، وہ جذبات پر زیادہ دباؤ ڈالنے والا نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بچہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس پر بے جا پابندیاں عائد کی جارہی ہیں تو پھر اس میں بہت سی ناپسندیدہ صفات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ ان خصوصیات کا دارومدار بچے کے کردار کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ اگر وہ مضبوط ہے تو بچہ ناراض باغی بن جائے گا۔ اگر وہ کمزور ہے تو پھر رونے دھونے والا منافق بن جائے گا۔ لہٰذا ڈسپلن سے گو ہم مکمل طور پر نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ تاہم اسے اس حد تک کم ضرور کرنا چاہیے جس حد تک شائستہ اور لائق انسانوں کی تربیت تقاضا کرے۔

تدریس کا معاملہ اس سارے سوال کا مشکل ترین حصہ ہے۔ کسی قدر تعجب کے ساتھ تجربے سے میں نے سیکھا ہے کہ کلاس روم میں حاضری کی پابندی کے بغیر بھی کافی حد تک تعلیم دینا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تیار کرنا ممکن ہے۔ اس کے لیے حالات کا ایسا امتزاج درکار ہے جو آج کل وسیع پیمانے پر ممکن نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے لیے طالب علموں میں علم کی سچی اور بے ساختہ جستجو ہونی چاہیے۔ کلاسیں چھوٹی ہونی چاہئیں اور استاد میں ہمدردی، سلیقہ اور مہارت ہونی چاہیے۔ مزید برآں اس کے لیے ایک ایسا ماحول چاہیے جس میں اگر کوئی بچہ شرارتیں کرنے کے لیے کلاس روم میں بیٹھا ہو تو استاد اسے وہاں سے نکال سکے اور کھیل کود کے لیے بھیج سکے۔ عام قسم کے سکولوں میں ایسے حالات پیدا کرنے کے لیے لمبا عرصہ درکار ہوگا۔ لہٰذا اکثر صورتوں میں کلاس میں حاضری غالباً ضروری ہونی چاہیے۔

بعض لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ اگر بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو پھر وہ اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ جانے کے خوف سے خود ہی لکھنا پڑھنا سیکھ لے گا۔ اس لیے کلاس میں لازمی حاضری ختم کرنے سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ علم کے حصول میں ایک دو برس کی تاخیر ہو جائے گی۔ مجھے اس دلیل سے اختلاف ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں ہر دوسرا بچہ لکھنا پڑھنا سیکھتا ہو، وہاں تو یہ ممکن ہے کہ کوئی خاص بچہ جاہل رہ جانے کے خوف سے پیدا ہونے والے احساس کمتری سے نجات حاصل کرنے کی خواہش کرے۔ لیکن اگر حالات ایسے ہوں کہ تمام بچے ہی پابندی سے آزاد ہوں تو پھر اس قسم کے احساس کمتری پیدا ہونے کا موقع بھی نہ آئے گا۔ یوں ہر نسل اپنے

بزرگوں کے مقابلے میں زیادہ جاہل ہوتی چلی جائے گی۔ مثلاً پہاڑے یاد کرنے کے مسئلے کو ہی لیجئے۔ چند بچے ہی ایسے ہوتے ہیں جو انہیں یاد کرنے کی کوئی فطری خواہش رکھتے ہوں۔ جب ان کے ساتھیوں کو پہاڑے یاد کرنے پر مجبور کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے کی شرم کا احساس کرتے ہوئے خود بھی انہی یاد کرنے لگیں۔ اب اگر کسی معاشرے میں کسی بچے کو بھی پہاڑے یاد کرنے پر مجبور نہ کیا جائے تو پھر جلد ہی سوائے چند عالم فاضل لوگوں کے کسی کو خبر نہ رہے گی کہ چھ کو نو سے ضرب دینے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔

اکثر بچوں کو ٹھوس علم حاصل کرنا خوشگوار لگتا ہے۔ بچے کسی کھیت پر رہتے ہوں تو وہ کسان کے شب و روز کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے کام کا علم حاصل کر لیتے ہیں۔ جہاں تک تجریدی علم کا تعلق ہے، وہ بہت کم بچوں کے دل کو بھاتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تجریدی علم کے ذریعے ہی مہذب معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا مہذب معاشرے کو برقرار رکھنے کی خاطر ضروری ہو جاتا ہے کہ ایسے طریقے کو دریافت کیا جائے جس کی مدد سے بچوں میں ایک ایسا طرز عمل پیدا کیا جا سکے جو ان کے لیے فطری نہ ہو۔ ہم جبر کی جگہ ترغیب سے کام لے تو سکتے ہیں، البتہ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کو فطرت کے سپرد کر دیا جائے۔ جدید معاشروں کی پیچیدگی کا شعور رکھنے والا کوئی شخص میرے خیال میں اس نظریئے کی تائید نہیں کر سکتا کہ تعلیم کا کام محض یہ ہے کہ وہ فطری نشوونما کے مواقع فراہم کرے۔ جدید معاشروں کی اس پیچیدگی کو ہم افسوسناک قرار دے سکتے ہیں اور یہ خیال بھی کر سکتے ہیں کہ زندگی کے سادہ تر انداز کی طرف واپسی ہمارے لیے بہتر ہوگی۔ تاہم بدقسمتی یہ ہے کہ اس قسم کی واپسی کے عمل میں انسانوں کی بہت بڑی تعداد فاقوں سے مر جائے گی۔ چنانچہ متبادل صورت اس قدر ہولناک ہے کہ عملی طور پر ہم سب جدید صنعتی دنیا کے پیچیدہ نظام سے چمٹے رہنے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ اس صورت میں اپنے بچوں کو اس نظام کو جاری و ساری رکھنے کی تربیت دینا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا عقلی و فنی تربیت کے حوالے سے ہم تعلیم کے منفی نظریئے کو مکمل طور پر قبول نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نظریئے میں سچائی کے بہت سے اہم عناصر موجود ہیں اور جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، یہ نظریہ بڑی حد تک درست بھی ہے۔ جدید زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر ہمیں تعلیم کے اس منفی نظریئے کے بجائے کسی قدر زیادہ مثبت نظریئے کی ضرورت ہے۔

❁

تعلیم اور انبوہ

تعمیر کردار میں جو عوامل سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں، ان میں سے ایک بچپن اور ایام شباب میں فرد پر گروہ یا انبوہ کا اثر ورسوخ ہے۔ شخصیت کی یکجہتی میں بہت سی ناکامیاں ان دو مختلف قسم کے گروہوں کے درمیان تصادم سے پیدا ہوتی ہیں جن سے بچے کا تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض دیگر ناکامیاں انفرادی اور گروہی مزاج میں اختلافات سے پیدا ہوتی ہیں۔ تعلیم کے معاملے میں اس مسئلے پر خاص توجہ دینی چاہیے کہ گروہ کا اثر ورسوخ زیادہ نہ ہو اور یہ کہ اس کی فعالیت ضرر رساں ہونے کے بجائے مفید ہو۔

اکثر نوجوانوں پر دو قسم کے گروہ اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ ان کو ہم بالترتیب بڑا گروہ اور چھوٹا گروہ کا عنوان دے سکتے ہیں۔ بڑا گروہ جوان سال لوگوں پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اس پورے سماج پر مبنی ہوتا ہے جس سے بچے کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کا زیادہ تر تعین بچے کے گھر سے ہوتا ہے سوائے ان صورتوں کے جب بچے کے گھر اور سکول میں کوئی خاص تضاد موجود ہو۔ مثال کے طور پر اس قسم کا تضاد امریکہ میں تارکین وطن کے بچوں میں دکھائی دیتا ہے۔ لڑکا یا لڑکی جو زمانہ سکول میں بسر کرتی ہے، اس دوران چھوٹا گروہ بڑے مقابلہ میں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ یہ چھوٹا گروہ سکول کے ساتھیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت ایک دوسرے کے قریب وقت گزارتی ہے تو اس میں گروہی احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس احساس کا اظہار کردار کی خاص قسم کی جبلی یکسانیت کی صورت میں نیز ایسے کسی فرد کی مخالفت کی صورت میں ہوتا ہے جو اگرچہ قریب رہتا ہو لیکن اسے گروپ میں شمار نہ کیا جاتا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی بچہ سکول میں نیا نیا داخل ہوتا ہے تو کچھ عرصے کے لیے سکول کے پرانے طالب علم اسے شک وشبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اب اگر اس بچے میں کوئی نرالی بات نہ ہو تو پھر جلد ہی اسے گروہ کے ایک اور رکن کی حیثیت

سے قبول کر لیا جاتا ہے۔ وہ بھی دوسروں کی راہ پر چلنے لگتا ہے۔ ان کی طرح سوچنے اور انہی کی طرح محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن اگر وہ دوسروں سے کسی اعتبار سے مختلف ہو تو پھر دو میں سے ایک باتیں واقع ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ وہ گروہ کا لیڈر بن سکتا ہے یا پھر وہ خوف و ہراس کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض غیر معمولی بچے بھی اپنی پسندیدہ طبیعت کے باعث گروہ میں ضم ہو جایا کرتے ہیں۔

رواجی لوگ اپنے سکول کے زمانے میں فوراً اور کم و بیش جبلی انداز میں اس شے کا احساس کر لیتے ہیں جو گروہ کا ایک رواجی رکن بننے کے لیے درکار ہوتی ہے اور جو بعد کی زندگی میں عمومی احترام حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اگر کلب کا کوئی ساتھی رکن کوئی ایسا کام کرتا ہے جو بالکل درست نہیں ہے تو آدمی فوراً ہی اپنے سکول کے زمانے کے حافظے سے اس برتاؤ کو یاد کر لیتا ہے جو عجیب و غریب لڑکوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ پھر وہ اپنے طرز عمل کو بالغ ضابطہ اخلاق کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتے ہوئے بنیادی طور پر اس برتاؤ کو برقرار ضرور رکھتا ہے۔ اس طرح وہ حقیقی طور پر موثر اخلاقی ضابطہ معرض وجود میں آتا ہے جس کا اطلاق انسانوں پر کیا جاتا ہے۔ کوئی شخص بداخلاقی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ وہ غیر قانونی کام کر سکتا ہے۔ وہ سنگ دل یا ظالم ہو سکتا ہے یا کسی مناسب موقع پر گستاخ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا چاہیے جس کی وجہ سے جماعت اس کے ساتھ بے رخی سے پیش آئے۔ اس قسم کے اقدامات کون سے ہیں؟ اس کا دارومدار تو متعلقہ شخص کے ملک، اس کی عمر اور اس کے سماجی طریقے پر ہے۔ بہر طور ہر ملک میں، ہر عمر میں اور ہر سماجی طبقے میں اس قسم کے اقدامات ہوتے ضرور ہیں۔

تقریباً تمام عورتوں اور مردوں میں گروہ کا خوف بہت گہرا ہوا کرتا ہے اور سب سے پہلے یہ خوف سکول میں پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اخلاقی تعلیم میں یہ مسئلہ بہت اہم بن جاتا ہے کہ سکولی گروہ جن امور کے لیے سزا دے وہ ایسے غیر پسندیدہ امور ہونے چاہئیں جن سے چھٹکارا پانا بچے کے اختیار میں ہو۔ تاہم یہ کام بے حد دشوار ہے۔ لڑکوں کے کسی گروہ کا فطری ضابطہ عام طور پر زیادہ سرفراز نہیں ہوتا اور جن امور کے لیے وہ عام طور پر سزا دیتے ہیں وہ سزا بھگتنے والوں کے بس میں نہیں ہوتے مثلاً اگر کسی لڑکے کے چہرے پر کوئی قدرتی داغ ہو تو عام طور پر سکول میں اسے طنز و مزاح کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور شاید کوئی لڑکا بھی یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس بیچارے کو طنز و مزاح کا نشانہ بنانے

بجائے اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا چاہیے۔ میرے خیال میں یہ رویہ ناگزیر نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لڑکوں کو زیادہ مہربان رویہ اختیار کرنے کا درس دیا جاسکتا ہے لیکن یہ کام ہے مشکل اور سکولوں کے اساتذہ کرام جو زیادہ تر نام نہاد مردانگی کے گن گانے والے ہوتے ہیں، وہ اس کام کے لیے مشکل ہی سے آمادہ ہوں گے۔

انفرادی نہ سہی، لیکن سماجی نقطہ نظر سے ان لڑکوں کا معاملہ زیادہ ہی مشکل ہے جن کا بڑا گروہ سکول کے چھوٹے گروہ کا کسی نہ کسی اعتبار سے مخالف ہوتا ہے۔ یہاں ہم ایسے یہودی بچوں کی مثال دے سکتے ہیں جو مسیحی اکثریت کے سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ سب سے زیادہ لبرل معاشروں میں بھی اکثر یہودیوں کو لڑکپن کے ایام میں اپنے جداگانہ تشخص کے سبب توہین آمیز سلوک کا نشانہ بننا پڑتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ذلتوں کو وہ فراموش نہیں کرتے۔ یہ ان کے حافظے میں محفوظ رہتی ہیں اور زندگی اور سماج سے متعلق ان کے پورے نقطہ نظر پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ گھر کے ماحول میں کسی یہودی کو یہ درس دیا جاسکتا ہے کہ اسے یہودی ہونے پر ناز کرنا چاہیے۔ اپنی عقل کے ذریعے وہ یہ بھی جان سکتا ہے یہودی تہذیب اکثر مغربی اقوام کی تہذیب سے قدیم تر ہے اور یہ کہ تعداد کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہودیوں کے حاصلات دوسری تمام اقوام کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود جب کوئی یہودی بچہ سکول میں دوسرے بچوں کو اپنا مذاق اڑاتے دیکھتا ہے تو اسے یہ بات یاد رکھنا دشوار دکھائی دیتا ہے کہ یہودی ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ اسے یاد بھی رکھتا ہے تو سرکشی کے ساتھ یاد رکھتا ہے۔ یوں اس کے دل میں گھر کے معیاروں اور سکول کے معیاروں کے درمیان ایک تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو شدید نفسیاتی تناؤ اور گہرے جبلی خوف کا سبب بنتا ہے۔ یہودی قوم پرستی کے علاوہ اس صورت حال کے دو مخصوص قسم کے ردعمل ہیں۔ ان میں سے ایک انقلاب کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا موقع پرستی کی راہ تیار کرتا ہے۔ ہم ان دو متضاد ردعملوں کی مثال کارل مارکس اور ڈزریلی کے حوالے سے دے سکتے ہیں۔ موجودہ نظام کے بارے میں مارکس کے یہاں جو شدید نفرت پائی جاتی ہے، وہ شاید اس کے غیر یہودی ہونے کی صورت میں موجود نہ ہوتی۔ خیر وہ اس قدر ذہین ضرور تھا کہ اس نے اپنی نفرت کا رخ غیر یہودیوں سے سرمایہ داروں کی طرف موڑ دیا۔ اب چونکہ زیادہ تر سرمایہ دار تھے ہی قابل نفرت، اس لیے مارکس کو ان کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے اور سماجی نظام میں ان کے مقام سے متعلق ایک

خاص حد تک درست نظریہ بنانے میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

ڈزریلی نسل کے لحاظ سے یہودی لیکن مذہب کے اعتبار سے عیسائی تھا۔اس نے صورت حال کا مقابلہ مارکس سے بالکل مختلف انداز میں کیا۔اس نے امراء کی شان وشوکت اور بادشاہوں کی عظمت و دبدبے کو دل کی گہرائیوں سے سراہا۔وہ پورے خلوص سے سمجھتا تھا کہ یہ چیزیں استحکام کی اساس ہیں۔وہ بدامنی اور خوف وہراس سے نجات دلاتی ہیں اور قتل عام سے محفوظ رکھتی ہیں۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ مخالف گروہ کے جس خوف نے مارکس کو انقلابی بنایا تھا،اسی خوف نے ڈزریلی میں حفاظت کی خواہش پیدا کردی۔تعجب انگیز مہارت کے ساتھ ڈزریلی نے خود کو پسندیدہ گروہ میں نہ صرف جذب کرلیا بلکہ اس گروہ میں اپنے لیے اعلیٰ مقام بھی بنایا۔یہاں تک کہ وہ معزز امرا کا لیڈر اور بادشاہ کا منظور نظر بن گیا۔جب اس نے برطانوی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں پہلی تقریر کی تو لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔اس موقع پر اس نے وہ جملہ کہا جو اس کی زندگی کے بنیادی نکتے کو آشکار کرتا ہے۔ڈزریلی نے مذاق اڑانے والوں سے کہا تھا''وہ وقت بھی آئے گا جب تم لوگوں کو میری بات سننا ہی پڑے گی۔''

خاندانی امرا کا رویہ اس کے بالکل برعکس ہوا کرتا ہے۔اس قسم کے رویئے کی مثال بڑے پٹ کے واقعہ میں ملتی ہے۔اس نے پارلیمنٹ میں ایک بار اپنی تقریر''شوگر،سر---'' کے الفاظ سے شروع کی۔اس پر ارکان ہنسنے لگے۔پٹ نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور بلند تر آواز میں دہرایا''شوگر،سر''لوگ ایک بار پھر ہنسنے لگے۔تیسری بار پٹ غصیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گرجا: ''شوگر،سر---''اس بار کسی کو ہنسنے کی جرات نہ ہوئی۔

گروہ کے ہاتھوں بچے کو جس ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے،اس کی خفت مٹانے کی خواہش میں بہت سے بچے اچھے یا برے کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔حرامی بچے اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔شیکسپیئر کے مشہور ڈرامہ لیبر کا کردار ایڈمنڈ اس طریقہ کار کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح حرامی ہونے کے باعث اس میں عام لوگوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوگئے تھے۔میں تو یہ کہنے کی جرات بھی کروں گا کہ اگر فاتح ولیم کو اپنے حرامی ہونے کا داغ مٹانے کی خواہش نہ ہوتی تو وہ ہرگز اس قدر شاندار کارنامے سرانجام نہ دیتا۔

اب تک ہم ایسے افراد پر عام قسم کے گروہوں کے اثرات پر غور کرتے چلے آئے ہیں جو

اپنے کردار یا حالات کے حوالے سے غیر معمولی تھے۔ تاہم زیادہ شدید نوعیت اور زیادہ ظالمانہ قسم کے طفلانہ گروہ بھی ہوا کرتے ہیں۔ کرو پوٹکن بچپن میں ایسے سکول میں پڑھتا تھا جس میں زار روس کے منظور نظر لڑکے ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اپنے ایام سکول کے جن واقعات کا اس نے ذکر کیا ہے، وہ بہت دلچسپ ہیں۔ مثال کے طور پر اس نے لکھا ہے کہ ''۔۔۔ لڑکوں کا ایک جتھا جو جی میں آئے، کرتا تھا۔ گزشتہ جاڑے میں ان کا ایک محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ بعض بے وقوفوں کو رات کے وقت ایک کمرے میں رات کے لباس میں جمع کر لیتے اور پھر جس طرح سرکس میں گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں، اس طرح انہیں کمرے میں چاروں طرف دوڑاتے۔ پھر ہاتھوں میں ربڑ کا مضبوط کوڑا لے کر لڑکوں کو بے رحمی سے پیٹا جاتا تھا۔ یہ ''تماشا'' حسب معمولی مشرقی انداز میں نہایت نفرت انگیز طریقے سے انجام کو پہنچتا۔ اخلاقیات کے جو تصورات اس زمانے میں رائج تھے اور تماشہ ختم ہونے کے بعد اوقات کے بارے میں سکول میں جو لغو چرچے ہوتے رہتے تھے، ان کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔''

نمایاں شخصیات کے کردار پر پڑنے والے سکولی گروہ کے اثرات کے بارے میں مبالغہ آرائی دشوار ہے۔ آیئے ہم نپولین کی مثال ہی لے لیں۔ ایام شباب میں نپولین برئین کے امرا کے ملٹری کالج میں پڑھتا تھا۔ اس کالج کے دوسرے تمام طلبہ نپولین کے مقابلے میں زیادہ امیر اور اعلیٰ تر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ نپولین کو اس کالج میں داخلہ فرانس کی طرف سے کورسیکا کو دی جانے والی رعایت کے سبب ملا تھا۔ اس رعایت کے ذریعے کورسیکا کے چند نوجوانوں کو برائین میں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ نپولین بہت سے افراد پر مشتمل کنبے سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی ماں غریب تھی، لیکن جب نپولین شہنشاہ بن گیا تو پھر آسانی سے یہ بات بھی دریافت کر لی گئی کہ اس کا تعلق گبلین کے ایک قدیم خاندان سے ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں یہ بات معلوم نہ تھی۔ تب اس کے کپڑے سادہ اور پھٹے پرانے ہوا کرتے تھے، جبکہ دوسرے طالب علم ہمیشہ شاندار لباس زیب تن کیے ہوتے تھے۔ وہ نپولین سے حقارت سے پیش آتے۔ جب فرانس میں انقلاب برپا ہوا تو نپولین نے اس سے ہمدردی ظاہر کی۔ ہم شبہ کر سکتے ہیں کہ اس کی اس ہمدردی میں اس ذلت و خواری کا بھی حصہ تھا جس کا سامنا نپولین کو اپنے ساتھی طالب علموں کی طرف سے کرنا پڑتا تھا۔ البتہ جب وہ شہنشاہ بن گیا تو ایک شدید تر اور الف لیلوی انداز کا انتقام لینے کے قابل بھی ہو

گیا۔ چنانچہ جو اس کی توہین کیا کرتے تھے، اب انہیں مجبور کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس کے سامنے جھکنے کا اعزاز حاصل کرنے کی التجا کریں۔ کیا اس میں کسی شبے کی گنجائش ہے کہ اپنے اقتدار کے آخری زمانے نپولین جس غرور و تمکنت سے کام لینے لگا تھا، اس کے پیچھے ان ذلتوں کا ہاتھ تھا جو اس نے بچپن میں برداشت کی تھیں۔ اس کی ماں جس نے اس قسم کی ذلتیں برداشت نہ کی تھیں، وہ نپولین کے عروج کے دنوں کو بے تعلقی سے دیکھتی تھی اور اس کی خواہشوں کے خلاف بُرے دنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ جمع کرتی رہتی تھی۔

چند بڑے لوگ ایسے بھی گزرے ہیں کہ جن کو گروہی دباؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان میں سے زیادہ بادشاہ تھے۔ ان میں سے ایک نمایاں بادشاہ سکندر اعظم ہے جو زندگی کے کسی مرحلے میں بھی اپنے ہم پلہ گروہ کے درمیان نہیں رہا تھا۔ شاید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی عظمت میں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی کوتاہیوں میں اس حقیقت نے جزوی کردار ضرور ادا کیا ہے۔ سکول میں نئے داخل ہونے والے بچے میں جو انکساری پیدا ہو جاتی ہے، وہ کبھی شان و شوکت کے خواب دیکھنے میں سکندر اعظم کے لیے رکاوٹ نہ بن سکتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو فاتح کے روپ میں دیکھتا تھا، لہٰذا پوری دنیا کو فتح کرنا اسے بالکل فطری بات دکھائی دیتی تھی۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو تمام معاصرین سے عظیم تر خیال کرتا تھا۔ لہٰذا اپنے تئیں دیوتا سمجھنا اسے بالکل فطری معلوم ہوتا تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ میل ملاپ میں وہ ان کے حقوق کا کوئی اشارہ نہ دیتا تھا۔ پرمینیو اور کلیٹس کے قتل کو الگ تھلگ کر کے دیکھا جائے تو وہ سکندر اعظم کے جابر ہونے کا تاثر دیتے ہیں۔ البتہ نفسیاتی طور پر ان کی توجیہ کی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں کا قتل اس شخص کی بے صبری کا نتیجہ تھے جو خود کبھی بھی گروہ کے دباؤ کا شکار نہ ہوا تھا۔

مندرجہ بالا مثالیں اس امر کی وضاحت کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ کردار کی تشکیل میں سکولی گروہ بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اثر خاص طور پر اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے، جب اس کا تصادم غیر معمولی صلاحیت کے حامل بچے کی کسی انفرادی یا سماجی خصوصیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ کوئی نیا سکول قائم کرنے کے خواہش مند شخص کو کسی اور واحد معاملے سے زیادہ اس گروہ کی نوعیت پر غور کرنا چاہیے، جس کو وہ تخلیق کرے گا۔ اگر وہ خود مہربان اور بردبار ہے لیکن سکولی گروہ کو بے رحم اور تنگ نظر ہونے کا موقع دیتا ہے تو پھر اس کی تمام خوبیوں کے باوجود اس کی نگرانی میں آنے

والے لڑکوں کو تکلیف دہ ماحول کے تجربے سے گزرنا پڑے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عدم مداخلت کے نظریئے کے تحت بعض جدید سکولوں میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ جن میں اس قسم کی بات آسانی سے وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔

بالغ لوگ اگر بچوں کے معاملات میں بالکل ہی دخل نہ دیں تو امکان یہ ہوتا ہے کہ بڑے بچے چھوٹے بچوں پر اپنی بالادستی قائم کر لیں گے۔ یوں بچوں کی آزادی مجروح ہوگی اور جسمانی طور پر زیادہ مضبوط بچوں کا گروہ ہی آزادی سے ہمکنار ہو سکے گا۔ تاہم براہ راست انضباطی اقدامات کے ذریعے چھوٹی عمر کے بچوں پر بڑی عمر کے بچوں کی بالادستی کو روکنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ مثلاً اگر بالغ افراد بڑی عمر کے بچوں کے ساتھ برتاؤ میں قوت سے کام لیں تو یہ بچے بھی ان کی نقل کریں گے اور اپنے سے چھوٹے بچوں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں گے۔ اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ گروہ کا دباؤ ممکنہ حد تک کم ہو اور جسمانی قوت کی بالادستی اس حد تک کم ہو جس حد تک وہ بچوں کی فطرت کے مطابق ہو۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اگرچہ یہ بات اچھی ہے کہ وہ اپنے معاصرین کے ساتھ سماجی برتاؤ کا سبق سیکھیں، لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے کہ وہ بہت زیادہ گروہی دباؤ کا نشانہ بنیں۔ گروہی دباؤ کے بارے میں رائے دو حوالوں سے قائم کی جا سکتی ہے۔ اول اس کی شدت اور دوم اس کی سمت۔ اگر یہ دباؤ بہت زیادہ شدید ہو تو وہ ایسے بالغ پیدا کرتا ہے جو عموماً بزدل اور تقلید پرست ہوتے ہیں۔

یہ صورت حال افسوسناک ہوگی، چاہے گروہ کو سرگرم کار کرنے والے اخلاقی معیار کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں۔ ''ٹوم براؤن کے ایام سکول'' نامی کتاب میں ایک ایسے لڑکے کا ذکر ملتا ہے، جسے عبادت کرنے پر پیٹا جاتا تھا۔ اس کتاب کا بڑا اثر ہوا اور اپنے معاصرین میں سے میں ایک ایسے صاحب کو جانتا ہوں جس کو عبادت نہ کرنے کی وجہ سے سکول میں پیٹا گیا تھا۔ میں افسوس سے کہتا ہوں کہ اس قسم کے تجربے سے گزرنے کے بعد وہ صاحب زندگی بھر ملحد رہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گروہی جبر کی یہ بہت زیادہ نیکوکارانہ صورت بھی، جب اس میں بہت زیادہ شدت پیدا ہو جائے، تو وہ غیر پسندیدہ بن جاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ بہت زیادہ گروہی دباؤ انفرادیت کی راہ میں نشوونما میں اور ساتھ ہی ساتھ ان تمام دلچسپیوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے جو اوسط درجے کے بچوں میں عام طور پر نہیں پائی

جاتیں۔اس قسم کی دلچسپیوں میں سائنس، آرٹ، ادب، تاریخ اور وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو تہذیب کی تشکیل کرتی ہیں۔خیر اس حقیقت سے کہ گروہ کے اندر مسابقت کے اچھے پہلو بھی ہیں، اس سے جسمانی شجاعت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، جبکہ ہر قسم کی منافقانہ کمینگیوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔لہٰذا اپنی حدود کے اندر اس کے فوائد بھی ہیں۔

گروہ کے مقاصد مجموعی طور پر اچھے ہوں تو اس قسم کے فوائد اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔غیر معمولی قابلیت کے حامل لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے خصوصی سکولوں کے خصوصی فائدوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس قسم کے سکولوں میں گروہ عام سکولوں کے مقابلے میں زیادہ روشن خیال ہوتا ہے اور تہذیب افزا مشاغل کی وہ کم مخالفت کرتا ہے۔بہر طور جہاں تک مکمل طور پر عام قسم کے لڑکوں اور لڑکیوں کا معاملہ ہے، وہاں بھی رواداری، برداشت اور رحم دلی کو ایک خاص حد تک پیدا کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ بالغوں کی مناسب مثال سامنے ہو۔اسی طرح اجتماعی کاموں، مثلاً کھیلوں میں دلچسپی بھی پیدا کی جا سکتی ہے جن میں گروہی جبلت دبانے کے بجائے تعاون کرنے کی طرف مائل ہوتی ہے۔

بعض نمایاں طور پر اہم شخصیتوں کے لیے گہرے طور پر اہم محسوس ہونے والے کسی سبب کی بنا پر گروہ کے مقابلے میں ڈٹ جانے میں کوئی تعلیمی قدر مضمر ہوتی ہے۔اس قسم کا کردار ارادے کو مضبوط کرتا ہے اور انسان کو خود انحصاری کا درس دیتا ہے۔اس کے حوالے سے اگر فرد کو بہت زیادہ مصائب برداشت نہ کرنے پڑیں تو پھر یہ اس کے حق میں مفید ثابت ہوتی ہے لیکن اگر گروہ ایک خاص حد سے زیادہ رنج دے تو وہ یا تو ہار مان لیتا ہے اور اس شے کو کھو دیتا ہے جو اس کے کردار کی سب سے شاندار چیز تھی یا پھر تخریبی غصے سے بھر جاتا ہے جو، جیسا کہ نپولین کے معاملے میں ہوا، دنیا کو شدید نقصان پہنچا سکتا ہے۔

جہاں تک سکول سے باہر کے بڑے گروہ کا تعلق ہے، وہ والدین جن کے خیالات دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔وہ ایک ایسی الجھن میں پھنس جاتے ہیں جس کو حل کرنا ان میں سے اکثر کو بہت مشکل محسوس ہوتا ہے۔اگر وہ اپنے بچوں کو ایسے سکول میں داخل کرواتے ہیں جس میں انحرافی خیالات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے یا جس میں غیر معمولی حد تک آزادی مہیا کی جاتی ہے تو انہیں یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جب ان کے بچے سکول سے فارغ ہونے کے بعد باہر کی دنیا میں قدم

رکھیں گے تو پھر وہ اپنے آپ کو آسانی سے حالات کے مطابق نہ ڈھال سکیں گے۔ جن لوگوں کو جنس کے بارے میں سوچنے اور بولنے کی آزادی میسر رہی ہو۔ وہ اپنے آپ کو بعد ازاں معمول کی پابندیوں اور ممنوعات کے روبرو بے بس پاتے ہیں۔ جنہیں حب الوطنی کی تعلیم نہیں دی گئی وہ ہمارے قوم پرستی کے جذبے سے بھرپور دنیا میں اپنے لیے جگہ بنانے میں دشواری محسوس کریں گے۔ اسی طرح جن کو حاکمیت کے احترام کا درس نہیں دیا گیا وہ اپنی تنقیدات کی آزادی کے حوالے سے خود کو مشکل میں پائیں گے۔ مختصر یہ کہ جو لوگ آزادی کے عادی رہے ہوں، وہ غلامی کی زنجیروں کو ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ تکلیف دہ محسوس کریں گے جو جنم جنم کے غلام ہیں۔ کم از کم استدلال کی یہ وہ قسم ہے جو میں نے آزاد خیال والدین سے اکثر سنی ہے جو اپنے بچوں کو غیر آزادانہ تعلیم دلانے کے حق میں ہوا کرتے ہیں۔

میرے خیال میں اس دلیل کے دو جواب ہیں۔ ان میں سے ایک نسبتاً سطحی ہے جبکہ دوسرا بنیادی نوعیت کا ہے۔ اس میں سے پہلا جواب اس امر کی نشاندہی پر مشتمل ہے کہ کردار کی ظاہری ہم آہنگی ایک شے ہے جس کو نوجوان آسانی سے سیکھ لیتے ہیں اور یہ کہ یہ ہم آہنگی تعلیم کے ایسے روایتی نظامات میں دنیا میں ہر جگہ سکھائی جاتی ہے، جہاں والدین اور اساتذہ کے روبرو بچوں کا کردار اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس طرح کہ وہ آپس میں پیش آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عنفوان شباب میں بھی اس اہم ہم آہنگی کو اسی قدر آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے جتنا کہ زندگی کے زیادہ ابتدائی مراحل پر ہوتا ہے۔ کسی حد تک تو یہ محض اچھے آداب سیکھنے کا معاملہ ہے۔ یہ بدتہذیبی ہوگی کہ کسی شخص کے سامنے اس کے نبی کے خلاف بات کی جائے یا کسی جج کے روبرو تعزیری قوانین کی برائی کی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی موضوع پر اپنی رائے کا کھلم کھلا اظہار ہمارا سماجی فرض ہو لیکن ہمارا یہ فرض مشکل ہی سے ہو سکتا ہے کہ اپنی ان آراء کا اظہار نجی طور پر ایسی محفلوں میں کریں جن سے دوسروں میں صرف ناراضگی اور دکھ کا اظہار احساس ہی پیدا ہو۔

میں نہیں سمجھتا کہ آزادانہ تعلیم کسی لڑکے یا لڑکی کو اچھے آداب اور خوش اخلاقی کے نااہل بنا سکتی ہے۔ اس طرح وہ اس ظاہری شائستگی کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں بنتی جو کہ رسمی زندگی کا تقاضا ہے۔ اسی طرح میں یہ بات بھی تسلیم نہیں کرتا کہ آزاد تعلیم کے بعد سماجی ہم آہنگی پیدا کرنے میں جو تکلیف پیش آتی ہے وہ کم و بیش ان پیچیدگیوں سے پیدا ہونے والی تکالیف جتنی شدید ہوتی ہے

جو روایتی تعلیم کے عمل کے دوران جڑ پکڑ لیتی ہے۔

دوسرا جواب زیادہ گہرا ہے۔ ہماری دنیا میں شدید قسم کی برائیاں موجود ہیں جو اس وقت دور ہوں گی جب انسان انہیں دور کرنا چاہیں گے۔ یہ بجا ہے کہ جو لوگ ان برائیوں سے آگاہ ہیں اور ان کے خلاف برسرپیکار بھی ہیں، وہ روزمرہ کی زندگی میں ان لوگوں کے مقابلے میں کم ہی خوشیاں سمیٹتے ہیں جو حالات کو جوں کا توں قبول کرتے ہیں، تاہم روزمرہ کی خوشیوں اور مسرتوں کی جگہ وہ ایک ایسی شے حاصل کر لیتے ہیں جس کو میں اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے زیادہ قابل قدر خیال کرتا ہوں۔ انہیں یہ احساس ہوگا کہ دنیا کے دکھ درد کم کرنے کے لئے انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ان کے بس میں تھا۔ بے شعور تقلید پرستوں کے مقابلے میں ان کے پاس اقدار کا زیادہ منصفانہ معیار ہوگا۔ وہ اس امر سے باخبر ہوں گے کہ وہ ان لوگوں کی صف میں شامل ہیں جو نسل انسانی کو جمود و یاس کی گہرائیوں میں ڈوب جانے سے بچاتے ہیں۔ یہ چیز کاہلی آمیز قناعت سے بہتر ہے۔ اگر آزاد تعلیم اس شے کو فروغ دے سکتی ہے تو پھر والدین کو ان عارضی تکالیف سے نہیں گھبرانا چاہئے جو اس قسم کی تعلیم کے حوالے سے ان کے بچوں کو پیش آ سکتی ہیں۔



تعلیم اور جنس

جنسی اخلاق اور ضابطوں کے بارے میں مہذب بالغ افراد کی آرا عام طور پر ان باتوں سے کافی مختلف ہوتی ہے جو وہ اپنے بچوں کو سکھانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ آبادی کا ایک حصہ روایتی اخلاقی ضابطے کو ابھی پوری طرح قبول کئے ہوئے ہے، جب کہ دوسرے لوگ اس ضابطے کو محض برائے نام ہی قبول کرتے ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ عام لوگوں کا احترام حاصل کر سکیں۔ عمومی صورت حال یہ ہے کہ جنس کے بارے میں روایتی نقطہ نظر رکھنے والے لوگ اس سے اختلاف کرنے والوں کے مقابلے میں اپنے نظریات کا پرچار کرنے میں زیادہ سنجیدہ اور مخلص ہوتے ہیں۔ جو لوگ اپنے طرز عمل اور اپنے دوستوں کے نجی طرز عمل سے متعلق اپنی آراء میں زیادہ وسعت نظر سے کام لینے پر آمادہ ہوتے ہیں، وہ شاذ و نادر ہی اپنی اخلاقیات کے بارے میں واضح ہوتے ہیں جہاں تک روایتی ضابطے سے اختلاف کرنے کا تعلق ہے، وہ یہ کام شاید ہی کبھی کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ مزید برآں ان کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ جنسی جذبے کا طوفان یقینی طور پر عورتوں اور مردوں کو ہر قسم کے ضابطہ کی خلاف ورزی پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس لئے عمل میں درست حد تک آزادی غالباً اس وقت حاصل ہوتی ہے جب نظریہ اس سے زیادہ شدید ہو جتنا کہ سچائی کے تقاضے اجازت دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ کسی حالت میں بھی شادی کے سوا جنسی تعلق جائز نہیں ہے، وہ شدید محبت کے دباؤ کے تحت یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس کے اپنے معاملے میں حالات کی صورت اس قدر بدل گئی ہے کہ ضابطہ اخلاق میں لچک پیدا کرنے میں کوئی حرج نہیں رہا۔ اس طرح جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ شدید محبت شادی کے بغیر بھی جنسی تعلق کو جائز بنا دیتی ہے، وہ ہر لمحاتی ترنگ کو شدید محبت قرار دینے پر تلا رہے گا۔ اسی طرح لمحاتی ترنگوں کو جائز سمجھنے والا شخص، بشرطیکہ ایسی ترنگیں دوطرفہ نہ ہوں اور ان میں روپے پیسے کو دخل نہ ہو، ممکن ہے کہ دوطرفہ

ہونے کی بات کو بھول جانے دے اور چپکے چپکے اس معاملے میں روپے پیسے بھی کام لینے لگے۔ ان طریقوں سے اکثر لوگ عملاً اپنے لئے اس سے زیادہ آزادی حاصل کر لیتے ہیں جتنی کہ ان کے عقائد دیتے ہیں لہٰذا کسی قسم کی جنسی آزادی کی وکالت کرتے ہوئے ہمیشہ یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ عملی طور پر جس قدر آزادی کو اختیار کیا جائے گا وہ عموماً اس سے زیادہ ہوگی جس کی وکالت کی جائے گی۔

بالغوں کے لئے جس کسی نظریئے کو بھی صحیح جنسی اخلاق قرار دیا جائے، یہ بات طے ہے کہ بچوں کی جنسی تعلیم سے متعلق بہت سے سوالات ایسے ہیں کہ جن پر بنیادی مسائل اٹھائے بغیر فہم عامہ اور نفسیات کی بنیادوں پر غور کیا جا سکتا ہے۔ رواج یہ ہے کہ تعلیم کو ان لوگوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو خصوصیت سے جاہل، متعصب اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔ خوشحال خاندانوں کے بچے زندگی کے ابتدائی برسوں میں اکثر اوقات ایسی اناؤں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں جو عام طور پر کنواری اور لگ بھگ ہمیشہ ہی بناوٹی شرم و حیا کی ماری ہوتی ہیں۔ بعد ازاں جب وہ زیادہ تعلیم یافتہ خواتین کی نگرانی میں آتے ہیں تو عموماً یہ خواتین بھی غیر شادی شدہ ہوتی ہیں اور توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ نہایت عمدہ کردار کی مالک ہوں گی۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بزدل، جذباتی اور حقیقت سے ڈرنے والی ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان کی جنس کے بارے میں آراء غیر لچک دار اور جہالت پر مبنی ہوں گی جہاں تک سکولوں کے اساتذہ کا تعلق ہے وہ گو لازمی طور پر کنوارے نہیں ہوتے لیکن ان سے بھی اعلیٰ اخلاق اور چال چلن کی امید کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عملی مسائل کو سائنسی نفسیات کے بجائے روایتی تعصب کے حوالے سے حل کریں گے۔ ان اساتذہ میں سے اکثر بچوں کی جنسی نفسیات کو ایک غلیظ موضوع قرار دیتے ہیں۔ جس سے بے خبر رہنا ہی ان کے نزدیک اچھی بات ہے۔ وہ اپنی جہالت کے نقصان دہ مضمرات سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔

بہت سے بچوں کو دو برس کی عمر تک پہنچنے تک ہی یہ سکھلا دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے جنسی اعضا کو پراسرار اور خوفناک خیال کریں۔ جن سے خاص انداز سے پیش آنا چاہئے۔ انہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی فطری ضرورتوں کو سرگوشی یا اشارے سے ظاہر کریں۔ جب کبھی انہیں اپنے جنسی اعضا کو ہاتھ لگاتے دیکھ لیا جائے تو انائیں سخت ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتی ہیں۔ میں بعض ایسے مردوں

اور عورتوں کو جانتا ہوں کہ جن کو بچپن میں ان کی ماؤں نے اپنے جنسی اعضا کو مس کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس پر مائیں اس قدر برافروختہ ہوئیں کہ کہنے لگیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر ہی جاتے۔ (اس قسم کے واقعات عام ہی ہیں) میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس رویئے نے روایتی خوبی کے نمونوں کو پیدا نہیں کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوان بچوں میں مشت زنی تقریباً عالمگیر ہے۔ فرائڈ نے کہیں لکھا ہے کہ جرمنی میں لڑکوں کو یہ کہہ کر ڈرایا جاتا ہے کہ سارس آئے گا اور ان کے اعضائے مخصوصہ کاٹ کر لے جائے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب کبھی اتفاق سے وہ کسی لڑکی کو ننگا دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ سارس اس بیچاری کو نشانہ بنا چکا ہے۔ تحلیل نفسی کے ادب کے قارئین اس قسم کے حقائق سے بخوبی آگاہ ہیں۔ لیکن وہ لوگ اس ادب کو پڑھنا جرم سمجھتے ہیں جن کی اس ادب سے ناواقفیت نقصان کا موجب بنتی ہے۔ بعد کی زندگی میں پیدا ہونے والی اعصابی خرابیوں کا اکثر اوقات منبع وہ دھمکیاں ہوتی ہیں جو مشت زنی کے نتائج کے خلاف بچوں کو دی جاتی ہیں اور جن سے وہ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ سکول کے پورے زمانے کے دوران استاد بچوں کو یہ کہہ کر ڈراتے رہتے ہیں کہ مشت زنی سے پاگل پن پیدا ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ دھمکیاں جنون کی وجہ بنتی ہیں۔ جہاں تک خود مشت زنی کا تعلق ہے، اگر بالغ لوگ اس کے سلسلے میں بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کریں تو وہ بچوں کے لئے بہت ہی کم نقصان کا سبب بنتی ہیں۔

بچوں کی پیدائش کے بارے میں جس رازداری سے کام لیا جاتا ہے، وہ بھی کئی برے اثرات کا موجب بنتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بعض علوم برے ہیں اور خاص طور پر دلچسپ علم تو بہت ہی برا ہے کسی اخلاقی ضابطے کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہونا چاہئے کہ تمام علم اچھا ہے اور یہ کہ اس میں کسی استثنا کے لئے جگہ نہیں۔ بچہ جب یہ محسوس کرتا ہے کہ بعض امور میں اس کے تجسس کا جواب ڈانٹ ڈپٹ کی صورت میں دیا جاتا ہے تو پھر وہ یہ فرض کرنے لگتا ہے کہ علم اس وقت اچھا ہوتا ہے جب وہ غیر دلچسپ ہو۔ اور جب کبھی وہ دلچسپ ہو تو ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ اس طریقے سے سائنسی تجسس اور خوبی کے درمیان تضاد ابھر آتا ہے۔ یوں اچھا بننے کے لئے بچے کی تگ و دو اسے احمق بنانے کی کوشش بن کر رہ جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسا ہوتا بھی اکثر ہے۔ لڑکیوں کو حمل کے حقائق سے بے خبر رکھنا برا ہے۔ لڑکیاں اپنے آپ کو لڑکوں سے کمتر سمجھنے لگتی ہیں۔ اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ لڑکے ہوتیں جب تک انہیں

حمل کے بارے میں علم حاصل نہ ہو، انہیں بظاہر یوں دکھائی دیتا ہے کہ تقریباً تمام امور میں مرد عورتوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ میں نے زندگی میں دیکھا ہے کہ جونہی لڑکیوں کو بچوں کی پیدائش میں عورتوں کے کردار کے متعلق علم حاصل ہوتا ہے، وہ اپنی صنف کے بارے میں ایک نیا احترام محسوس کرنے لگتی ہیں اور انہیں لڑکی ہونے پر ندامت کے بجائے ایک نئی قسم کا اطمینان ہونے لگتا ہے۔ اب اگر اس معاملے میں بچوں کو ماں کے کردار کے بارے میں تو بتا دیا جائے، لیکن باپ کے کردار کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ بات لڑکوں کے حق میں اسی طرح ناروا ہوگی جس طرح لڑکیوں کو بے خبر رکھنے کے معاملے میں تھی۔

مزید برآں جو بچے باپ سے محبت کرتے ہیں، انہیں یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ ماں کی طرح ان کا جسمانی تعلق باپ سے بھی ہے۔ لڑکوں کی خودداری کے حوالے سے ان کے لئے پیدائش کے عمل میں باپ کے کردار کو جاننا اسی قدر ضروری ہے جس قدر لڑکیوں کے لئے حمل میں ماں کے کردار کو جاننا۔

جنس کے حقائق پر مہر بہ لب رہنے کی پالیسی کا ایک اور برا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے یہ جان جاتے ہیں کہ والدین ان سے جھوٹ بولتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ عموماً والدین کی توقع سے بھی پہلے سچی بات جان جاتے ہیں۔ سچائی کا علم ہونے کے بعد وہ ماں باپ سے اکثر سوال پوچھتے رہتے ہیں اور ان کے جھوٹے جوابات کو ایامِ شباب میں روکھائی کے ساتھ ذہن نشین کرتے رہتے ہیں۔ معلمین اخلاق اگر چہ اس امر سے اتفاق نہیں کرتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ اس کا تقاضا کرنے والا کوئی اخلاق ضابطہ درست نہیں ہوتا۔

یہ بات ضروری ہے کہ جنسی موضوعات سے متعلقہ معلومات بچوں تک اسی انداز اور لہجے میں پہنچائی جائیں جس طرح دیگر موضوعات کی معلومات انہیں فراہم کی جاتی ہیں۔ مزید برآں جنسی معلومات واضح اور صاف الفاظ میں مہیا کی جانی چاہیں۔ ایک خاص مکتبہ فکر کے حامیوں کا کہنا یہ ہے کہ پہلے بچوں کو پھولوں کی محبت کے بارے میں درس دیا جائے۔ پھر مچھلیوں کے معصوم کھیلوں کا ذکر کیا جائے۔ اس طرح طویل تمہید کے بعد بچوں کو ان کے اپنے ماں باپ کے آپس کے میل ملاپ کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔ میں ان صاحبان سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرے نزدیک صرف خوف زدہ افراد ہی اس لمبی چوڑی تمہید کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ بچوں کا

معاملہ یہ ہے کہ اگر بڑوں کی مصنوعی شرم وحیا نے ان کو خراب نہ کر دیا ہو تو وہ جنس کو بھی دیگر موضوعات کی طرح فطری خیال کرتے ہیں۔

ماں باپ اگر خود جنس کے موضوع پر بچوں سے سیدھی بات نہیں کر سکتے تو پھر یہ معاملہ کسی ایسے فرد کے سپرد کر دینا چاہئے جو اس مسئلے پر کسی رکاوٹ کے بغیر آزادی سے گفتگو کرنے کے قابل ہو۔ بلوغت سے پہلے جنس کے متعلق بچے کے طرز فکر و عمل کو فطری رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ ساری زندگی یہی رویہ برقرار رہنا چاہئے۔ تاہم بلوغت کے بعد ایسا رویہ اختیار کرنا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر بچوں کی پال پوس دانش مندی سے ہو تو پھر ایسی کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

بڑی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ جو مسائل پیش آتے ہیں، کسی مثبت جنسی اخلاقیات کے بغیر ان سے نمٹنا مشکل ہے۔ عام نقطہ نظر یہ ہے کہ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو مکمل پاک دامنی سے کام لینا چاہئے اور یہ کہ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ برطانیہ میں عورتوں اور مردوں کو جدا کر کے جنسی مخالفت کے باعث جنسی تجربے کی راہ روکی جاتی ہے۔ صرف چند غیر معمولی طور پر مہم جو نوجوان ہی اس علیحدگی کو ختم کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو زیادہ چالاک ہوتے ہیں، وہ ہم جنس پرستی کی راہ اپنا لیتے ہیں، جب کہ ڈرپوک قسم کے نوجوان مشت زنی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ لڑکوں کو یہ بتایا جاتا ہے، اور ان میں سے کئی یقین بھی کر لیتے ہیں کہ یہ کام شیطانی اور نقصان دہ ہیں۔ انہیں رازداری سے بھی کام لینا پڑتا ہے کیونکہ ان باتوں کا کسی کو پتہ چل جائے تو سخت سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس قسم کی باتوں کا پتہ حادثاتی اور اتفاقی طور پر ہی چلتا ہے۔ اس لئے سزا بلا جواز تلون مزاجی سے دی جاتی ہے۔ جن کا پتہ نہیں چلتا، ان پر سزا کا خوف اور پردہ رکھنے کا بوجھ برا اثر ڈالتا ہے۔

پبلک سکولوں میں نیکی پر ذہانت کو قربان کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یوں وہ بچوں کو اس قدر مصروف اور جسمانی طور پر اس قدر تھکاوٹ زدہ رکھتے ہیں کہ انہیں جنس کے لئے فرصت اور رغبت دونوں کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس طرح موجودہ نظام میں مندرجہ ذیل نقائص پائے جاتے ہیں: اول یہ کہ وہ بچوں کے ذہن میں توہم پرستانہ قسم کی دہشت پیدا کر دیتا ہے۔ دوئم، وہ بچوں کی بڑی تعداد کو بزدل اور منافق بنا دیتا ہے۔ سوئم، وہ جنسی موضوعات سے متعلق خیالات اور

احساسات کو فحش اور پر اسرار بنا دیتا ہے۔ چوتھے وہ سائنسی تجسس کو گناہ آلود بنا کر پیش کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ تجسس یا تو ختم ہونے لگتا ہے یا پھر بیمارانہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ موجودہ نظام فرصت کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور یوں اصل میں وہ عقلی نشوونما کی راہ روکتا ہے۔

موجودہ نظام کی خامیاں خیر اپنی اپنی جگہ ہیں لیکن بات یہ ہے کہ پورے ضابطہ اخلاق کو مکمل طور پر تبدیل کئے بغیر کسی ایسے نظام کا تصور کرنا سہل نہیں جو سنگین قسم کے اعتراضات سے پاک ہو۔ جدید معاشرے کے اکثر مردوں کے لئے سن بلوغت اور شادی کے درمیان بہت سے برسوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ان برسوں کے دوران انہیں مکمل طور پر پاک دامن رہنا چاہئے تو بھی اکثر مرد ایسا نہیں کریں گے۔ اس کے باوجود اب تک موجودہ اخلاقی نظام قائم ہے، وہ نقصان اٹھائے بغیر اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ طوائفوں کے پاس جانا بری بات ہے۔ اول تو اس سے بیماری لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ طوائف کا پیشہ غیر پسندیدہ ہے۔ کم از کم اس وقت تک تو یہ پیشہ ضرور ناپسندیدہ ہے جب تک طوائفوں کو برا خیال کیا جاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے اولین جنسی تجربات، احساسات و جذبات سے محروم اور روپے پیسے کے لین دین پر مبنی ہوں تو پھر خدشہ یہ رہتا ہے کہ شادی کے بعد وہ بیوی کو طوائف خیال کرنے لگتا ہے یا دیوی سمجھتا ہے۔ یہ دونوں تصورات پر مسرت ازدواجی زندگی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

سنِ بلوغت کو پہنچنے کے بعد مشت زنی کی عادت اگر چہ اس قدر نقصان دہ نہیں جتنی کہ روایتی اخلاق کے علمبردار دعویٰ کرتے ہیں، تاہم اس سے چند خرابیاں ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ اس عادت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذات میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور اس میں جرأت مندی ختم ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات اس کی فطری جنسی تعلق کی صلاحیت بھی متاثر ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہم جنس تعلقات اس قدر نقصان دہ نہ ہوں، بشرطیکہ انہیں برداشت کیا جاتا ہو۔ تاہم ان میں بھی یہ خدشہ موجود رہتا ہے کہ کہیں فطری جنسی زندگی کو ضعف نہ پہنچ جائے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کو اگر ایک دوسرے سے جدا نہ رکھا جائے تو ان کے درمیان جنسی تعلقات کے عام ہونے کا ذرر رہتا ہے۔ اس سے نہ صرف تعلیم کے عمل کو سنگین خطرہ لاحق ہو جائے گا بلکہ

زندگی کے ایسے مرحلے پر حمل کے واقعات بھی وقوع پذیر ہونے لگیں گے جو اس کام کے لئے موزوں نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ معاشرہ اور رائے عامہ کی موجودہ صورت میں اس مسئلے کا کوئی حل ممکن ہے۔ شاید کبھی ایسا زمانہ آئے گا جب ہمارے موجودہ اخلاقی نظام کی وجہ سے عنفوان شباب میں پیدا ہونے والی نفسیاتی خرابیوں پر سنجیدگی سے توجہ دی جائے گی اور یوں لڑکوں اور لڑکیوں کو اس قسم کی آزادی دے دی جائے گی جو آج کل سمووا اور بحرالکاہل کے کئی دوسرے جزیروں میں انہیں حاصل ہے۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو پھر نوجوانوں کو مانع حمل تدابیر کی تربیت دینی پڑے گی۔ اس کے باوجود حمل ہو جائے تو اسے فوراً ختم کرنا ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ صورت حال میرے لئے پسندیدہ ہوگی۔ شاید یہ دریافت بھی ہو سکتا ہے کہ بلوغت کے برسوں میں پاک دامنی اس وقت ناقابل برداشت بوجھ کا سبب نہیں بنتی، جب یہ توقع موجود ہو کہ بیس برس کی عمر کے لگ بھگ پہنچنے کے بعد ضبط کی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ چیز جج لنڈزے کے تجویز کردہ دوستانہ شادی کے نظام کو نافذ کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یونیورسٹی کے طالب علموں کو عارضی اور بے اولاد شادیوں کی اجازت دے دی جائے تو اس سے ذہنی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے یونیورسٹی کی زندگی کا معیار بہتر ہو سکتا ہے۔

اس طرح جنسی خواہش کا ایسا حل مل جائے گا جس میں نہ بے چینی ہوگی، نہ راز داری کی ضرورت۔ اس میں نہ تو روپے پیسے کا دخل ہوگا نہ محض اتفاق ہے۔ اس حل کی نوعیت ایسی ہوگی کہ جو وقت کام کے لئے درکار ہوتا ہے، وہ خوامخواہ کی سرگرمیوں میں ضائع نہ ہوگا۔

جنسی اخلاقیات کے بارے میں کوئی بہت صریح نظریہ قائم کرنے کی ضرورت کے بغیر ہی تعلیم میں جنس کے سوال کو بلوغت سے پہلے ذہنی صحت کے تقاضوں کے مطابق حل کیا جا سکتا ہے۔ تاہم جب تک ہم اس بارے میں خاصی واضح حد تک آراء قائم نہ کر لیں کہ جنسی طرز عمل میں ہمارے نزدیک کیا شے پسندیدہ ہے اور کیا غیر پسندیدہ، اس وقت تک سکول کے آخری برسوں اور یونیورسٹی میں یہ طے کرنا دشوار ہوتا ہے کہ جنسی امور کے ساتھ کس طرح نمٹا جائے۔ عہد حاضر میں اکثر لوگوں کی جنسی اخلاقیات بے ترتیب اصولوں کا ملغوبہ ہے۔ یہ اصول زیادہ تر تین ذرائع سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اول بیویوں کی پرہیزگاری پر اصرار جو پدری خاندان کے ادارے کے لئے ضروری ہے۔ دوئم یہ مذہبی تصور کہ شادی کے بغیر ہر قسم کی جنس گناہ ہے اور تیسرے عورتوں کی

مساوات کے بارے میں جدید ترین نظریہ۔

ان تینوں عناصر میں سے پدری خاندان سے اخذ شدہ عنصر قدیم ترین ہے۔ آج کے جاپان میں اسے بقیہ دو عناصر کے بغیر دیکھا جا سکتا ہے۔ جاپان کے لوگ ہر قسم کی جنسی ممانعتوں سے بہت آزاد ہیں اور ان کی جنسی اخلاقیات میں بہت کم توہمات شامل ہیں۔ وہاں خاندان کا پدری نظام بڑی مضبوطی سے رائج ہے۔ یہ نظام تجریدی قسم کی اخلاقی وعظ بازی کے بجائے بیویوں کی ماتحتی کے حوالے سے قائم ہے۔ جاپان میں نوجوان کو اس قدر جنسی علم، جنسی گفتگو اور جنسی کھیل کود کی اجازت حاصل ہوتی ہے کہ جسے دیکھ کر یورپی لوگ بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ بالغ زندگی کی اخلاقیات کا اطلاق صرف عورتوں پر ہوتا ہے اور یہ اخلاقیات ان پر مردوں کی برتر قوت کے ذریعے بے رحمی سے ٹھونسی جاتی ہے۔ اصل میں یہ ایک قدیم نظام ہے جو مسیحی تہذیب سے پہلے کے زمانے میں کم وبیش ساری دنیا میں رائج تھا۔

ابتدائی دور کی عیسائیت نے اس عقیدے کی اشاعت کی کہ جنس فطری طور پر ناپاک ہے اور یہ کہ صرف نسل انسانی کے تسلسل کی خاطر ہی اسے برداشت کیا جا سکتا ہے جنس اگر شادی تک ہی محدود رہے تو بھی مشکل ہی سے تجردگی زندگی کے مساوی قابل احترام ہوتی ہے۔ یہاں میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا کہ عیسائیت کے ظہور سے پہلے اس قسم کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ دراصل انسانی فطرت میں کوئی ایسا عنصر پایا جاتا ہے جو انسان کو جنس مخالف کے احساسات کو قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ عیسائیت نے اس عنصر کو متوجہ کیا تھا کہ یہودیوں کے ہاں بھی جنس کے خلاف مضبوط قسم کے احکامات موجود تھے۔ تاہم وہ خود جنس کو ناپاک نہ سمجھتے تھے۔ تاریخ میں پہلی بار مسیحی اخلاقیات نے عورتوں اور مردوں کو مساوی قرار دیا تھا۔ تاہم عملی صورت حال یہ تھی کہ پاک دامنی سے گریز پر عورتوں کے مقابلے میں مردوں کے ساتھ زیادہ نرم سلوک کیا جاتا تھا۔ اس طرح عملی طور پر عیسائیت نے ویسی ہی صورت حال پیدا کر دی جو اس سے پہلے کی تہذیبوں نے پیدا کی تھی۔ البتہ ان دونوں میں یہ عظیم نفسیاتی فرق قائم رہا کہ مردوں کی جنسی آزادیوں کو گناہ قرار دیا جانے لگا۔

جنسی مساوات کے نظریئے کے فروغ سے اس نظام کو ضعف پہنچا ہے۔ اس نظریئے کے حامیوں کا کہنا یہ تھا کہ یا تو مرد عورتوں جتنے پاک باز ہو جائیں گے یا پھر عورتوں کو بھی اتنا ہی غیر محتاط ہونے کا موقع دیا جائے گا جتنے کہ مرد ہوتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر عورتوں سے پاک دامنی کا

مطالبہ نہ کیا جائے تو خاندان کے قدرتی نظام کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس خاندانی نظام کو ختم کرنا ہے تو اس کے لئے سماجی ڈھانچے میں گہری تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ اس طرح یہاں الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ مردوں کے لئے مسیحی اخلاقیات ہمیشہ سے سخت رہی ہے۔ اگر عورتوں کو بھی مردوں جتنی آزادی مل جائے تو انہیں بھی یہ اخلاقیات نا قابل برداشت حد تک سخت محسوس ہوں گی۔

جہاں تک خاندان کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا سماجی ادارہ ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ مرد اس کی تشکیل نو پر رضا مند نہ ہوں گے۔ اس ساری الجھن میں صاف راہ یہی ایک دکھائی دیتی ہے کہ ریاست باپ کی جگہ لے لے۔۔۔ یہ ایسا نظام ہے کہ جو اشتراکیت کے تحت آسانی سے قائم ہو سکتا ہے۔ البتہ نجی ملکیت اور وراثت کے نظام والے معاشرے میں اسے اختیار کرنا آسان نہ ہوگا۔ اس طریقے سے نجی ملکیت کا سوال جنسی اخلاق کے مسئلے سے مربوط ہو جاتا ہے۔ کسی شخص سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسے بچوں کی پال پوس کے لئے محنت مزدوری کرے گا جو ممکن ہے کہ اس کے اپنے نہ ہوں۔ لہٰذا پدری خاندانی نظام کے ساتھ مل کر نجی ملکیت کا نظام بیویوں سے ایک خاص حد تک پاک دامنی کا تقاضا کرتا ہے۔

دوسری طرف بیویوں سے پاک دامنی کا مطالبہ کرنا لیکن مردوں کو کھلا چھوڑ دینا جنسی مساوات کے تصور کے خلاف ہے۔ یوں بات یہ سامنے آتی ہے کہ جبر یا گناہ کے تصور کے بغیر عورتوں کو پاکباز رکھنا دشوار ہے۔ مجھے تو اس بارے میں کم ہی شبہ ہے کہ اس مسئلے کا حل باپ کی اہمیت میں واقع ہونے والی بڑی کمی اور باپوں کے بجائے بچوں کی پرورش کو ریاست کے حوالے کرنے کے بڑھتے ہوئے رجحان ہی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ کوئی اچھی بات ہو گی۔ تہذیب کی تاریخ میں ولدیت کا احساس اور باپ کے لئے بیٹے کے جذبات نہایت گہرے طور پر اہم عناصر رہے ہیں۔ میں یہ جاننے کا دعویدار نہیں کہ ان عناصر کے بغیر تہذیب کس قسم کی صورت اختیار کرے گی۔ خیر اچھائی اور برائی سے قطع نظر یہ امر طے شدہ ہے کہ بچوں کے معاملے میں ریاست کی اہمیت بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی حساب سے باپ کی اہمیت کم ہوتی جائے گی۔

نوجوانوں کی تعلیم سے تعلق رکھنے والے صاحبان ان تمام جدید مسائل اور الجھنوں پر توجہ

دینے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ اس عقیدے کو قبول کئے ہوئے ہیں کہ مذہبی اخلاقیات کو اگر بالغ افراد پر نافذ نہیں کیا جاسکتا تو بھی اسے ان لوگوں پر ٹھونسنا ضروری ہے جن کی نگرانی میں بچے دیئے جاتے ہیں۔ سکولوں اور برطانوی یونیورسٹیوں کا اخلاقی رویہ باقی دنیا کے مقابلے میں زیادہ سخت ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم اس معاشرے سے بتدریج دور ہوتی جارہی ہے۔ جس کے لئے نوجوانوں کو تیار کرنے کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی ہے۔ جنسی مساوات اور خاندان کے پدری نظام کے درمیان چونکہ بنیادی تضاد موجود ہے، اس لئے جب تک رائے عامہ اور سماجی اداروں کی موجودہ صورت برقرار رہے گی اس وقت تک میرے خیال میں اس مسئلے کا کوئی واضح حل ممکن نہیں ہے۔ بہرطور اس تضاد کے باوجود عام اخلاقی اصولوں کو پیش نظر رکھنے اور جنس کے بارے میں توہمات کو مسترد کرنے سے کئی ایک مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔

یہ ایک حتمی اصول ہونا چاہئے کہ بچوں کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے کسی طور بھی جھوٹ سے کام نہ لیا جائے گا۔ اس امر کو بھی حتمی اصول کی حیثیت حاصل ہونی چاہئے کہ ہر قسم کے موضوعات پر عقلی غور و فکر ہوسکتا ہے اور اسے سائنسی طریقے سے حل کیا جاسکتا ہے۔ اگر پدری خاندان کے تحفظ کو اخلاقیات کی بنیاد رکھنا مقصود ہے تو پھر یہ سمجھنا دشوار ہے کہ ان جنسی معاملات کو کس طرح گناہ آلود قرار دیا جاسکتا ہے جن سے اولاد نہ پیدا ہوتی ہو، حالانکہ عام طور پر اس قسم کے معاملات کو نہ صرف مسیحی اخلاقیات بلکہ فوجداری قانون بھی زیادہ ہی خطرناک قرار دیتا ہے۔

ہمیں اس چیز کا احساس بھی کرنا چاہئے کہ اگر کوئی طرز عمل بذات خود پسندیدہ ہو تو بھی یہ بات غیر پسندیدہ ہوسکتی ہے کہ اسے بے لچک نظم و ضبط یا مریضانہ خوف و ہراس کے ذریعے نافذ کیا جائے۔ یہ اصول نوجوانوں کی اخلاقی تعلیم کے ایک بڑے حصے پر حاوی ہیں۔ جہاں تک بقیہ حصے کا تعلق ہے، میرے خیال میں اس کے لئے ہمیں ان دنوں کا انتظار کرنا چاہئے جب کہ ہمارا انتشار زدہ اور تیزی سے تغیر پذیر سماج کوئی زیادہ مستحکم صورت اختیار کرلے گا۔

نوجوانوں کے ساتھ بات چیت اور دوسرے معاملات میں یہ بات اہم ہے کہ کسی طور انہیں یہ احساس نہیں دلانا چاہئے کہ جنس گندی اور پوشیدہ رکھنے والی چیز ہے، جنس ایک دلچسپ موضوع ہے اور انسانوں کا اس کے بارے میں سوچنا اور باتیں کرنا بالکل فطری امر ہے۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ نوجوانوں کی طرف سے اس مکمل طور پر فطری خواہش کے اظہار کو صاحبان اختیار بے راہ

روی سے تعبیر کرتے ہیں۔اس کا نتیجہ توقع کے برخلاف نکلتا ہے، چنانچہ جنسی امور میں نوجوانوں کی دلچسپی پہلے سے بھی بڑھ جاتی ہے اور وہ مسلسل اس بارے میں اس طرح مزے لے کر گفتگو کرتے ہیں جیسا کہ ہر ممنوعہ ثمر کے بارے میں ہوتا ہے۔ یہ گفتگو لازماً جاہلانہ اور احمقانہ ہوتی ہے، کیونکہ نوجوانوں کو ان کے اپنے تخیل کی اڑان اور خام علم کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔اکثر لڑکوں کے لئے جنس کا پورا موضوع ہنسی ٹھٹھا اور گندی کہانیوں کا معاملہ بن کر رہ جاتا ہے۔

فطری مسرت کے سرچشمہ کی حیثیت سے جنس کا پورا تصور جو کبھی تخلیق شعر کا سبب بنتا ہے، کبھی خوشی و شادمانی سے ہمیں لبریز کر دیتا ہے اور کبھی المیہ گہرائی کے ساتھ پُر جوش ہوتا ہے، ان مدرسی اخلاق پرستوں کے دائرۂ بصیرت سے خارج ہے جن کے خیال میں مسرت انگیز جنس گناہ ہے۔وہ جنس کو صرف اسی وقت اچھا سمجھتے ہیں جب وہ بے لطف اور عادی قسم کی ہو۔ یہ بدصورتی کی اخلاقیات، شاعری، خوشی اور خوبصورتی کو زندگی سے خارج کر دیتی ہے۔ وہ انسانی رشتوں میں کڑواپن اور بےلطفی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ رویہ مصنوعی شرم وحیا اور تنگ نظری کا سبب بنتا ہے اور تخیل کو تباہ کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ زیادہ آزاد رویے میں بھی خطرات مضمر ہوں، تاہم وہ موت کے بجائے زندگی کے خطرے ہوں گے۔



تعلیم میں حُب الوطنی

ہر شخص کے بہت سے مقاصد اور خواہشیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض بالکل ذاتی ہوتی ہیں اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن میں وہ دوسروں کو شریک کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اکثر لوگ دولت کے آرزومند ہوتے ہیں اور دولت کمانے کے اکثر طریقے ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے کسی گروہ کا تعاون ضروری ہوتا ہے اس گروہ کا تعین دولت کمانے کے طریقے سے ہوتا ہے۔ اکثر صورتوں میں ایک ہی کاروبار سے تعلق رکھنے والے دو مختلف ادارے ایک دوسرے کے رقیب ہوا کرتے ہیں۔ البتہ تحفظ مہیا کرنے والے محصول کے معاملے میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔

خیر، دولت ہی وہ واحد شے نہیں ہے جس کی خاطر لوگ سیاسی قسم کے گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مذہبی فرقوں، برادریوں، علمی و فکری گروہوں اور بے شمار دوسری جماعتوں میں بٹ جاتے ہیں۔ انسانوں کو تعاون و اشتراک پر اکسانے والے محرکات بہت سے ہیں۔ مفاد کی یکسانیت ایسا ہی ایک محرک ہے، جبکہ آراء میں ہم آہنگی اور خون کے رشتے ناطے دیگر محرکات ہیں۔ روتھس چائلڈ خاندان نے خون کے رشتوں کی اساس پر تعاون کو فروغ دیا۔ اس خاندان کے افراد ایک دوسرے پر اعتماد کر سکتے تھے، لہٰذا انہیں رسمی تکلفات کی ضرورت نہ تھی۔ ان کی کامیابی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ یورپ کے ہر قابل ذکر مالیاتی مرکز میں خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد موجود تھا۔ نقطہ نظر کی اکائی پر مبنی تعاون کی مثال جنگ اول کے بعد عیسائیوں کے مذہبی فرقہ کوئیکر کے انسان دوست کام میں ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ خیالات کی ہم آہنگی کے سبب اس فرقے کے لوگ آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کے قابل تھے۔ جوائنٹ سٹاک کمپنیوں اور ٹریڈ یونینوں جیسی تنظیموں میں مفاد کی آہنگی کی اساس پر باہمی اشتراک کی مثالیں دیکھی

جاسکتی ہیں۔

جب لوگ کسی مقصد کی خاطر گروہ کی صورت میں منظم ہوتے ہیں تو ان کا اجتماع محض اسی مقصد کے حوالے سے ہوتا ہے۔لہٰذا اس گروہ یا جماعت کی ذہنیت فرد کے مقابلے میں زیادہ سادہ اور خام تر ہوتی ہے۔ آیئے ہم یوں کہتے ہیں کہ نفسیاتی تحقیق کی انجمن صرف نفسیاتی تحقیق سے سروکار رکھتی ہے۔ حالانکہ اس کے تمام ارکان کو اور بھی بہت سے معاملات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ حالانکہ انفرادی طور پر اس کے ارکان کو کرکٹ کھیلنے یا کرکٹ میچ دیکھنے کا شوق بھی ہوسکتا ہے۔ مجموعی طور پر کوئی خاندان صرف خاندانی جائیداد کے امور کی دیکھ بھال کرتا ہے اور عام طور پر وہ اس مقصد کے لیے اپنے انفرادی ارکان کو قربان کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

سیاسی طور پر منظم ہونے والے جذبات غیر منظم رہ جانے والے جذبوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ اتوار کے روز فلم دیکھنے کے لئے سینما جانے کے خواہش مند لوگ مکمل طور پر غیر منظم ہجوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی سیاسی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ لیکن اس مذہبی جماعت کے لوگ زیادہ منظم اور زیادہ سیاسی اثر ورسوخ کے حامل ہوتے ہیں جو ان لوگوں کو فلم کی تفریح سے روکنا چاہتے ہیں۔ سینما کے مالکان بھی منظم ہوتے ہیں۔لہٰذا سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو اتوار کے روز سینما گھروں کو کھولنے کا مسئلہ سینما مالکان اور مذکورہ مذہبی جماعت کے درمیان جھگڑے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں عوام کی خواہشوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

کوئی خاص شخص کئی جماعتوں کا رکن ہوسکتا ہے جن میں بعض مفید، بعض نقصان دہ اور بعض بے ضرر ہوسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ فسطائیوں کی جماعت، اپنے گاؤں کی فٹ بال کلب اور انسانیاتی تحقیق کی انجمن کا رکن ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے کہ تیسری حیثیت سے وہ قابل تعریف، دوسری حیثیت سے بے ضرر اور پہلی حیثیت سے قابل نفرت ہے۔ بذات خود وہ اچھائی اور برائی کا مجموعہ ہے۔ تاہم ان جماعتوں کا اخلاقی کردار اچھا یا برا جو بھی ہو، غیر مخلوط ہوتا ہے۔ اور وہ ان کے ارکان میں نہیں پایا جاتا۔ لوگ جس مقصد کی خاطر منظم ہوتے ہیں وہی مقصد ان کی جماعت کے اچھا یا برا ہونے کا تعین کرتا ہے۔ اس تعین کا دارومدار جماعت میں اکٹھے ہونے والے لوگوں کے کردار پر نہیں ہوتا۔

ان عام سی باتوں کو یہاں دہرانے کا مقصد ان غیر معمولی نتائج تک رسائی حاصل کرنا ہے

جو ریاستوں کی صورت میں انسان کے منظم ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ کم وبیش تمام مہذب ملکوں میں ریاست وہ سب سے زیادہ طاقت ور تنظیم ہوتی ہے جس سے انسان کا تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا ریاست کا رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے مقاصد سیاسی اعتبار سے دوسرے تمام مقاصد سے زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ یہ بات اہم ہو جاتی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ جدید ریاست کے مقاصد کیا ہیں۔

ریاست کے فرائض داخلی ہوتے ہیں اور خارجی بھی۔ اس مقصد کے لئے میں مقامی حکومت کو بھی ریاست کے فرائض میں شمار کرتا ہوں۔ سرسری طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاست کے داخلی فرائض اچھے ہوتے ہیں جب کہ خارجی عزائم برے ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بیان اس قدر سادہ ہے کہ ہمیں اس کے مکمل طور پر درست ہونے کی توقع نہ کرنی چاہیے۔ ریاست کے داخلی مقاصد میں سڑکیں، روشنی، تعلیم، پولیس، قانون، ڈاک خانہ جیسے فرائض شامل ہیں۔ انتظام اور نظم ونسق کی کسی تفصیل کے بارے میں کسی شخص کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ تاہم کوئی انتشار پرست ہی یہ کہے گا اس قسم کے مقاصد بذات خود غیر پسندیدہ ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں داخلی سرگرمیوں کا تعلق ہے ریاست مجموعی طور پر شہریوں کی وفاداری اور حمایت کی مستحق ہے۔

جب ہم ریاست کے خارجی عزائم کا جائزہ لیتے ہیں تو صورتحال بدل جاتی ہے۔ باقی دنیا کے حوالے سے دیکھا جائے تو کسی بڑی ریاست کے مقاصد دو ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جارحیت کے خلاف دفاع کیا جائے اور دوسرے یہ کہ بیرونی دنیا کے استحصال میں اپنے شہریوں کی مدد کی جائے۔ جارحیت کے خلاف دفاع اگر حقیقی ہو اور بیرونی حملے روکنے کے لئے ضروری ہو تو اسے مفید قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم مشکل یہ ہے کہ مزاحمت کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، ان کو آسانی کے ساتھ بیرونی استحصال کے لئے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ بڑی ریاستیں چھوٹے ملکوں کی محنت اور قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں۔ اس مقصد کے خاطر وہ ان مسلح افواج کو استعمال کرتی ہیں جن کا ظاہری مقصد ملکی دفاع ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ حقیقت منظر عام پر آئی کہ ٹرانسوال میں سونا موجود ہے تو برطانیہ نے اس پر حملہ کر دیا۔ تب لارڈ سالسبری نے قوم کو یقین دلایا تھا کہ اس حملے کا مقصد سونے کی کانوں پر قبضہ کرنا نہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طور انگریز سونے کی کانوں تک پہنچ گئے اور جب جنگ ختم ہوئی تو ان کانوں پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا

تھا۔ایک اور مثال لیجئے۔سب جانتے تھے۔لیکن یہ بات مشتبہ ہے کہ انگریز جنوبی ایران میں وہاں کے باشندوں کی فلاح و بہبود کی خاطر داخل ہوئے تھے۔لیکن یہ بات مشتبہ ہے کہ اگر جنوبی ایران میں تیل کے وسیع ذخائر موجود نہ ہوتے تو پھر بھی انگریز کو ان لوگوں کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی ہوتی۔آج کل بھی امریکی، انگریز اور دوسری بڑی قومیں چھوٹے ملکوں کے ساتھ جو سلوک کر رہی ہیں، ان کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں۔

اس میں مبالغہ آرائی کا کوئی پہلو نہیں کہ عہد حاضر کی بڑی طاقتوں کی خارجی سرگرمیوں کا مقصد چھوٹے ملکوں کے وسائل پر قبضہ کرنا ہے۔افراد اس قسم کے کام کریں تو انہیں مجرم سمجھا جاتا ہے اور قانون انہیں سزا بھی دیتا ہے۔جب قومیں اس قسم کی کارروائیاں کرتی ہیں تو ان کے شہری انہیں قابل تعریف خیال کرتے ہیں۔

یہ ساری بحث ہمیں زیر نظر باب کے موضوع یعنی سکولوں میں حب الوطنی کی تعلیٰ و تربیت کی طرف لے آتی ہے۔اس تعلیم کے بارے میں فیصلہ کرنے کی خاطر ضروری ہے۔کہ ہم نہ صرف اس کے مقاصد بلکہ حقیقی اثرات کے بارے میں بھی واضح ہوں۔حب الوطنی، اپنے مقصد کے حوالے سے نیز ان لوگوں کے خیالات میں جو اس کی وکالت کرتے ہیں، زیادہ تر ایک اچھی شے ہے۔اپنے وطن، اپنی جنم بھومی سے محبت اور اس کے تاریخی کارناموں پر فخر، جس حد تک وہ قابل فخر ہوں، کوئی بری بات نہیں ہے۔اصل میں یہ ایک پیچیدہ جذبہ ہے۔کچھ تو اس کا تعلق اپنی سرزمین اور اپنے گرد و پیش سے محبت پر ہے۔اور کسی حدف تک اسے خاندان کی توسیع شدہ محبت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔اس جذبے کی جڑیں کچھ تو جغرافیائی ہیں اور کچھ حیاتیاتی۔تاہم بنیادی طور پر یہ جذبہ نہ تو سیاسی ہے اور نہ ہی معاشی۔یہ جذبہ اپنے وطن کے لئے ہے اور یہ دوسرے ملکوں کے خلاف نہیں ہے۔ابتدائی صورت میں یہ جذبہ ان لوگوں کے لئے ہے اور یہ دوسرے ملکوں کے خلاف نہیں ہے۔ابتدائی صورت میں یہ جذبہ ان لوگوں کے علاوہ مشکل ہی سے ملتا ہے۔جو دیہات میں رہتے ہیں اور جنہوں نے سیر و سیاحت کم ہی کی ہوتی ہے۔دیہی زمیندار یا کسان کے مقابلے میں شہری باشندے اس کے بجائے ایسے احساس کے حامل ہوتے ہیں جو زیادہ تر مصنوعی ہوتا ہے اور عام طور پر ان کی تعلیم اور اخبار بینی کا نتیجہ ہوتا ہے۔یہ احساس کم و بیش مکمل طور پر نقصان دہ ہوا کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے وطن اور ہم وطنوں کی محبت سے زیادہ غیر ملکیوں کی نفرت اور ان کے

ملکوں پر قبضہ کرنے کی خواہش پر مبنی ہوتا ہے۔ تقریباً تمام برے جذبوں کی طرح یہ جذبہ بھی وفاداری کے بھیس میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کسی شخص سے کوئی قابل نفرت جرم کروانا چاہتے ہیں جس سے وہ خوف زدہ ہو کر گریز کرتا ہو تو پھر پہلے آپ اسے پکے مجرموں کے کسی گروہ سے وفاداری کا درس دیتے ہیں اور پھر اس کے جرم کو وفاداری کے وصف کی مثال بنا کر پیش کرتے ہیں۔ حب الوطنی اس عمل کی مکمل ترین مثال ہے۔ جھنڈے کے احترام کی مثال لیجئے۔ جھنڈا قوم کے لئے اس کی فوجی صلاحیت کی علامت ہوتا ہے۔ وہ لڑائی، جنگ، فتح اور بہادری کے کارناموں کی یاد دلاتا ہے۔ برطانوی جھنڈا انگریزوں کو شیکسپیئر، نیوٹن یا ڈارون کی یاد نہیں بلکہ نیلسن اور ٹرافلگر جیسی چیزوں کی یادیں تازہ کرتا ہے۔ انگریزوں نے انسانی تہذیب کے قافلے کو آگے بڑھانے کے لئے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ اس جھنڈے کی علامت کے تحت وجود میں نہیں آئے تھے۔ لہٰذا اس علامت کا احترام کرتے ہوئے ان کارناموں کی یاد تازہ نہیں ہوتی۔ بات یہ بھی ہے کہ انگریزوں نے بہترین کارنامے انگریزوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ افراد کے طور پر سرانجام دیئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریزوں نے جو کام انگریز ہونے کی وجہ سے اور انگریز ہونے کے شعور کے ساتھ سرانجام دیئے وہ کمتر نوعیت کے ہیں۔ لیکن جھنڈا ایسے ہی کاموں کی یاد دلاتا ہے اور ان کی تعریف وتوصیف کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اب جو بات برطانوی جھنڈے کے معاملے میں درست ہے وہی دوسرے ملکوں کے جھنڈوں پر بھی لاگوں ہوتی ہے۔ یورپی مغربی دنیا میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ان کی اہم ترین اجتماعی وفاداری اس ریاست سے ہے جس کے وہ شہری ہیں اور یہ کہ وطن کی طرف سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ وہی کچھ کریں جو حکومت انہیں کرنے کے لئے کہتی ہے۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ نوجوان اس نظریئے کی مخالفت نہ کرنے لگیں، انہیں غلط اور گمراہ کن نظریوں، جھوٹی تاریخ، غلط سیاست اور غلط معاشیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انہیں دوسرے ملکوں کی بداعمالیوں کی داستان سنائی جاتی ہے، لیکن اپنے ملک کی برائیوں پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ ان کے ملک نے ہمیشہ جارحیت کے خلاف دفاعی جنگیں لڑی ہیں۔ یہ جارحیت ہمیشہ غیر ملک کرتے رہے ہیں۔ انہیں یہ درس بھی دیا جاتا ہے کہ اگر کبھی ان کے ملک نے دوسرے ملکوں پر قبضہ کیا بھی ہے تو صرف تہذیب وشائستگی پھیلانے کے لئے، یا پھر ایمان کی روشنی اور ایسے ہی دوسرے شریفانہ مقاصد کے لئے اس نے یہ قدم اٹھایا

ہے۔نوجوانوں کو یہ اطلاع بھی دی جاتی ہے کہ بیرونی قوموں کا کوئی اخلاقی معیار نہیں ہوتا اور یہ کہ قدرت کا فرض ہے کہ وہ کافروں کو ملیامیٹ کردے۔ سمجھا جاتا ہے کہ خدا یہ کام ضرور کرے گا اور بالآخر سارے وحشی اور کافر صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے ہر قوم دوسری قوموں کے ساتھ لین دین میں اس قدر جرائم کا ارتکاب کرتی ہے جس قدر جرائم کو اس کی فوجی قوت ممکن بناتی ہے۔شہری، یہاں تک کہ شائستہ اور مہذب شہری بھی، ان سرگرمیوں کی پوری تائید وحمایت کرتے ہیں جوان جرائم کو ممکن بناتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ حقائق کو صحیح پس منظر میں دیکھ ہی نہیں سکتے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عام شہری لوٹ مار کی خاطر لاشعوری طور پر قتل و غارت کے جرم میں شریک ہو جاتا ہے۔اس کی اس مکروہ حرکت پر آمادگی کے لئے زیادہ تر تعلیم کو موردالزام ٹھہرانا چاہئے۔ بعض لوگ اس سلسلے میں پریس پر الزام لگاتے ہیں۔تاہم میرے نزدیک وہ غلطی پر ہیں۔ بات یہ ہے کہ پریس ویسا ہی ہوتا ہے جیسے عوام چاہتے ہیں اور عوام فضول قسم کے اخبارات کے دلدادہ اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کی تعلیم و تربیت ہی فضول طریقے سے ہوئی ہوتی ہے۔قوم پرستانہ طرز کے جذبہ حب الوطنی کی سکولوں میں تدریس کی بجائے طالب علموں کو یہ بتانا چاہئے کہ یہ اجتماعی ہسٹریا کی ایک شکل ہے جس کا شکار بدقسمتی سے عام لوگ ہو جاتے ہیں اور جس کے خلاف لوگوں کو ذہنی اور اخلاقی طور پر مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قوم پرستی ہمارے زمانے کی سب سے زیادہ خطرناک بدی ہے۔ وہ شراب نوشی، منشیات، کاروباری بددیانتی اور ان تمام برائیوں سے زیادہ خطرناک ہے جن کی طرف روایتی اخلاقی تعلیم کا رخ رہا ہے۔ دنیائے جدید کا علم رکھنے والے صاحبان اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ قوم پرستی کے سبب مہذب انداز زندگی کو برقرار رکھنے کا عمل خطرے کی زد میں آ گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی امور سے واقفیت رکھنے والے تمام لوگ اس خطرے سے اچھی طرح باخبر ہیں۔اس کے باوجود دنیا بھر میں ہر جگہ عوامی وسائل اس تباہ کن بدی کو پھیلانے اور اس کی شدت میں اضافہ کرنے پر خرچ ہو رہے ہیں اس کے برعکس جو لوگ بچوں کو قتل و غارت کا درس دینے کو اچھا نہیں سمجھتے انہیں غدار قرار دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ فرض کرے کہ والدین کو چونکہ اپنے بچوں سے فطری محبت ہوتی ہے۔لہٰذا انہیں اس خیال سے وحشت ہوگی کہ ان

کے بچے دکھ درد کی حالت میں مریں۔ لیکن حقیقی صورتحال یہ نہیں ہے۔ خطرہ گو یقینی ہے لیکن اکثر ملکوں میں ارباب اقتدار اس خطرے سے عہدہ برآ ہونے کی تمام کوششوں کو شرارت آمیز اور شیطانی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ فوجی ملازمت کو اپنے وطن کے دفاع کے لئے شریفانہ تیاری کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے اور نوجوان کو اس امر سے آگاہ کرنے کے لئے ایک لفظ بھی نہیں کہا جاتا کہ اگر ان کا ملک طاقتور ہے تو اس کے فوجی اقدامات ملکی دفاع سے زیادہ بیرونی جارحیت کے لئے ہوں گے۔

حب الوطنی کی تعلیم پر کئی اعتراض کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں کہ قوم پرستی کے زہر کو ختم کئے بغیر تہذیب کی بقاء خطرے میں رہے گی۔ اعتراض یہ بھی ہے کہ جس ادارے میں نوجوان کو قتل و غارت کی تعلیم دی جاتی ہو، اس میں طرز عمل کے مہذب انسانی تصورات کی تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ ایک اور اعتراض یہ ہے کہ نفرت کی تعلیم، جو کہ قوم پرست تعلیم کا لازمی جزو ہے، بذات خود ایک بری شے ہے۔ تاہم ان سب سے بڑھ کر خالص عقلی قسم کا اعتراض یہ ہے کہ قوم پرستی کی تعلیم غلط اور گمراہ کن اصولوں کی تعلیم کو شامل حال رکھتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں بچوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ان کا ملک بہترین ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک کے سوا باقی تمام ملکوں میں یہ تعلیم غلط ہے۔ اب چونکہ اقوام عالم اس امر پر متفق نہیں ہو سکتیں کہ دنیا کا بہترین ملک کون سا ہے، لہٰذا بہتر یہی ہو گا کہ دوسری قوموں کو پیچھے چھوڑ کر کسی ایک قوم کی خوبیوں پر زور دینے کی عادت ختم کر دی جائے۔ میں اس بات سے آگاہ ہوں کہ یہ تصور کہ بچوں کو وہی کچھ پڑھایا جائے جو درست ہو، تخریبی اور بعض صورتوں میں خلاف قانون بھی قرار پائے گا۔ اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ سچ کی تعلیم جھوٹ کی تعلیم سے بہتر ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے تمام ملکوں میں ایک جیسی تاریخ پڑھائی جانی چاہیے اور تاریخ کی نصابی کتب بڑے ملکوں کی مدد سے اقوام متحدہ کی طرف سے تیار ہونی چاہئیں۔ تاریخ کو قومی کے بجائے عالمی تاریخ ہونا چاہیے اور اسے جنگوں کے بجائے ثقافتی و تہذیبی اہمیت کے واقعات پر زور دینا چاہیے۔ جنگوں کا ذکر ہو بھی تو صرف فاتحین کے نقطہ نظر سے نہیں ہونا چاہئے۔ نہ ہی دلیرانہ کارناموں پر ساری توجہ دینی چاہئے۔ اس کے بجائے طلبہ کو جنگوں کو تباہ کاریوں اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی مصائب سے روشناس کروانا چاہیے۔ اس وقت تاریخ کی صورتحال یہ ہے کہ

بس جنگوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ سکولوں کی تعلیم کے مقابلے میں امن پسندوں کی کاوشیں بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں۔ بلاشبہ یہ بات امیر لوگوں کے سکولوں کے بارے میں زیادہ درست ہے جو ہر جگہ اخلاقی اور ذہنی طور پر غریبوں کے مدرسوں سے زیادہ پسماندہ ہیں۔

سکولوں مین بچے دوسری قوموں کی خامیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں تو علم حاصل کرتے ہیں، لیکن اپنی قوم کے نقائص کے بارے میں انہیں بے خبر رکھا جاتا ہے۔ اس قسم کی تاریخی تعلیم راہ حق پر ہونے کی خود فریبی اور جنگجو احساسات پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس اپنی قوم کی خرابیوں سے آگاہی فائدہ بخش ثابت ہوتی ہے۔ اپنی قومی تاریخ کے سیاہ پہلوؤں سے بے خبری کی بنا پر ہر مہذب ملک کا عام شہری خود فریبی میں ڈوبا رہتا ہے۔ وہ دوسری قوموں کے بارے میں وہ سب کچھ جانتا ہے جو خود نہیں جانتیں۔ لیکن غیر لوگ اس کے ملک کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں، وہ خود اس سے لاعلم رہتا ہے۔

حب الوطنی کی تعلیم کا بڑا حصہ عقلی لحاظ سے گمراہ کن ہوتے ہوئے بھی اخلاقی اعتبار سے بے ضرر ہے۔ بات یہ ہے کہ جو پڑھانے والے ہیں، ان کی اپنی تعلیم بھی غلط نظام کے تحت ہوئی ہوتی ہے۔ ان کو یہ محسوس کرنے کی عادت ہو چکی ہے کہ ایک ایسی دنیا میں جہاں ساری غیر قومیں بدطینت ہیں، اپنے وطن کو تباہی سے بچانے کے لئے عظیم الشان فوجی تیاریاں ضروری ہیں۔ ملک کی محبت کے پراپیگنڈہ کا ایک کم بے ضرر پہلو بھی ہے۔ بعض مفادات صرف ہتھیار بنانے والوں کے ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے بھی ہیں جنہوں نے غیر ترقی یافتہ ملکوں میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ اس کی مثال یوں لیجئے کہ اگر آپ کسی قدر بدنظمی کے شکار ملک میں تیل کے مالک ہیں تو پھر تیل نکالنے کے اخراجات دو حصوں پر مشتمل ہوں گے، اوّل تو تکنیکی یعنی تیل نکالنے کے اخراجات اور دوسرے سیاسی یا فوجی اخراجات جو مقامی لوگوں کو قابوں میں رکھنے پر خرچ ہوں گے۔ ان اخراجات کا صرف پہلا حصہ ہی آپ کو برداشت کرنا ہوگا۔ دوسرا حصہ پہلے سے کہیں زیادہ ہو سکتا ہے۔ اس کا بوجھ ٹیکس دہندگان کے کندھوں پر پڑتا ہے اور انہیں وطن کی محبت کے پراپیگنڈہ کے ذریعے یہ بوجھ برداشت کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے حب الواطنی اور مالیات کے درمیان ایک انتہائی ناپسندیدہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے نوجوانوں کو احتیاط کے ساتھ بے خبر رکھا جاتا ہے۔

حب الوطنی کی زیادہ انتہا پسند صورتوں کا روپے پیسے کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ملک کی مسلح افواج اس کے شہریوں کی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے استعمال کی جاسکتی ہیں اور کی بھی جاتی ہیں۔ یہ کام کسی حد تک تاوان اور خراج کی وصولی کے ذریعے ہوتا ہے اور کسی حد تک ایسے قرضوں کی ادائیگی پر مجبور کر کے جو بصورت دیگر ادا نہ ہو سکتے ہوں، اسی طرح خام مال پر قبضہ کر کے اور جبری تجارتی معاہدوں کے ذریعے بھی یہ کام کیا جاتا ہے۔ اب اگر اس سارے عمل پر جذبہ حب الوطنی کی شان و شوکت کا ملمع نہ چڑھایا جائے تو اس کی برائیاں اور خامیاں تمام ہوش مند لوگوں پر عیاں ہو جائیں۔

لوگ چاہیں تو تعلیم آسانی سے نسل انسانی کی یکجہتی کا احساس پیدا کر سکتی ہے۔ اس طرح طرح وہ بین الاقوامی تعاون کی اہمیت کا احساس بھی دلا سکتی ہے۔ یوں ایک نسل کے اندر اس فساد انگیز قوم پرستی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ جس نے دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اسی طرح ایک نسل کے اندر اندر محصولات کی وہ دیواریں گرائی جا سکتی ہیں جو ہمیں غریب بنا دیتی ہیں۔ اس اسلحہ بندی کو ختم کیا جا سکتا ہے جو ہمیں موت اور تباہی کے خطرے سے دوچار کر رہی ہے اور اس نفرت کی جگہ دوستانہ جذبات پیدا کئے جا سکتے ہیں جس سے ہم خود اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں۔ قوم پرستی کا جو جذبہ چاروں طرف طوفان بدتمیزی برپا کر رہا ہے، زیادہ تر مدرسوں کی پیداوار ہے۔ اب اگر اسے ختم کرنا مقصود ہے تو تعلیم میں ایک نئی روح پھونکنا ہوگی۔

اسلحہ بندی کے خاتمے کی طرح اس معاملے کو بھی بین الاقوامی معاہدے کے ذریعے حل کرنا ہوگا۔ اقوام متحدہ کو اگر حملہ آوروں کی لیپا پوتی سے فرصت ملے تو شاید اسے جلد یا بدیر اس معاملے کی اہمیت کا احساس بھی ہو جائے گا۔ شاید حکومتیں تاریخ کی یکساں تدریس پر متفق ہو سکتی ہیں۔ شاید اگلی جنگ عظیم کے بعد بھی بعض قومیں بچ جائیں تو وہ اپنے اپنے قومی جھنڈوں کی جگہ اقوام متحدہ کے جھنڈے کے لئے خالی کرنے پر رضا مند ہو جائیں۔ خیر اس میں شک نہیں کہ ابھی یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ اساتذہ کی فطرت یہ ہے کہ جو تھوڑا بہت وہ جانتے ہیں، وہی کچھ پڑھا دیتے ہیں۔ اب ذرا فرض کیجئے کہ تاریخ کے انگریز اساتذہ بین الاقوامی معاہدے کے تحت عالمی تاریخ پڑھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں تب ان کو سن ہجری کی تاریخ اور قسطنطنیہ کی شکست کی تاریخ بھی تلاش کرنی پڑے گی۔ انہیں چنگیز خان اور ایوان جابر کے بارے میں علم حاصل کرنا ہوگا۔ انہیں یہ بھی

جاننا ہوگا کہ یونانیوں نے پہلے پہل کب مہاتما بدھ کے مجسمے بنانے شروع کیے تھے۔ جب ان کے وقت پر یہ سب مطالبات کیے جائیں گے تو ان کے غصے کی کوئی حد نہ رہے گی۔ وہ ایسی حکومت کا مطالبہ کرنے لگیں گے جو اقوام متحدہ کی خلاف ورزی کا وعدہ کرے۔ مجموعی طور پر یہ تباہی کی طرف لے جانے والی قوت ہے۔ دوسری طرف حالت یہ ہے کہ انسانوں کے وہ گروہ جو کوئی اچھا کام کر سکتے ہیں، جیسے مثلاً اساتذہ کرام، وہ زیادہ تر موجودہ حالات پر ہی قانع ہیں۔ سماجی اصلاح کی ہر کوشش چونکہ ان کے اسباق میں تبدیلی کا تقاضہ کرتی ہے۔ لہٰذا ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اصلاح کے ہر قدم میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ جس کوشش اور تگ ودو سے وہ دامن چھڑانا چاہتے ہیں، وہ نہ صرف عقلی بلکہ جذباتی نوعیت کی حامل بھی ہوتی ہے۔ جانے پہچانے جذبے آسانی سے پیدا ہو جاتے ہیں جبکہ معمول کے مواقع، جیسے مثلاً قومی ترانہ گائے جانے کا وقت، پر نئے جذبوں کو محسوس کرنے کی خود کو عادت ڈالنا دشوار ہوتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری جدید دنیا جس میں اچھے لوگ سستی و کاہلی کا شکار ہیں اور برے لوگ سرگرم کار ہیں، بدمستی کے سے عالم میں تباہی کے غار کی طرف لڑھکتی جا رہی ہے۔ چند لمحے ایسے آتے ہیں کہ جب انسان تباہی کے اس غار کو دیکھ لیتے ہیں، لیکن غیر حقیقی جذبوں کا خمار جلد ہی ان کی آنکھیں بند کر دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس نشے سے محفوظ ہیں، ان کے لئے خطرہ بالکل واضح ہے۔ ہماری تہذیب کو تباہی کے غار کی طرف دھکیلنے میں سب سے بڑا کردار قوم پرستی کا جذبہ ادا کر رہا ہے۔



تعلیم میں مقابلے کا تصور

انیسویں صدی کے غالب نصب العین میں سے کچھ تو ختم ہو چکے ہیں اور کچھ ہمارے زمانے تک برقرار ہیں۔ برقرار رہنے والے نصب العینوں میں سے اکثر کا ہماری آج کی زندگی میں عمل دخل ایک صدی پہلے کے مقابلے میں بہت محدود ہو گیا ہے۔ مقابلے کا نصب العین اس سلسلے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ میرے خیال میں مقابلے کے تصور میں یقین کو ڈارون کے نظریے سے منسوب کرنا غلط ہے۔ اصل میں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مقابلے میں یقین نے ڈارون کے نظریے کو جنم دیا تھا۔ جدید ماہرین حیاتیات ارتقا میں تو یقین رکھتے ہیں، لیکن ارتقا کی قوت محرکہ کے طور پر وہ ڈارون کے مقابلے میں مسابقت کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ یہ تبدیلی اصل میں اس تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے جو معاشرے کے معاشی ڈھانچے میں رونما ہوتی ہے۔

صنعتی زمانے کا آغاز ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے والے چھوٹے چھوٹے اداروں سے ہوا تھا۔ شروع میں ان اداروں کو ریاست کی طرف سے بہت کم مدد ملتی تھی۔ اس زمانے میں ریاست ابھی تک زرعی اور اشرافی نوعیت کی حامل تھی۔ لہٰذا ابتدائی دور کے صنعت کار اپنی مدد آپ، حکومت کی طرف سے عدم مداخلت اور مقابلے کے قائل تھے۔ مسابقت کا تصور صنعتی ادارے سے دوسرے حلقوں تک پھیل گیا۔ ڈارون نے عوام کو یہ یقین دلایا کہ زندگی کی مختلف صورتوں کے درمیان مقابلہ ارتقائی پیش رفت کا سبب ہے۔ ماہرین تعلم بھی یہ یقین کرنے لگے کہ طالب علموں میں محنت و مشقت کو فروغ دینے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان میں مقابلے کو رواج دیا جائے۔ آجروں نے آزاد مقابلے کے عقیدے کو ٹریڈ یونین کی جدوجہد کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لاطینی امریکہ کے پسماندہ علاقوں میں اب بھی اسے اس طور استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم خود سرمایہ داروں کے درمیان مقابلہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ صنعتوں کو قومی سطح پر متحد کرنے

کا رجحان بڑھتا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ تر مقابلہ کسی ایک قوم کے مختلف سرمایہ داروں میں نہیں رہا بلکہ اس نے مختلف قوموں کے درمیان مقابلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ سرمایہ داروں کی فطری خواہش یہ رہی ہے کہ اگر چہ وہ آپس میں متحد ہوتے جائیں لیکن ان کے محنت کشوں میں اتحاد پیدا نہ ہو۔ ان کا اصول یہ رہا ہے کہ ''اکٹھے ہو کر ہم کامیاب ہوں گے اور مزدور تقسیم ہو کر نا کام رہیں گے، لہٰذا بڑے بڑے صنعت کاروں کی سرگرمیوں کے دائرے سے باہر زندگی کے ہر شعبے میں مقابلے کو عظیم نصب العین کی حیثیت سے برقرار رکھا گیا ہے جہاں تک بڑے سرمایہ داروں کا تعلق ہے، مقابلہ ان کے لیے قومی ہے۔ اس لیے وہ حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

تعلیم کے شعبے میں مقابلے میں نصب العین نے دو قسم کی خرابیاں پیدا کی ہیں۔ ایک طرف تو اس نے زندگی کے مختلف شعبوں اور خاص طور پر بین الاقوامی امور میں تعاون و اشتراک کے بجائے مقابلے کا احترام کرنے کا درس دیا ہے۔ دوسری طرف اس نے کلاس روم، نیز وظائف حاصل کرنے اور بعد ازاں روزگار کی تلاش میں مقابلے کے ایک وسیع نظام کا جال بچھا دیا ہے جہاں تک روزگار کی تلاش کا معاملہ ہے، ٹریڈ یونین جدو جہد نے محنت کشوں کی حد تک مقابلے کی سختی کو قدرے کم کر دیا ہے، تاہم پیشہ ور افراد کے لیے اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

تعلیم کے شعبے میں مقابلے کے تصور نے سب سے بڑی خرابی یہ پیدا کی ہے کہ خاص طور پر بہترین طلبہ ضرورت سے زیادہ تعلیم پر مائل ہو گئے ہیں۔ شمالی اور جنوبی امریکہ میں تو نہیں، البتہ مغربی یورپ کے تمام ملکوں میں فی زمانہ ایک خطرناک رجحان یہ ہے کہ نوجوانوں پر تعلیم کا بوجھ اس قدر لاد دیا جائے کہ نہ صرف ان کی قوت تخیل اور ذہانت بلکہ جسمانی صحت پر بھی برا اثر پڑنے لگتا ہے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ زیادہ ہوشیار بچے ہی اس رجحان سے زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ ہر نسل کے بہترین دماغ اور بہترین تخیل مقابلے کے عظیم دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیئے جاتے ہیں۔ میری طرح جس کسی کو بھی یونیورسٹی میں ایک نسل کے بہترین دماغوں سے میل جول کا تجربہ ہوا ہے، وہ یہ جان سکتا ہے کہ بچپن میں حد سے زیادہ دباؤ ڈالنے سے پہنچنے والا نقصان ہولناک ہوتا ہے۔ امریکہ کا تعلیمی نظام مغربی یورپ کے مقابلے میں کئی حوالوں سے کمتر ہے لیکن اس معاملے میں امریکیوں کی صورت حال بہتر ہے۔ یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے نوجوان امریکی

شاذونادر ہی تہذیب کی اس ہمہ گیری اور خالص علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں جو کہ یورپ کے تعلیم یافتہ طبقے کا خاصہ ہے، تاہم ان میں علم کے، لیے محبت، تحقیق کی تڑپ اور عقلی پیش قدمی کی ایسی تازگی پائی جاتی ہے جس کی جگہ یورپ میں ہمیں ایک بے زار کرنے والی اور افسردہ درستگی نظر آتی ہے۔ علم کی محبت سے محروم ہوئے بغیر علم حاصل کرنا دشوار ہے اور یورپ کے ماہرین تعلیم اس مشکل کا کوئی حل نہیں ڈھونڈ سکے ہیں۔

ایک اوسط درجے کا استاد سب سے پہلے نوجوانوں کے تخیل کو ملیا میٹ کرنے کا کام شروع کرتا ہے۔ تخیل ایک سرکش، غیر منظم، انفرادی اور اس قسم کی قوت ہے جس پر درستگی یا غیر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان تمام حوالوں سے تخیل استاد کے لیے پریشان کن ہوتا ہے۔ اس کی پریشانی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب مسابقت کڑی درجہ بندی کا تقاضا کرتی ہو۔ تخیل کے صحیح برتاؤ کا مسئلہ کچھ اس وجہ سے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اکثر بچوں کی حقیقی دنیا میں دلچسپی جب زیادہ ہوتی ہے تو تخیل خود بخود زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ جن بالغوں میں قوت متخیلہ مضبوط رہتی ہے، اصل میں وہی ہوتے ہیں جو لڑکپن ہی سے اسے حقیقت کی دنیا کے اثر سے آزاد رکھتے ہیں۔ بہر طور اگر بالغ تخیل کو قابل قدر ہونا ہے تو پھر حقیقت سے اس کی نجات کو جہالت کے بجائے غلامانہ رویوں کے فقدان سے جنم لینا چاہیے۔

زیادہ ٹھوس امور تک رسائی کے لیے بچوں کی ڈرائنگ اور تصویر کشی جیسے معاملے ہی کو لیجیے۔ پانچ سے آٹھ برس تک کی عمر کے اکثر بچوں کی اگر حوصلہ افزائی کی جائے اور انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ تصویری انداز کے تخیل کا کافی حد تک ثبوت دیتے ہیں۔ بعض بچے، جن کی تعداد بہت کم ہوا کرتی ہے، خود تنقیدی کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد بھی تصویر کشی کی خواہش کو برقرار رکھتے ہیں لیکن اگر ان پر زور دیا جاتا رہے کہ وہ احتیاط سے نقل بنائیں اور درست منظر کشی کریں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا رویہ بتدریج فنی کے بجائے سائنسی ہوتا چلا جاتا ہے اور ان کی تصویریں تخیل کی کسی کارفرمائی کی عکاسی نہیں کرتیں۔ اگر اس صورتحال سے بچنا مقصود ہے تو جب تک بچے خود نہ پوچھیں، انہیں یہ نہیں بتلاتے رہنا چاہیے کہ وہ تصویر صحیح اور حقیقت کے مطابق بنائیں۔ مزید برآں انہیں یہ سوچنے کا موقع بھی نہ دینا چاہیے کہ درستگی کوئی خوبی ہے۔ استاد کے لیے یہ ایک مشکل بات ہے کیونکہ فنی کمال رائے اور انفرادی ذوق کا معاملہ ہے جب کہ درستی کی معروضی طور پر جانچ کی جا

سکتی ہے۔ جب تک استاد غیر معمولی استعداد کا مالک نہ ہو، سکول کی تعلیم کا سماجی عنصر اور کسی جماعت کا رکن ہونے کی حقیقت ایسی خوبی پیدا کرنے کا میلان رکھتی ہے جس کا دارومدار ذاتی خوبی کے بجائے سماجی طور پر قابل توثیق خوبیوں پر ہو۔ ذاتی خوبی کے تحفظ کے لیے تدریس کو کم از کم رکھنا ضروری ہے۔ علاوہ یہ بات بھی ضروری ہوتی ہے کہ تنقید کو اس حد تک نہ بڑھا دیا جائے کہ وہ ذات کے اظہار میں بزدلی پیدا کردے۔ تاہم ان صولوں کی روشنی میں کوئی ایسا کام کرنا دشوار ہی ہے جو تعلیمی حکام کو پسند آسکے۔

قدرے بعد کے مرحلے پر اسی شے کا اطلاق ادب کی تعلیم پر بھی ہوتا ہے۔ اساتذہ کرام بہت زیادہ پڑھانے کا رجحان رکھتے ہیں اور وہ اس قسم کے احمقانہ اصول بھی بنائے رکھتے ہیں کہ کوئی جملہ ''اور'' یا ''لیکن'' سے شروع نہ ہونا چاہیے۔ بلاشبہ گرامر کے طے شدہ اصولوں کا خیال رکھنا چاہیے لیکن سچی بات یہ ہے کہ گرامر میں اس سے زیادہ لچک موجود ہے جتنی کہ اکثر استاد فرض کرتے ہیں۔

مصوری کی طرح ادب کے معاملے میں بھی خطرہ یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فنی کمال کی جگہ درستی کو مل جائے۔ ادب کی تدریس صرف مطالعے تک محدود ہونی چاہیے اور مطالعے میں وسعت کی بجائے گہرائی ہونی چاہیے۔ ایسی چیزوں کو زبانی یاد کر لینا اچھا ہے جن سے بے ساختہ خوشی حاصل ہو۔ ادبی تعلیم کے نقطہ نظر سے کسی ایسی چیز کو پڑھنا فضول ہے، چاہے وہ کتنی ہی کلاسیکی کیوں نہ ہو، جو پڑھنے والے کو حقیقی لطف عطا نہیں کرتی۔ جو ادب شوق سے پڑھا جائے اور اچھی طرح سمجھا جائے وہ الفاظ کے انتخاب اور اسلوب تحریر پر اثر انداز ہوتا ہے جبکہ سرسری پڑھا جانے والا ادب مصنوعی دانش ورانہ گفتگو کو فروغ دیتا ہے بلاشبہ طلبہ کو لکھنا بھی چاہئے اور پڑھنا چاہیے لیکن استاد کو ان کی تحریروں پر تنقید نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی انہیں یہ جتلانا چاہئے کہ اس کے خیال میں وہ کس طرح بہتر لکھ سکتے تھے۔ جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے، درس وتدریس کا کوئی کام نہ ہونا چاہیے۔

تخیل سے ذہانت کی طرف بڑھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کے خیالات یہاں بھی برمحل ہیں۔ یہ بات تھکن کے بارے میں بھی درست ہے۔ تھکن عام ہوسکتی ہے اور خاص بھی۔ عام تھکن پر توجہ صحت کے ضمن میں دینی چاہیے البتہ ذہنی تربیت سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کو خاص تھکن کے معاملہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ہمارے قارئین کو روسی ماہر نفسیات پاف لوف

کا کتا تو یاد ہو گا جس نے بیضوی شکل کو دائرے سے ممتاز کرنا سیکھ لیا تھا لیکن پاف لوف بیضوی اشکال کو بتدریج دائرے کے قریب تر لاتا گیا۔ یہاں تک کہ آخری مرحلہ آ گیا جہاں بڑے اور چھوٹے محور میں آٹھ اور نو کی نسبت رہ گئی۔ اس مقام پر کتے کے امتیاز کرنے کی قوت ختم ہو گئی اور ساتھ ہی اس نے دائروں اور بیضوی شکلوں کے بارے میں سیکھے ہوئے پچھلے سارے سبق بھی بھلا دیئے۔

سکول میں اکثر بچوں اور بچیوں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آتا ہے۔ اگر انہیں ایسے مسائل حل کرنے پر مجبور کیا جائے جو یقینی طور پر ان کی صلاحیت سے بالاتر ہوتے ہیں تو پھر ایک قسم کی پریشان کن دہشت ان کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ یوں بچے نہ صرف موجودہ مسائل سے گھبرانے لگتے ہیں بلکہ ذہنی لحاظ سے متعلقہ موضوعا بھی ان کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ محض اس لیے زندگی بھر ریاضی کے مضامین میں پھسڈی رہتے ہیں کہ ان مضامین میں ان کی تربیت بہت چھوٹی عمر میں شروع ہو جاتی ہے۔ سکول میں بچے کی جن صلاحیتوں کو آزمایا جاتا ہے، ان میں سے تجریدی استدلال کی صلاحیت سب سے آخر میں ترقی پاتی ہے۔ ماہر نفسیات پیاژے نے اپنی قابل قدر کتاب ''بچے کی قوت فیصلہ و استدلال'' میں جو اعداد و شمار فراہم کیے ہیں، ان سے اس خیال کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ جب تک کوئی استاد نفسیاتی بصیرت اور تجربے کا مالک نہ ہو، وہ یہ نہیں جان سکتا کہ بچے کا ذہن بڑی حد تک گذمڈ ہوتا ہے۔ جب تک درست لفظی جواب ملتا رہے، یہ فرض کیا جاتا ہے کہ بچہ سوال کو سمجھ رہا ہے۔ حساب اور ریاضی کے مضامین عام طور پر بہت ابتدائی عمر میں سکھے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے معاملے میں اکثر طالب علم کند ذہن رہ جاتے ہیں۔ اس قسم کی بدبختی سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ استاد نفسیات کا کسی قدر علم، تدریس کے فن میں کافی حد تک تربیت اور اس معاملے میں آزادی کا حامل ہو کہ وہ ضرورت پڑنے پر نصاب میں لچک پیدا کر سکے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ غریبوں کو پڑھانے والے استادوں میں تو پڑھانے کے فن میں مہارت کو پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے، جب کہ ''شرفا'' کے بچوں کو ابھی تک غیر تربیت یافتہ استاد ہی پڑھاتے ہیں۔ یہ امارت پرستی کے ناقابل پیش گوئی نتائج میں سے ایک ہے۔

تھکن ذہانت کے حقیقی معیار کو نقصان پہنچاتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک خطرناک چیز ہے۔ ذہنی امور

میں دلچسپی کی حوصلہ شکنی اگر چہ بہت زیادہ نقصان دہ ہے لیکن تھکن سے کم تباہ کن ہے۔ یہ حوصلہ شکنی اس واقعہ سے پیدا ہوتی ہے کہ جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ مکمل طور پر بے فائدہ ہوتا ہے (یا کم از کم محسوس ہوتا ہے) مثال کے لیے سولڑکوں کی کوئی عام سی جماعت لے لیجئے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ان میں سے نوے صرف سزا کے ڈر سے پڑھتے ہیں۔ نو کامیابی کے لیے مسابقت کی خواہش کے تحت اور صرف ایک علم سے محبت کی خاطر پڑھتا ہے۔ یہ افسوسناک صورتحال ناگزیر نہیں ہے۔ پڑھائی کے اوقات کم کر کے، اسباق کو رضا کارانہ بنا کر اور اچھی تدریس کے ذریعے ستر فیصد طلبہ کو علم کی محبت کے حوالے سے پڑھنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ جب اس محرک کو بروئے کار لایا جائے تو بچے کی توجہ خود بخود کسی دباؤ کے بغیر پڑھنے لکھنے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تھکن بڑی حد تک ختم ہو جاتی ہے اور قوت حافظہ بڑی حد تک بہتر ہو جاتی ہے۔ علم کے حصول میں خوشی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یوں رسمی پڑھائی کے بعد بھی علم حاصل کرنے کے عمل کے جاری رہنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ شوق سے پڑھا جائے تو تھوڑے وقت میں اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے جتنا کہ مجبوری اور بوریت کے ماحول میں زیادہ وقت تک پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ تاہم استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے درس و تدریس کو اس قابل بنائیں۔ دھونس کے ذریعے شاگردوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش نہ کی جائے کہ جو کچھ استاد پڑھا رہا ہے، وہ بہت اہم ہے۔

یونیورسٹی تعلیم کے سوا ہر قسم کی تعلیم کا ایک عقلی نقص یہ ہے کہ وہ اطاعت کے جذبے کو پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ یقین کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے کہ جائز طور پر بحث طلب مسائل کے معین جواب موجود ہیں۔ یہاں مجھے ایک واقعہ اور یاد آیا ہے کہ ہم چند دوست اس امر پر بحث کر رہے تھے کہ شیکسپیئر کا بہترین ڈرامہ کون سا ہے۔ ہم میں سے اکثر غیر رسمی آرا کے حق میں دلائل پیش کر رہے تھے۔ اس موقع پر حال ہی میں یونیورسٹی میں آنے والے ایک ہوشیار نوجوان نے ہمیں وثوق سے بتایا کہ ہیملٹ شیکسپیئر کا بہترین ڈرامہ ہے۔ یہ اس قدر گھسی پٹی بات تھی کہ بحث جاری نہ رہ سکی۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ کا ہر پادری جانتا ہے کہ روم کے زوال کے اسباب کیا تھے۔ آپ اس سے یہ سوال کریں تو وہ فوراً اہل روم کے اخلاقی زوال کا ذکر چھیڑ دے گا لیکن اس قسم کے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا اس سے بے خبری ہی رہتے ہیں کہ روم

کے مغربی سلطنت کے زوال سے دو صدیاں پہلے لوگوں کے اخلاق مثالی بن چکے تھے۔ انگریز بچوں کو انقلاب فرانس کے ایک ایک پہلو کی تعلیم دی جاتی ہے اور فرانسیسی بچے اس انقلاب کے ایک دوسرے پہلو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان دونوں میں سے درست کوئی بھی نہیں۔ تاہم ان دونوں صورتوں میں استاد سے اختلاف کی جرات کو انتہائی بدتمیزی سمجھا جاتا ہے اور اس کا میلان بھی کم لوگوں ہی میں ہوتا ہے۔ استادوں کو چاہیے کہ وہ اپنے شاگردوں میں عقلی اختلاف کی حوصلہ افزائی کریں بلکہ انہیں شاگردوں کو ایسی کتابیں پڑھنے پر راغب کرنا چاہیے جو استاد کی رائے سے مختلف نقطہ نظر کو پیش کرتی ہیں لیکن ایسا کم ہی کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم نوجوانوں میں تحقیق روح پھونکنے کے بجائے ان کے دل ودماغ بے بنیاد عقیدوں سے بھر دیتی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ نتائج صرف استاد کی کسی کوتاہی سے پیدا ہوں۔ اس میں اس نصاب کا بھی حصہ ہے جو ظاہری علم پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ اس سے جلد بازی اور ناموزوں قطعیت کی ضرورت بھی پیدا ہوتی ہے۔

ضرورت سے زیادہ تعلیم کی سب سے بڑی خرابی صحت اور خصوصاً ذہنی صحت پر پڑنے والا اس کا برا اثر ہے۔ انگلستان میں اس خرابی کا سبب لبرل فلسفے کے ماننے کا یہ نعرہ ہے کہ سب لوگوں کو یکساں مواقع مہیا ہونے چاہیں۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ تعلیم کو صرف خوشحال لوگوں کی اولاد کا امتیازی حق تصور کیا جاتا تھا۔ تاہم بجا طور پر جمہوریت کے زیر اثر یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ان تمام لوگوں کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک ہونی چاہیے جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اب جہاں تک اعلیٰ تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کا تعلق ہے اس کا دارومدار زیادہ تر ذہنی اہلیت پر ہوتا ہے۔ حل اس کا یہ تلاش کیا گیا ہے کہ بچپن میں تعلیمی صلاحیت اور بہت بڑی حد تک مقابلے کے امتحانات کی بنیاد پر بڑی تعداد میں تعلیمی وظائف دیئے جائیں۔ مقابلے کی اعلیٰ خوبیوں پر جو اعتقاد تھا، اس نے لوگوں کو سوچنے سے باز رکھا کہ بچوں پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ مقابلے کا بوجھ اگر صرف ذہنی ہوتا تو بھی ناگوار تھا لیکن اس میں تو جذباتی دباؤ بھی شامل ہوتا ہے۔ مقابلے کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بچے کا نہ صرف معاشی بلکہ سماجی مستقبل بھی طویل تیاری کے بعد مختصر امتحان میں کامیابی پر منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔ کسی غریب گھرانے کے ذہین لڑکے کی مثال پر غور کیجئے جس کی دلچسپیاں سب کی سب عقلی ہیں لیکن جس کے ساتھی لکھنے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں رکھتے، اگر وہ یونیورسٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ہم مزاج دوست تلاش کرنے اور اپنی پسند کے کام میں زندگی بسر کرنے کی

امید کرسکتا ہے لیکن ایسا نہ ہو تو پھر اس کا مقدر یہ رہ جاتا ہے کہ افلاس اور ذہنی تنہائی کے عالم میں زندگی کے دن گزار دے۔ اس متبادل صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے کم وبیش یقینی طور پر مضطرب انداز میں غیر دانش مندانہ طریقے سے محنت کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی اپنی ذہنی لچک گنوا بیٹھے گا۔

وہ تمام صاحبان اس نقص سے آگاہ ہیں جن کو کسی یونیورسٹی میں پڑھانے کا موقع ملا ہے تاہم اس کا حل تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ غالباً یہ بات ناپسندیدہ ہے اور مالی لحاظ سے تو تقریباً ناممکن ہے کہ ہر شخص کو یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم دی جائے۔ لہٰذا انتخاب کا کوئی اور طریقہ کار ہونا ضروری ہے۔ اس طریقہ کار کو لازماً زیادہ تر ذہنی صلاحیتوں پر مبنی ہونا چاہیے اچھی بات یہ ہوگی کہ طلبہ پر وہ شدید دباؤ نہ رہے جو امتحانات کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے اساتذہ کو اپنے عمومی تاثر کی بنیاد پر یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے شاگردوں میں سے چند کو منتخب کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طریقے کو استعمال کرنے سے چاپلوسی اور اپنی پسند کے افراد کو نوازنے کا سلسلہ بھی کسی حد تک شروع ہو جائے گا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ قباحتیں موجودہ نظام کی خرابیوں کے مقابلے میں کم نقصان دہ ہوں گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ یونیورسٹی تعلیم کے لیے چناؤ بارہ برس کی عمر ہی میں کر لیا جائے۔ اس کے بعد منتخب ہونے والے نوجوانوں کو مسابقت سے دور رکھنا چاہیے۔ یہ بھی ہے کہ بارہ برس کی عمر میں ان کا چناؤ مہارت کے بجائے ذہانت کی اساس پر ہونا چاہیے۔

ذہانت کی آزمائشوں میں خوبی ہے۔ انگلستان میں ان آزمائشوں کو بہت ہی کم استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ میں ان کا استعمال اس قدر زیادہ ہے کہ میرے خیال میں اس کا سائنسی جواز موجود نہیں۔ ان آزمائشوں کی خوبی یہ نہیں کہ ان میں کوئی خطا نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوئی آزمائش نہیں ہو سکتی جس میں کوئی غلطی نہ ہو۔ خوبی کی بات تو یہ ہے کہ ذہانت کی آزمائشیں مجموعی طور پر کم وبیش درست نتائج پیدا کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے لیے عام قسم کے امتحانات کی طرح تھکا دینے والی اور اعصاب شکن تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

شہری علاقوں میں اور گنجان آبادی والے دوسرے علاقوں میں بہت زیادہ ہوشیار لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک خاص طرح کے ویسے ہی خصوصی مدرسے ہونے چاہئیں جیسے کہ ذہنی طور پر

معذور بچوں کے لیے ہوتے ہیں۔ امریکہ میں اس کام کی ابتداء ہوئی ہے تاہم وہاں ابھی یہ سلسلہ بہت محدود ہے۔

بعض نتائج دلچسپ ہیں مثلاً ایک لڑکے کی ذہنی آئی کیو(I.Q) 190 تھی جبکہ اوسط حاصل تقسیم 100 تھی۔ وہ ایک عام مدرسے میں پڑھتا تھا جہاں اس کا کوئی دوست نہ تھا اور سب بچے اسے احمق خیال کرتے تھے۔ اسے لڑکوں کی ایک خصوصی جماعت کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ اس جماعت کا عمومی ذہنی آئی کیو(I.Q) 164 تھا، وہاں اس لڑکے کو فوراً ہی قائد کے طور پر قبول کر لیا گیا اور جماعت کے دوسرے لڑکے اس پر اعتماد کرنے لگے اور اس کا احترام بھی بہت کرنے لگے۔

یہ مثال ہمیں بتاتی ہے کہ ہوشیار بچوں کو اپنے کند ذہن ساتھیوں کے ساتھ زیادہ میل جول پر مجبور نہ کیا جائے تو وہ بہت سی غیر ضروری تکالیف سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچپن میں ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ سے اچھی طرح زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھا جا سکتا ہے، مجھے تو یہ بات بالکل فضول دکھائی دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص بھی بعد کی زندگی میں ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ نہیں رکھتا۔ کتاب ساز پادریوں کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں ہیں اور نہ ہی پادریوں پر پابندی ہے کہ وہ کتب سازوں کے ساتھ رہیں۔ بالغ زندگی میں کسی شخص کا پیشہ اور رتبہ اس کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ میں اپنے زمانے میں مختلف سماجی گروہوں کے درمیان رہا ہوں۔ ان میں سفارت کار، یونیورسٹی اساتذہ، امن پسند قیدی اور سیاست دان سبھی شامل تھے لیکن کسی جگہ بھی مجھے لڑکوں کی منڈلی جیسی غیر منظم بے رحمی سے پالا نہیں پڑا۔ اکثر ذہین لڑکوں نے ابھی تک اپنی ذہانت کو چھپانے کا ڈھنگ نہیں سیکھا۔ اس لیے انہیں اپنے نرالے پن کے لیے مسلسل تختہ مشق بننا پڑتا ہے۔ ان میں سے جو اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں وہ وقت کے ساتھ ساتھ عام قسم کا فرد نظر آنے کا سلیقہ سیکھ لیتے ہیں۔ خیر، میرے نزدیک تو یہ کوئی قابل قدر کامیابی نہیں ہے۔ آپ کسی باڑے سے گزریں تو وہاں آپ کو گائیں، بھیڑیں، سور، بکریاں بطخیں، مرغیاں اور کبوتر اپنے اپنے مخصوص انداز کے ساتھ دکھائی دیں گے۔ کوئی یہ تقاضا نہیں کرتا کہ بطخ کو سور کے چال چلن سیکھ کر سماجی ہم آہنگی کا ثبوت دینا چاہیے۔ تاہم مدرسے میں لڑکوں سے بالکل یہی تقاضا کیا جاتا ہے، جہاں سور حاکم بنے پھرتے ہیں۔

زیادہ ہوشیار بچوں کے لیے خصوصی سکولوں کے فوائد بہت بڑے ہیں۔ وہ نہ صرف دوسروں سے پہنچنے والی تکالیف سے بچ جائیں گے بلکہ جذباتی افسردگی اور بزدلی کا سبق سیکھنے سے بھی محفوظ رہیں گے جو اکثر بالغوں کو صاحب اقتدار احمقوں کی خاطر اپنی ذہنی صلاحیتوں کو ضائع کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خالص عقلی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس قسم کے خصوصی مدرسے ہوشیار بچوں کو زیادہ تیزی سے تعلیم مہیا کر سکیں گے یوں انہیں سنی سنائی باتوں کو دوبارہ سننے کی بوریت برداشت نہ کرنی پڑے گی۔ یہ بھی ہے کہ وہ آپس میں جو بات چیت کریں گے، اس سے ان کے علم کو تقویت پہنچے گی اور ان کے فرصت کے مشاغل کسی تمسخر کے خوف کے بغیر ذہانت آمیز ہو سکیں گے۔ اس قسم کے مدرسوں کے خلاف اعتراض کیا جا سکتا ہے، اس کا تعلق صرف انتظامی دشواریوں اور اس جمہوری جذبے سے ہو سکتا ہے جو اصل میں جذبہ رقابت سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ صورت حال تو یہ ہے کہ ہر ذہین لڑکے یا لڑکی کو عجیب و غریب ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ خصوصی مدرسوں کے قیام سے یہ احساس مٹ جائے گا۔

ہر قسم کے بڑے تعلیمی نظام کی مشکلات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے منتظمین عام طور پر استاد نہیں ہوتے۔ لہٰذا انہیں اس امر کا تجربہ نہیں ہوتا کہ کیا ممکن ہے اور کیا محال۔ جب کوئی شخص درس و تدریس کا کام شروع کرتا ہے تو بشرطیکہ وہ خصوصی طور پر ذہین طلبہ کی منتخب جماعتوں کو پڑھا رہا ہو، حیرت کے ساتھ دریافت کرتا ہے کہ نوجوان لوگ اس کی توقع سے کم سیکھتے ہیں اور سیکھنے کی رفتار اس کی توقع سے کہیں زیادہ سست ہوتی ہے۔ کوئی مضمون پڑھنے کے قابل ہو سکتا ہے البتہ ضروری نہیں کہ وہ پڑھانے کے قابل بھی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پڑھانے کے لیے جو وقت مقرر ہوتا ہے، اس کے دوران اکثر طلبہ کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ تدریسی تجربے کے بغیر جو لوگ نصاب سازی کا کام کرتے ہیں، ان کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ نصاب میں بہت کچھ ٹھونس دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گہرے طور پر کسی چیز کا علم بھی حاصل نہیں ہوتا۔ دوسری طرف ایک تجربہ کار استاد اور طرح کا تعصب رکھتا ہے اور وہ بھی اتنا ہی ناپسندیدہ ہے، چونکہ اسے شاگرد نے درست جواب دیا ہے۔ لاطینی گرامر کے دیرینہ رواج کا تعلق اسی بات سے جوڑا جاتا ہے۔ اسی حوالے سے ریاضی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ برطانیہ کے ابتدائی مدسوں میں اسے ضرورت سے بہت زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔ بے شک ایک عام آدمی کو روزمرہ کے حساب کتاب سے آگاہ ہونا چاہیے۔ تاہم اسے

ریاضی کی اس سے زیادہ ضرورت شاذونادر ہی پیش آتی ہے۔سکول میں پیچیدہ ریاضی کا جو علم وہ حاصل کرتا ہے، بعد کی زندگی میں اس کی افادیت لاطینی کے علم کی طرح نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔اس سے کہیں اچھی بات یہ ہے کہ ابتدائی مدرسوں میں صحت کے ابتدائی اصولوں کی تعلیم دی جائے۔

ضرورت سے زیادہ تعلیم دینے کا مسئلہ اہم ہے اور مشکل بھی۔ یہ مسئلہ اہل اس لحاظ سے ہے کہ جب کسی ہوشیار شخص کو ضرورت سے زیادہ تعلیم دے دی جائے تو وہ بے ساختگی، خوداعتمادی اور اچھی صحت سے محروم ہو جاتا ہے۔اس طرح وہ معاشرے کا اس سے کم مفید رکن بن کر رہ جاتا ہے جتنا کہ وہ بصورت دیگر ہوسکتا تھا۔ یہ مسئلہ مشکل اس اعتبار سے ہے کہ موجودہ علم میں اضافے سے زیادہ پیچیدہ عملی مسائل اور سائنسی دریافت دونوں حوالے سے تمام متعلقہ علم پر عبور حاصل کرنا بتدریج دشوار ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ زائداز ضرورت تعلیم کی خرابیوں سے محض یہ کہہ کر محفوظ نہیں رہا جا سکتا کہ ''بچوں کو موج اڑانے دو اور ان پر زیادہ پڑھائی کا بوجھ نہ ڈالو۔'' ہمارے سماجی ڈھانچے کا انحصار تربیت یافتہ اور باعلم ذہانت پر بڑھتا جا رہا ہے۔موجودہ عالمی کساد بازاری کا ایک بڑا سبب عملی افراد میں تعلیم کی کمی ہے مثلاً اگر بنکار اور سیاستدان کرنسی اور کریڈٹ کے مسائل سے آگاہ ہوتے تو چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہم سب موجودہ حالت سے کہیں زیادہ خوشحال ہوتے۔ایک اور مثال لیجیے۔سائنس کی ترقی کی موجودہ رفتار اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتی جب تک کوئی شخص پچیس برس کی عمر تک موجودہ علم کی حد تک پہنچنے کے قابل نہ ہو، کیونکہ تیس برس کی عمر کے بعد کم لوگ ہی گہری ذہنی وفکری صلاحیت کے حامل رہ جاتے ہیں۔ پیچیدہ دنیا میں ایک عام شہری اس وقت تک اپنا کردار ادا نہیں کرسکتا جب تک وہ موجودہ حالت سے زیادہ اس امر کا عادی نہ ہو جائے کہ عملی مسائل کو تعصبات، جذبات یا محض سرسری طور پر حل نہیں کیا جا سکتا۔انہیں حل کرنے کے لیے تربیت یافتہ ذہانت کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ان تمام وجوہ کی بنا پر جدید سماجی نظام میں ذہنی تعلیم بے حد اہم ضرورت ہے۔

کافی حد تک تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ضرورت سے زیادہ تعلیم کی قباحتوں سے بچنا چاہیے۔اس کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے: پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ حصول علم کے ضمن میں جذباتی دباؤ ممکنہ حد تک کم ہونا چاہیے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب امتحانات اور

وظائف کے موجودہ نظاموں میں گہری تبدیلیاں لائی جائیں اور جہاں تک ممکن ہو، ہوشیار بچوں کی علیحدہ تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ جذباتی دباؤ نقصان دہ تھکاوٹ کی بری وجہ ہے۔ جسمانی تھکن کی طرح رات کی نیند عقلی تھکن کو بھی دور کر دیتی ہے۔ اس کے برخلاف جذباتی تھکن مطلوبہ نیند کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے یا پھر برے خوابوں کے ذریعے نیند کا سکون تباہ کر دیتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تعلیم کے زمانے میں نوجوانوں کی زندگی پریشانی سے محفوظ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایسی تمام تعلیم کو سختی کے ساتھ ختم کر دیا جائے جو کوئی مفید مقصد پورا نہیں کرتی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ بچوں اور نوجوانوں کو صرف وہی کچھ حاصل کرنا چاہیے جس کو ''مفید'' علم کا عنوان دیا جاتا ہے۔ ہاں میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ انہیں بعض چیزیں محض اس لیے نہیں پڑھائی جانی چاہئیں کہ وہ ہمیشہ سے پڑائی جاتی رہی ہیں۔ میں نے مدرسے سے فارغ ہونے والے نوجوانوں سے اکثر پوچھا ہے کہ تاریخ میں انہوں نے کیا کچھ پڑھا ہے۔ ان سے ملنے والے جواب سے میں نے دیکھا ہے کہ ایک ہی تاریخ کو ہر جماعت میں بار بار دہرایا جاتا ہے اور اس سے زیادہ نوجوانوں کو کچھ نہیں بتایا جاتا۔ میرا معاملہ خصوصی ہوسکتا ہے۔ تاہم میں نے کبھی اپنے آپ کو ایسی حالت میں نہیں پایا کہ جس میں یہ جاننا حقیقی طور پر مفید ہو کر مثلاً اٹھارہویں صدی میں مرسیا اور ویسکس کی سلطنتوں کے تعلقات کس قسم کے تھے۔ تاریخ میں ایسا بہت سا مواد ہے جس کا جاننا ازحد مفید ہوسکتا ہے۔ تاہم مدرسوں میں اسے کم ہی پڑھایا جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ تمام تر اعلیٰ تعلیم اس خیال سے دینی چاہیے کہ طالب علم میں تحقیق و جستجو کی رُوح بیدار ہو اور وہ تحقیقی طریقہ کار کو جان سکے۔ محض اس خیال سے تعلیم دینا مناسب نہیں کہ طالب علم سوالات کے جوابات سے آگاہ ہو سکے۔ اس معاملے میں بھی الزام امتحانات پر ہی آتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی نوجوان کو انگریزی ادب کا کوئی ابتدائی امتحان پاس کرنا ہے تو اس کے لیے بہتر مشورہ غالباً یہی ہے کہ وہ بڑے ادیبو کا ایک لفظ بھی نہ پڑھے بلکہ کس نصابی کتاب کو زبانی یاد کر لے جس میں ساری معلومات تو درج ہوتی ہیں لیکن کام کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ امتحان کی خاطر نوجوانوں کو ہر قسم کی چیزیں مثلاً تاریخیں وغیرہ، زبانی یاد کرنا پڑتی ہیں۔ حالانکہ زیادہ معقول بات یہ ہوتی ہے کہ ان کو حوالہ جاتی کتب میں سے تلاش کر لیا جائے۔ صحیح قسم کی تدریس کتابوں سے فائدہ اٹھانے کا درست طریقہ سکھاتی ہے۔ وہ حافظے پر ایسا بوجھ نہیں ڈالتی جو کتابوں کو غیر

ضروری بنا دیتا ہے۔ پوسٹ گریجویٹ تعلیم میں اس امر کا اعتراضات پہلے یہ کرلیا گیا ہے۔ تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے زیادہ ابتدائی مراحل پر بھی اس طریقہ کار کو اختیار کیا جائے۔ مزید برآں طالب علم کی تحقیق کے بارے میں رائے اخذ شدہ نتائج کی جدت یا قدامت کے حوالے سے نہیں بلکہ علم کی وسعت اور استدلال کی معقولیت کے حوالے سے قائم کی جانی چاہیے۔ یہ طریقہ کار نہ صرف صحیح فیصلہ کرنے کی قوت کی تعلیم دے گا بلکہ طالب علم کی پیش قدمی کو بھی استقلال عطا کرے گا۔ یوں اس عمل میں مضر تھکن کے بڑے حصے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ذہنی کام کی تھکن زیادہ تر بیزار کن چیزوں کی طرف مجبوراً توجہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا جو طریقہ کار بوریت کو ختم کرتا ہے، وہ تھکن کو بھی ختم کر دیتا ہے۔

ان طریقوں کی مدد سے صحت اور بے ساختگی کو خطرے میں ڈالے بغیر اعلیٰ تعلیم کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔ البتہ جب تک امتحانات اور مسابقت کا جبر موجود ہے، یہ حصول ممکن نہیں ہو سکتا۔ مقابلہ نہ صرف تعلیمی حقیقت کے طور پر ناگوار ہے بلکہ اسے نصب العین کے طور پر نوجوانوں کو پیش کرنا بھی غلط ہے۔ دنیا کو اب جس چیز کی ضرورت ہے، وہ مسابقت و مقابلہ نہیں، بلکہ تنظیم اور تعاون ہے۔ مقابلے کی افادیت میں یقین رکھنے کا مطلب ماضی میں رہنا ہے۔ مزید برآں مقابلہ مفید ہو تو بھی وہ بذات خود قابلِ تعریف نہیں کیونکہ جو جذبے اس سے منسلک ہیں وہ دشمنی اور بے رحمی کے جذبے ہیں۔ جن لوگوں کی پال پوس مقابلے کے تصور کے مطابق ہوتی ہے، وہ معاشرے کو ایک مربوط اورگنزم کی طرح سمجھنے میں شدید دقت کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لیے اخلاقی اور معاشی دونوں لحاظ سے یہ بات ناپسندیدہ ہے کہ بچوں کو مقابلہ آرائی کا درس دیا جائے۔



مقصدِ حیات

تین سادہ مگر پُر جوش جذبے میری زندگی پر حکمرانی کرتے رہے ہیں:

(1) محبت کی تلاش۔

(2) علم کی جستجو۔

(3) انسانی دُکھوں کے لیے بے پایاں درد۔

طوفانی ہواؤں کی طرح یہ تینوں جذبے میری زندگی کی ناؤ کو کبھی یہاں اور کبھی وہاں کھیتے رہے ہیں۔

میں نے محبت کی تلاش اس لیے کی کہ وہ وجد آفرین ہے۔ اس قدر وجد آفرین کہ ایسی مسرت کے چند لمحوں کی خاطر میں پوری زندگی فدا کر دوں۔ میں نے محبت کو اس لیے بھی پانا چاہا کہ وہ تنہائی کے احساس کو مٹاتی ہے یعنی وہ المناک تنہائی جس میں لرزتا، کپکپاتا شعور سرد، بے پایاں اور زندگی سے محروم اتھاہ گہرائیوں میں کائنات کے آخری گوشوں کو معرضِ توجہ بناتا ہے۔ میں نے محبت کی آرزو کی اور اس کو پالیا۔

اتنی ہی شدت سے میں نے علم کی خواہش کی۔ میں نے انسانوں کے دلوں کو سمجھنا چاہا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ ستارے کیوں چمکتے ہیں۔ میں نے اس فیثاغورثی قوت کو بھی حاصل کرنا چاہا جس سے عدد تغیر سے ماورا رہتے ہیں۔ زیادہ نہ سہی، اس کا کچھ حصہ مجھے نصیب ہو گیا۔

محبت اور علم مجھے ممکنہ حد تک آسمانوں میں بلندیوں کی جانب لے جاتے تھے۔ لیکن ہر بار دکھ درد مجھے زمین پر واپس لے آتے۔ درد کی چیخوں کی صدائے بازگشت میرے دل میں مرتعش ہوتی۔ قحط زدہ بچے، حملہ آوروں کے ستم رسیدہ، اولاد کے لیے بیزار بوجھ لاچار بوڑھے، تنہائی، مفلسی اور دُکھ درد کی ماری دنیا میری آدرشی زندگی کا مذاق اڑاتی۔ میں بدی کو کم کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن نہیں کرسکتا۔لہٰذا میں خود بھی گھاٹے میں رہتا ہوں۔

یہی میری زندگی رہی ہے۔ میں نے اس کو زندہ رہنے کے قابل پایا ہے۔اگر مجھے دوبارہ موقع ملے تو بخوشی اس کو بسر کرنا چاہوں گا۔



ہم کیا کر سکتے ہیں؟

ہم اپنی زندگی میں دنیا کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

بہت سے مرد اور عورتیں انسانوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ پریشان خیالی میں مبتلا ہیں اور ان کی توانائیاں اور صلاحتیں بے حد معمولی دکھائی دیتی ہیں۔ اپنی ناتوانیوں کے تصور سے وہ گہری مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جن کا انسانی خدمت کا جذبہ زیادہ شدید ہوتا ہے، ان کو اپنی ناتوانی کے احساس سے رنج بھی زیادہ پہنچتا ہے۔ امید کا دامن چھوٹ جانے سے وہ روحانی تباہی کے خطرے سے دوچار رہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ توجہ اگر فوری مستقل تک محدود رہے تو پھر لگتا ہے کہ ہم کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ کسی خون خرابے کو یا کسی بڑی جنگ کو ختم کروانا غالباً ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ نہ ہی ہم ریاست یا نجی جائیداد کی حدود معقولیت سے متجاوز قوت کو تباہ کر سکتے ہیں۔ فوراً ہی ہم تعلیم کے شعبے میں نئی روح نہیں پھونک سکتے۔ اس قسم کے معاملات میں ہم کو خرابی اور بدی کا احساس تو ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم معمول کے طریقوں کی مدد سے ان کو یک دم ختم نہیں کر سکتے۔ ہم کو مان لینا چاہیے کہ دنیا کا نظام غلط طریقے سے چلا جا رہا ہے اور یہ بھی کہ پلک جھپکتے ہی اس کو راہ راست پر نہیں لایا جا سکتا لہٰذا ہماری امیدوں کا تعلق آنے والے کل سے یا مستقبل قریب سے نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہم کو وہ زمانے پیش نظر رکھنے چاہئیں جب وہ تصورات اکثر لوگوں تک پھیل جائیں گے اور مقبول عام ہو جائیں گے جو آج صرف چند لوگوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ ہم میں حوصلہ اور صبر ہو تو ہم ایسے خیالات پر غور و فکر کر سکتے ہیں اور ایسی امیدیں پال سکتے ہیں جو جلد یا بدیر لوگوں کو متاثر کریں گی اور ان کو عمل پر اکسائیں گی۔ تب درماندگی اور بے حوصلگی پیش قدمی اور توانائی میں بدل جائیں گی۔ اس لیے پہلا کام جو ہم نے کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے ذہنوں میں اس قسم کی زندگی

کے بارے میں بالکل واضح ہو جائیں جس کو ہم اچھا سمجھتے ہیں۔ ہم کو اس تبدیلی کا بخوبی علم ہو جائے جو ہم دنیا میں لانا چاہتے ہیں۔

زندگی کو بنانے سنوارنے والے خیالات کے حامل افراد کی حتمی قوت اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جتنی کہ معاصر سیاست کی بے ہودگیوں اور حماقتوں سے دلبرداشتہ ہونے والوں کو دکھائی دیتی ہے۔ ذرا یاد تو کیجیے کہ مذہبی برداشت ایک زمانے میں صرف چند فلسفیوں کے غور و فکر کا موضوع تھی۔ آج وہ اکثر انسانوں کا روزمرہ کا طرز عمل بن چکی ہیں۔ مذہبی جنون صرف چند تہذیبی طور پر بیمار اور پس ماندہ معاشروں میں باقی رہ گیا ہے۔

جمہوریت کو لیجیے۔ نظریے کے طور پر اس کو کرامویل کی فوج کے گنتی کے چند افراد نے سوچا تھا۔ انگلستان میں بادشاہت کی بحالی کے بعد اس کو امریکہ لے جایا گیا جہاں اس پر جنگ آزادی کے زمانے میں عروج آیا۔ وہاں سے جنگ میں جارج واشنگٹن کا ساتھ دینے والے فرانسیسی جمہوری نظریے کو فرانس لے گئے۔ فرانس میں یہ نظریہ روسو کی تعلیمات کے ساتھ گھل مل گیا اور انقلاب فرانس کے لیے تخلیقی تحریک مہیا کرنے لگا۔ اشتراکیت کے بارے میں ہم چاہے جو بھی سوچیں، وہ ایک عظیم اور فروغ پذیر قوت ہے جو معاشی اور سیاسی زندگی کی کایا پلٹ رہی ہے۔ اچھا یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اشتراکیت کے بانی چند نظریہ ساز افراد ہی تھے۔ عورتوں کی محکومی کے خلاف تحریک آج کل بہت زوروں پر ہے۔ وہ ناقابل مزاحمت بن چکی ہے اور لگتا ہے کہ اس کی مکمل کامیابی کی منزل دور نہیں رہی۔ اشتراکی خیالات اول اول دوسروں سے الگ تھلگ رہنے والے داناؤں نے پیش کیے تھے۔ اسی طرح عورتوں کی آزادی کے تصورات کو پہلے پہل چند غیر عملی قسم کے آدرش پرستوں نے دنیا کو پیش کیا تھا۔ ان میں میری ول سٹون کرافٹ، شیلے اور جان سٹورٹ شامل تھے۔ خیر، ہم ذکر یہ کر رہے تھے کہ خیالات کی طاقت بالآخر کسی اور انسانی طاقت سے عظیم تر ثابت ہوتی ہے۔ جو لوگ سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انسانی ضرورتوں کے مطابق سوچنے کا تخیل رکھتے ہیں وہ عام طور پر جلد یا بدیر اپنا مقصد حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مقصد ان کی اپنی زندگی کے دوران حاصل نہ ہو۔

فکر کے بل بوتے پر دنیا کو فتح کرنے کی آرزو رکھنے والوں کو صبر اور بے نیازی سے کام لینا ہوگا۔ وقتی پسپائیوں کے لیے ان کو تیار رہنا چاہیے۔ اور آزردہ خاطر نہ ہونا چاہیے۔ اکثر لوگ اپنے

دور کے عقائد اور رسوم کو بلا چون و چرا قبول کر لیتے ہیں۔ وہ زیادہ سوالات اٹھائے بغیر زندگی کے دن گزار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے دنیا کی مخالفت نہ کی تو وہ ان کی مددگار بن جائے گی۔ نیا فکر اور نیا خیال اس آرام دہ سپر اندازی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ وہ خاص قسم کی ذہنی ترک دنیا کا، لاتعلقی کا، تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے خاص قسم کی تنہائی والی توانائی چاہیے اور باطنی طور پر دنیا پر حاوی ہونے کی صلاحیت بھی۔ دنیا سے لاتعلق ہونے پر کسی نہ کسی حد تک آمادگی کے بغیر نیا فکر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ لاتعلقی کا مطلب جوگ لینا اور راہب بن جانا نہیں ہے۔ جو لوگ دنیا سے کٹ جاتے ہیں۔ اور دور دراز ویرانوں کو نکل جاتے ہیں ان کی دوسروں کے ساتھ ملاپ کی خواہش ہی مر جاتی ہے۔ اس طرح اگر ذہنی لاتعلقی انسانوں کے لیے اور دنیا کے لیے حقارت پیدا کرنے لگے تو وہ بھی راہ سے ہٹا دیتی ہے۔ اب یہ ماننے والی بات ہے کہ نیا فکر پیدا کرنے کے لیے جس ذہنی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ نازک ہے اور مشکل بھی۔ علاوہ ازیں دنیا میں رہتے ہوئے اس سے ذہنی لاتعلقی پیدا کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ انسانی معاملات کے بارے میں ثمر بخش فکر کبھی کبھار ہی سامنے آتا ہے۔ اکثر نظریہ باز روایتی قسم کے ہوتے ہیں یا پھر ان کی سوچ سطحی قسم کی ہوتی ہے۔ حقیقی اور صحیح قسم کا فکر شاذ و نادر اور مشکل ہوتا ہے۔ مگر وہ بے ثمر اور بے نتیجہ نہیں ہوتا۔ دنیا میں نئی امید پیدا کرنے کی خواہش دل و جان میں مچل رہی ہو تو پھر ناتوانی کا خوف ہم کو فکر سے ہٹا نہیں سکتا۔

کسی موجود وقت پر مفید ثابت ہونے والا سیاسی نظریہ تلاش کرتے ہوئے کوئی نئی یوٹوپیا تخلیق کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے بجائے حرکت کی بہترین سمت کی دریافت ہی کافی ہوتی ہے۔ جو سمت کسی ایک وقت پر اچھی ہو وہ کسی اور وقت کی اچھی سمت سے بظاہر بہت مختلف ہو سکتی ہے۔ مفید فکر وہ ہے جو موجودہ زمانے کے لیے صحیح سمت کی نشاندہی کرتا ہے۔ صحیح سمت کا فیصلہ کرنے کے لیے دو عمومی اصول ہیں جو ہمیشہ قابل اطلاق ہوتے ہیں۔

(1) صحیح سمت وہ ہے جو افراد اور معاشرہ کے مختلف طبقوں کی نشوونما اور قوت حیات کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے۔

(2) کسی فرد یا طبقے کی نشوونما کسی دوسرے فرد یا کمیونٹی کو کم از کم نقصان پہنچانے پر ممکن ہونی چاہیے۔

جب کوئی شخص اس دوسرے اصول کا اطلاق دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے لین دین پر کرتا ہے تو یہ اصول تکریم بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص دوسروں کی زندگی کو وہی اہمیت دیتا ہے جو کہ وہ اپنی زندگی کو دیتا ہے۔ غیر شخصی طور پر اس اصول کو سیاست کے شعبے میں استعمال کرنے سے یہ آزادی کا اصول بن جاتا ہے۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں آزادی کا اصول ایک جزو کے طور پر شامل ہے۔ آزادی اپنے طور پر ایک منفی اصول ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم کو دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے لیکن وہ تعمیر کی بنیاد مہیا نہیں کرتا۔ وہ یہ امر تو واضح کر دیتا ہے کہ بہت سے سیاسی اور سماجی ادارے برے ہیں۔ لیکن اس بارے میں رہنمائی نہیں کرتا کہ ان اداروں کی جگہ ہم کو کیا بنانا چاہیے۔ اس لیے ہمارے سیاسی نظریے کو محض منفی نہیں ہونا تو پھر ہم کو ایک اور اصول کی ضرورت پڑتی ہے۔

عمل میں ہمارے ان دونوں مذکورہ اصولوں کا ملاپ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ دنیا کی بہت سی حیاتی توانائی ایسے امور پر صرف ہو جاتی ہے جو جابرانہ ہیں۔ جرمنوں نے دنیا کو جتلا دیا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر حیاتی قوت سے بھر پور ہیں۔ تاہم بدقسمتی سے ان کی توانائی ان کے ہمسایوں کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ایک اور مثال لیجئے۔ عمومی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یورپ کی توانائی افریقہ سے کہیں زیادہ ہے۔ مگر یورپ نے اپنی توانائی افریقہ کی مدد کرنے اور اور اس کو آگے لانے کے لیے استعمال نہیں کی بلکہ اس کو افریقہ کی لوٹ مار کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح جنوب مشرقی یورپ کی حیاتی توانائی امریکی سرمایہ داروں کو سستی لیبر مہیا کر کے ان کے عزائم کی تکمیل کے لیے بروئے کار لائی جا رہی ہے۔ مردوں کی حیاتی توانائی ماضی میں عورتوں کی ترقی میں رکاوٹ رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مستقل قریب میں عورتیں مردوں کے لیے ایسی رکاوٹ بن جاتیں۔ معاملہ یہ ہے کہ اصول تکریم اگرچہ بذات خود کافی نہیں ہے تاہم وہ اس قسم کے تمام امور میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ان دونوں اصولوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے ہم کو پہلے اپنی انفرادی زندگیوں اور پھر انفرادیت کو قربان کیے بغیر، طبقوں اور دنیا کی زندگی کی یکجہتی کی ضرورت ہے۔ فرد کی زندگی، طبقے کی زندگی اور یہاں تک کہ انسانیت کی زندگی کو الگ الگ خانوں میں بٹا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کو کسی نہ کسی طور تمام اجزا سمیت ایک کل ہونا چاہیے۔ جب یہ صورتحال پیدا ہو تو افراد کی نشوونما کو تحریک ملتی ہے اور یہ نشوونما دوسرے افراد کے

پھلنے پھولنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی اس طریقے سے یہ دونوں اصول ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

انفرادی زندگی میں نظم وضبط پیدا کرنے والی چیز مسلسل تخلیقی مقصد یالاشعوری سمت ہے۔ کسی مہذب مرد یا عورت کی زندگی میں صرف جبلت وحدت پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ اس کام کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ زندگی میں کوئی زبردست قسم کا مقصد ہو یا پھر کسی آرزو، سائنسی یا فنی تخلیق کی کسی خواہش، کسی مذہبی اصول یا شدید اور دیرپا محبتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک خاص قسم کی ناکامی سے دوچار ہونے والے مردوں اور عورتوں کو زندگی کی وحدت کو برقرار رکھنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔ اس سے مراد ایسی ناکامی ہے جو فرد کو اپنی کسی غالب آرزو کی تکمیل سے روک دیتی ہے۔ کئی پیشے ابتدا ہی میں اسے قسم کی ناکامی فرد پر ٹھونس دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس نوجوان کا معاملہ دیکھئے جو صحافی بننے کا آرزومند ہے۔ زیادہ تر امکان یہ ہے کہ اس کو ایک ایسے اخبار کے لیے کام کرنا پڑتا ہے جس کی پالیسی اس کو پسند نہیں ہے۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے محنت میں فخر اور آزادی کے احساس کو گھاؤ لگتا ہے۔

طب کے پیشے سے تعلق رکھنے والے اکثر افراد کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ابتدا میں مکاری اور جھانسی سے کام لیے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یوں ان میں جیسا بھی سائنسی ضمیر ہوتا ہے۔ اس کو دھچکا پہنچتا ہے اور وہ ختم ہو جاتا ہے۔ سیاست دانوں کے حالات بھی موزوں نہیں ہیں۔ ان غریبوں کو نہ صرف اپنی اپنی جماعتوں کا پروگرام قبول کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ مذہبی حامیوں کو راضی رکھنے کی خاطر شرافت کا لبادہ بھی اوڑھنا پڑتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ منافقت سے کام لیے بغیر کوئی شخص پارلیمنٹ کا رکن نہیں بن سکتا۔ کوئی ایسا پیشہ نہیں جس میں انسان کی فطری خودداری کے لیے احترام پایا جاتا ہو۔ جب خودی اور خودداری کو ٹھیس پہنچتی ہے تو انسان ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ اس کی وحدت، اس کی کلیت ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا اس کلیت کو تباہ کرنا چاہتی ہے کیونکہ کلیت کا مطلب آزادی ہے۔ انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خود کو آزاد کرنے کے بجائے دوسروں کو غلام بنانے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ باطنی آزادی بیش بہا اور انمول ہے۔ جو معاشرہ اس کا احترام کرتا ہے اور اس کو قائم رکھنا چاہتا ہے، وہی ہمارے خوابوں کا معاشرہ ہے، اس کی آرزو کرنی چاہیے۔

فرد کی نشوونما کے اصول کا اس وقت تباہ ہونا لازم ہے کہ جب اس کو کوئی خاص کام کرنے سے روکا جاتا ہے۔ لیکن جب اس کو کوئی دوسرا کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو پھر لازمی طور پر اس

کی نشوونمارک جاتی ہے۔نشوونما کوتباہ کرنے والی چیزیں وہ ہیں جوان سمتوں میں ضعف ونا توانی کااحساس پیدا کرتی ہیں جن میں حیاتی خواہش کوئی نئی شے تخلیق کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔مگراس کا ارادہ روایتی قسم کا کوئی پیشہ قبول کرنے پر اُکساتا ہے جس سے کافی آمدنی ہو جاتی ہے اور معاصرین کی طرف سے عزت واحترام بھی مل جاتا ہے۔ایسی تکنیکی گھسی پٹی مثال اس فن کار کی ہے جوعوام کوخوش کرنے کے لیے گھٹیا قسم کے فن پارے بنانے لگتا ہے۔

غیر فنکار لوگوں کی اکثریت میں فنکار کی قوت محرکہ کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی رہتا ہے۔ چونکہ قوت بہت گہری اور خاموش ہوا کرتی ہے اور چونکہ فہم عامہ عموماً اس کے خلاف ہوتی ہے اور چونکہ کوئی نوجوان تب تک اس کی پیروی نہیں کرسکتا جب تک وہ اپنے مبہم احساسات کو بزرگوں اور دوستوں کی دانائی اور عاقبت اندیشی سے بھرپور مقولوں کے مقابلے میں کھڑا کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو۔لہٰذا سو میں سے ننانوے مثالوں میں ہوتا یہ ہے کہ ابتدا ہی میں تخلیقی قوت محرکہ کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس تخلیقی قوت محرکہ میں سے ایک آزاد اور زور آور زندگی کے پیدا ہونے کا امکان موجود ہوتا ہے۔تب وہ نوجوان ایک خودمختار مستری کے بجائے ایک اوزار بننے پر اکتفا کر لیتا ہے۔وہ ایسا دستکار نہیں بنتا جیسا کہ اس کی فطرت بنانا چاہتی ہے۔اس کے بجائے وہ دوسروں کی ضرورتیں اور خواہشیں پوری کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ جب وہ اپنی فطرت کی راہ چھوڑ کر دوسروں کی بنائی ہوئی راہ پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔تو اسی لمحہ اس کے باطن میں کوئی شے مر جاتی ہے۔ پھر وہ دوبارہ کبھی سالم فرد نہیں بن سکتا۔ وہ پہلے جیسی عزت نفس سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے۔اس کی خودی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ جو اس کی روح کو تمام بیرونی مصیبتوں، رنجشوں اور مشکلوں کے باوجود خوش وخرم رکھ سکتی تھی۔ اس کے بعد صرف قلب ماہیت اور طرز زندگی میں بنیادی انقلاب کے برپا ہونے سے ہی ان محرومیوں کا مداوا ہوسکتا ہے۔

وہ خارجی پابندیاں زیادہ نقصان دہ نہیں ہیں جن کو ارادہ قبول نہیں کرتا۔اصل میں ارادے کو بہکانے والی نازک ترغیبات زیادہ ضرررساں ہوتی ہیں۔محبت میں ناکامی بہت سے دکھ درد کا سبب بنا کرتی ہے۔لیکن یہ ناکامی اس قدر باطنی نقصان نہیں پہنچاتی جس قدر دولت کی خاطر کی جانے والی شادی پہنچاتی ہے۔کسی خصوصی خواہش کی کامرانی اہم بات نہیں ہے۔اہم بات سمت ہے۔ جب ارادہ بنیادی قوت محرکہ کی مخالفت کرتا ہے تو اس کو بے بسی کا احساس ہوتا ہے اس کو امید نہیں رہتی کہ

محرک کے طور پر اس کی قوت پہلے جیسی رہے گی۔ خارجی جبر سے اس قسم کا نقصان صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ ناتوانی اور بے بسی کا اسی قسم کا احساس پیدا کرتا ہے۔

بعض لوگوں کی خواہشوں کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو وہ دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچاتی ہیں اور ان کے لیے غیر معمولی حد تک دوبھر ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ہمارے خوابوں کے مثالی سماج میں بھی بعض خواہشوں کو لگام دینی ہوگی۔ اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ کسی اچھے معاشرے میں نپولین کو اپنی پسند کا پیشہ چننے کی اجازت نہ ملتی۔ تاہم وہ مغربی امریکہ میں پہل کار کی حیثیت سے خوشی ضرور حاصل کر لیتا۔ سٹی کلرک کے طور پر وہ خوشی سے محروم رہتا اور معاشرے کی کوئی قابل برداشت تنظیم اس کو سٹی کلرک بننے پر مجبور نہ کرتی۔

کسی انفرادی زندگی کی یکجہتی اس امر کی متقاضی ہے ک اس میں فرد کی تمام تر تخلیقی قوت محرکہ ہو اور یہ کہ اس کی تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ جو اس قوت محرکہ کو اظہار کا موقع دے اور اس کو مضبوط بنائے۔ اس طرح کسی معاشرے کی یکجہتی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ مختلف مردوں اور عورتوں کی تخلیقی قوت محرکہ مل کر کسی خاص قسم کی زندگی اور کسی مشترکہ مقصد کے لیے سرگرم ہو۔ اس عمل کا شعوری ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ مشترکہ زندگی اور مقصد ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے اس معاشرے کے تمام افراد کو انفرادی تسکین حاصل کرنے مدد مل سکے۔

حیاتی محرک قوتوں سے پیدا ہونے والی سرگرمیاں دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پہلا حصہ تخلیقی ہے جو اس قسم کی قوت محرکہ یا حالات کے ذریعے فرد کی اپنی اور دوسروں کی زندگی کو فروغ دیتا ہے۔ دوسرا حصہ غلبے کی خواہش رکھنے والا ہے۔ جو مختلف قسم کی قوت محرکہ یا حالات کے ساتھ کسی گروپ کی زندگی کے فروغ کو روکتا ہے۔ اس وجہ سے اپنے طور پر بے حد حیاتی ہونے والی قوت بھی زندگی میں حائل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال کے طور پر ہم سترہویں صدی کے پیورٹن ازم کو پیش کر سکتے ہیں۔ آج کے زمانے کی قوم پرستی بھی اس کی ایک مثال ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ قوت حیات آسانی سے تصادم اور جبر کی طرف لے جاتی ہے اور یوں خود حیاتی قوت کو ضعف پہنچانے کا سبب بنتی ہے۔ جنگ کو لیجئے۔ جب جنگ شروع ہوتی ہے تو وہ قوم کی زندگی کو منضبط کر دیتی ہے اور اس میں یکجہتی پیدا کر دیتی ہے۔ مگر وہی جنگ عالمی زندگی کی یکجہتی کو پارہ پارہ کرتی ہے اور غیر منضبط کر دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب جنگ شدت اختیار کرتی ہے تو بالآخر برسر جنگ قوم کی زندگی

بھی منتشر ہو جاتی ہے۔

جنگوں کے تجربے نے اس امر کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے کہ جب مہذب ملکوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد شکوک و شبہات اور جارحانہ عزائم پر ہو تو پھر کسی ایک معاشرے کی زندگی میں ترتیب اور یکجہتی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی حقیقی طور پر طاقتور اصلاحی تحریک کا بین الاقوامی ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی تحریک محض قومی نوعیت کی ہو تو پھر وہ خارجی خطرے کے خوف سے ناکام ہو جائے گی۔ بہتر دنیا بلکہ اپنے ہی ملک میں انقلابی قسم کی اصلاحات کی آرزو رکھنے والوں کو دوسرے ملکوں سے تعلق رکھنے والے اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔ اور جنگ کے باعث پیدا ہونے والی اندھی دشمنی کو ختم کرنے کی خاطر اپنی توانائی کا بہت سا حصہ صرف کرنا پڑے گا۔ محض وطن پرستی سے جزوی یکجہتی ہی پیدا ہو سکتی ہے اور اس قسم کی جزوی یک جہتیوں سے کوئی مطلق امید جنم نہیں لے سکتی۔ انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی مسائل میں کرنے والا کام یہ ہے کہ حیاتی قوت ہائے محرکہ کا تخلیقی حصہ برقرار رکھا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے تخریبی حصے کا رخ دوسری سمتوں میں موڑا جائے۔

انسانوں کی خواہشوں اور آرزوؤں کو تخلیقی اور ملکیتی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہماری بعض سرگرمیوں کا مقصد ایسی اشیاء کی تخلیق ہوتا ہے کہ جو بصورت دیگر وجود سے محروم رہتیں۔ دوسری طرف ہماری بعض سرگرمیوں کا مقصد ان چیزوں کو حاصل کرنا یا ان پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا ہوتا ہے جو پہلے سے موجود ہوتی ہیں یعنی ہم ان کو تخلیق نہیں کرتے۔ ان کو حاصل کرتے ہیں اور اگر وہ پہلے سے ہمیں حاصل ہوں تو ہم ان پر اپنی گرفت کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فنکار کی قوت محرکہ تخلیقی قوت محرکہ کی عمدہ مثال ہے۔ جبکہ جائیداد قبضہ گیر قوت محرکہ کی مثال ہے۔ بہترین زندگی وہ ہے کہ جس میں تخلیقی جذبے سب سے زیادہ اور ملکیتی جذبوں کو ذاتی بقا کے لیے موزوں بنا دیتے ہیں۔

ملکیتی خواہشیں دفاعی ہو سکتی ہیں اور جارحانہ بھی۔ قانون فوجداری میں وہ دفاعی نوعیت کے حامل ہیں اور مجرموں میں جارحانہ نوعیت کی۔ شاید یہ بات بھی تسلیم کی جا سکتی ہے کہ جرم و سزا کے متعلق قانون مجرموں کے مقابلے میں کم قابل نفرت ہے اور یہ کہ جب تک جارحانہ ملکیتی جذبے موجود ہیں تب تک دفاعی ملکیتی جذبے ناگزیر رہیں گے۔ تاہم یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی

چاہیے کہ ملکیتی جذبوں کی سب سے خالص دفاعی صورتیں بھی بذات خود قابل تعریف نہیں ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جونہی یہ جذبے طاقتور ہوتے ہیں وہ تخلیقی جذبوں کے دشمن بن جاتے ہیں۔

کسی اور شے زیادہ ملکیتی خواہشوں نے انسانوں کو آزادی اور عالی ظرفی کی زندگی سے محروم کررکھا ہے۔ ریاست اور جائیدادان خواہشوں کی دوسب سے بڑی تجسیمات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست اور جائیداد دونوں زندگی کی دشمن ہیں اور جنگ وفساد کا باعث ہیں۔ ملکیت کا مطلب کسی اچھی شے کو اپنے قبضے میں رکھنا اور دوسروں کو اس سے لطف اندوز ہونے یا اس سے فائدہ اٹھانے سے روکنا ہے۔ تخلیق کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے چنانچہ تخلیق کا مطلب کسی ایسی اچھی شے کو وجود میں لانا ہے جو پہلے سے موجود نہ ہو اور کسی نے اس کو نہ بنایا ہو۔ پھر دوسروں کو اس سے لطف اٹھانے کا موقع مہیا کرنا ہے۔ چونکہ دنیا کی مادی چیزوں کو آبادی کے درمیان تقسیم کرنا ضروری ہے اور یہ بھی ہے کہ بعض لوگ فطری طور پر لٹیرے اور بٹ مار ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا دفاعی نوعیت کی ملکیت کی اجازت ضروری ہونی چاہیے۔ اچھے معاشرے میں اس قسم کی مادی اشیاء کی تقسیم کے پیچھے انصاف کا کوئی نہ کوئی اصول کارفرما ہونا چاہیے۔ مگر یہ سب کچھ اچھی زندگی یا ان اچھے سیاسی اداروں کا محض نکتہ آغاز ہی ہے جن کے تخلیقی جذبے ملکیتی جذبوں سے زیادہ بھاری ہوں گے۔

نجی زندگی اور سیاست دونوں میں بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ ہر اس شے کو فروغ دیا جائے جو تخلیقی ہے اور ان تمام جذبوں اور خواہشوں کو لگام دی جائے جن کا تعلق ملکیت سے ہے۔ ہمارے زمانے میں ریاست بہت بڑی حد تک قبضہ گیر جذبوں کی تجسیم ہے۔ اندرونی طور پر وہ امیروں کو غریبوں سے تحفظ مہیا کرتی ہے۔ بیرونی طور پر وہ کمزور نسلوں کا استحصال کرنے کی خاطر قوت کو استعمال کرتی ہے۔ اسی طرح وہ دوسری ریاستوں کے ساتھ مسابقت کے لیے بھی قوت کو بروئے کار لاتی ہے۔ ہمارے تمام تر معاشی نظام کا تعلق بھی مکمل طور پر قبضہ گیری سے ہے۔ البتہ اشیاء کی پیداوار ایک قسم کا تخلیقی عمل ہے۔ وہ اُکتا دینے کی حد تک بے تنوع اور میکانگی نہ ہوتو وہ تخلیقی جذبوں کی تسکین کا باعث بن سکتا ہے۔ اشیائے صرف کی کسی خاص قسم کے پیداکاروں کو خودمختار جمہوریہ کی صورت دے کر اس سلسلے میں خاصی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک قیمتوں کا تعلق ہے ان لوگوں کے پاس ریاست کا کنٹرول ہونا چاہیے۔ تاہم ریاست کو ان کے طرز

پیداوار کے امور میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیے۔

تعلیم، شادی اور مذہب بنیادی طور پر تخلیقی امور ہیں لیکن ملکیتی جذبوں کی دخل اندازیوں نے ان کا ستیاناس کر دیا ہے۔ تعلیم کو ذہنی آزادی اور شریفانہ رویے پیدا کرنے کا وسیلہ بنانے کے بجائے بچوں کے ذہنوں میں تعصبات ٹھونس کر حالات کو جو بہتر بنانے کے بجائے غیر تخلیقی اور غیر منصفانہ سماج کو برقرار رکھنے کا وسیلہ بنا دیا گیا ہے۔ ازدواجی زندگی میں محبت کو زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ محبت تخلیقی جذبہ ہے مگر ازدواجی زندگی میں اس تخلیقی جذبے کو حسد کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے جو ملکیتی جذبہ ہے۔ مذہب کا کام روح کی تخلیقی وژن کو آزاد کرنا ہونا چاہیے، لیکن اس سے جبلتوں اور ذہانت کو دبانے کا کام لیا جاتا ہے۔ ان تمام طریقوں کے ذریعے غیر محفوظ ملکیت سے پیدا ہونے والے خوف نے تخلیقی قوت سے جنم لینے والی امید کی جگہ لے لی ہے۔ یہ بجا ہے کہ دوسروں کو لوٹنے کی خواہش کو نظری طور پر بُرا کہا جاتا ہے۔ لیکن لوٹے جانے کا خوف بھی اس سے کچھ ہی بہتر ہے۔ مگر یہی وہ دونوں محرکات ہیں جو سیاست اور نجی زندگی کی نوے فیصد سرگرمیوں چھائے ہوئے ہیں۔

مختلف افراد کے تخلیقی جذبے بنیادی طور پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ان میں کوئی بنیادی تضاد نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک شخص جو کچھ تخلیق کرتا ہے وہ ان چیزوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا جو کوئی دوسرا شخص تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ تضاد تو ملکیتی جذبوں میں ہوتا ہے۔ یاد رکھنے والی ایک اور بات یہ ہے کہ اگرچہ اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے تخلیقی اور ملکیتی جذبے ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ لیکن مواقع اور حالات کے تقاضوں کے مطابق نفسیاتی طور پر وہ آسانی سے ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ جذبوں کی تخلیق اور ان کو تبدیل کرنے والے اسباب کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ تعلیم اور سماجی اداروں کی تعمیر نو اس انداز سے ہونی چاہیے کہ وہ مختلف افراد کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے والے جذبوں کو مضبوط بنائیں اور ان کو ایک دوسرے سے دور کرنے والے جذبوں کو کمزور کریں۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طریقے سے جو کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ان کی کوئی حد نہیں۔

قوت ارادی کے بجائے جذبے کے ذریعے سے انفرادی زندگیاں اور ان کے ساتھ ساتھ سماج کی زندگی طاقت اور کسی واحد سمت کی وحدت حاصل کر سکتی ہے۔ ارادہ کی دو قسمیں ہیں۔

ایک رخ خارج کی طرف ہوتا ہے اور دوسرے کا باطن کی طرف۔ خارجی سمت رکھنے والا ارادہ خارجی رکاوٹوں کے سبب حرکت میں آتا ہے۔ یہ رکاوٹیں دوسرے لوگوں کی مخالف یا کسی کام کی تکمیل میں حائل فنی مشکلات کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ اس قسم کا ارادہ مضبوط جذبے یا خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ان تمام لوگوں میں موجود ہوتا ہے جن کی زندگی جانفشانی سے بھرپور ہوتی ہے۔ اس جذبے کو زوال اس وقت آتا ہے کہ جب ان لوگوں کی حیاتی قوت کمزور ہو جاتی ہے۔ کسی مشکل معاملے میں کامیابی کے لیے اس کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کے بغیر کوئی بڑی کامیابی شاذ و نادر ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

باطنی رُخ کے حامل ارادے کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب باطنی جذبوں یا خواہشوں میں کوئی تضاد جنم لیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مکمل طور پر باطنی طور پر ہم آہنگ فطرت کا حامل ہے تو پھر اس کو باطنی ارادے کی ضرورت نہ ہو گی۔ خیر، اس قسم کی ہم آہنگ فطرت کا حاصل کرنا سہل نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ تمام انسانوں میں ایسے جذبے سر اٹھاتے رہتے ہیں جو ان کے بنیادی یا مرکزی جذبے سے متصادم ہوتے ہیں۔ کل کی حیثیت سے ان کی زندگی کو ناکامی سے بچانے کی خاطر اس قسم کے جذبوں پر کڑی نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ بہر حال افراد کے مرکزی جذبے مضبوط ہوں تو پھر اس قسم کے مواقع کم ہی آتے ہیں۔ علاوہ ازیں آزادی کی قدر کرنے اور اس کو با مقصد بنانے والے معاشرے میں اس ارادے کی ضرورت اکثر اوقات پڑتی ہے کیونکہ ہمارا معاشرہ بوسیدہ اداروں اور جابرانہ رائے عامہ کے تخلیق کردہ مصنوعی تضادات سے بھرپور ہے۔ ان تمام لوگوں کو باطنی ارادے کی قوت استعمال کرنی چاہیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں نظم و ضبط ہونا چاہیے اور ان کا کوئی نہ کوئی مرکزی مقصد ہونا چاہیے۔ البتہ جب معاشرے میں بہتر ادارے وجود میں آ جائیں تو اس ارادے کو استعمال کرنے کے نہ صرف مواقع کم ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی اہمیت بھی کم ہو جاتی ہے۔ یہ صورتحال پسندیدہ ہے اور اس کی خواہش کی جانی چاہیے بات یہ ہے کہ جب ارادہ ان جذبوں کی پڑتال کرتا ہے جو محض اتفاقی طور پر نقصان دہ ہوتے ہیں تو پھر وہ ایک ایسی قوت کا رُخ بدل دیتا ہے جو خارجی رکاوٹوں پر قابو پانے کے لیے استعمال ہو سکتی ہے۔ پڑتال شدہ جذبے مضبوط اور سنجیدہ ہوں تو پھر وہ دستیاب حیاتی قوت کو واقعی ختم کر دیتا ہے۔ ممانعتوں اور رُکاوٹوں سے بھرپور زندگی عموماً زوردار نہیں ہوتی۔

وہ پھس پھسی اور پھسڈی رہتی ہے، اس میں کوئی جوش اور جذبہ نہیں ہوتا۔

جذبے کو مسلسل گرفت میں رکھا جائے تو وہ مرنے لگتا ہے۔ اگر نہ مرے تو پھر وہ خفیہ انداز میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ یوں ممکن ہے کہ اس کا اظہار پہلے سے بھی بدتر صورت میں ہونے لگے۔ ان وجوہ کی بنا کی بنا پر باطنی ارادے کے استعمال سے حتی الوسع گریز کرنا چاہیے۔

زندگی کو وحدت عطا کرنے کی جدوجہد کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کھیل وتفریح کی لمحاتی خواہشوں کو دبا دیں۔ اس کے برعکس زندگی کے بڑے مقاصد کو لطف ومسرت کی ان تمام قسموں کے ساتھ ملانے کی کوشش کرنی چاہیے جو اپنی فطرت کے اعتبار سے نقصان دہ نہیں ہیں۔ شراب نوشی کی لت، منشیات، ظالمانہ کھیلیں اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے والے اشغال نقصان دہ ہیں۔ تاہم مہذب افراد جن تفریحات سے لطف اٹھاتے ہیں وہ یا تو بےضرر ہوتی ہیں یا محض حادثاتی طور پر نقصان دہ ہوا کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ بہتر معاشرے میں ان کا نقصان دہ پہلو بھی ختم ہو جائے اصل میں ہم کو رہبانیت درکار ہے اور نہ ہی بے رنگ قسم کی سادگی کی ضرورت ہے۔ اس کے بجائے ہم کو تخلیقی مقاصد کی طرف رخ رکھنے والے مضبوط جذبے اور خواہشیں درکار ہیں۔ جب اس قسم کے جذبے اور خواہشیں توانا ہوں تو وہ اپنے ساتھ وہ سب کچھ لے آتے ہیں جس کی اچھی زندگی کے لیے ضرورت ہوا کرتی ہے۔

یہاں ایک اہم نکتے کا ذکر ہو جانا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ بلاشبہ ہم کو تفریح اور مہم جوئی سے محروم نہیں رہنا چاہیں۔ مگر ان باتوں کو حد سے نہیں بڑھنے دینا چاہیے۔ انسان اگر ان ہی کے پیچھے بھاگنے لگے تو پھر وہ اچھی زندگی تخلیق نہیں کر سکتا۔ موضوعات پسندی سے مراد اپنے خیالات اور خواہشات کا رخ کسی خارجی اور معروضی شے کے بجائے اپنے ہی ذہن کی کیفیات کی طرف رکھنے کی عادت ہے۔ یہ عادت بالآخر زندگی کی وحدت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کو پارہ پارہ کر دیتی ہے اور غیر ترقی پسند بنا دیتی ہے۔ جو شخص تفریح کو زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے۔ وہ تفریح مہیا کرنے والی چیزوں سے بتدریج بیزار ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کی قدر ان کی خاطر نہیں کرتا بلکہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ اس کو لطف ومسرت کا احساس مہیا کرتی ہیں۔ چنانچہ جب ان کی کشش ختم ہو جاتی ہے اور مسرت انگیز نہیں رہتیں تو پھر بیزاری اس شخص کو نئی تفریح انگیز چیزیں ڈھونڈنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ان چیزوں کے ساتھ بھی وہی معاملہ پیش آتا ہے، ان کی کشش رفتہ رفتہ ختم ہونے لگتی ہے۔

تفریح لمحوں کے ایک ایسے سلسلے پر مشتمل ہوتی ہے جن کی درمیان تسلسل کی موجودگی لازمی نہیں۔ دوسری طرف معاملہ یہ ہے کہ زندگی کو وحدت عطا کرنے والے مقصد کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ طویل مدت کی سرگرمی کا تقاضا کرتی ہے۔ گویا یہ ریت پر کسی بچے کا قلعہ تعمیر کرنے والی بات نہیں۔ بلکہ کوئی مضبوط یادگار بنانے والا معاملہ ہے۔

موضوعات پسندی کی کئی صورتیں ہیں۔ تفریح کی جستجو ان میں سے محض ایک ہے۔ بہت سے لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ جب وہ کسی سے محبت کرتے ہیں تو ان کی زیادہ دلچسپی محبوب کے بجائے ان کے اپنے جذبہ محبت میں ہوتی ہے۔ اس قسم کی محبت کسی لازمی ملاپ کا سبب نہیں بنتی بلکہ وہ محبوب اور اس سے محبت کرنے والے کی باہمی جدائی کو برقرار رکھتی ہے۔ جونہی جذبہ ڈھیلا پڑتا ہے تو اس کو برقرار رکھنے یا اس کو طول دینے کا کوئی محرک دکھائی نہیں دیتا۔ وہ خود بخود ختم ہونے لگتا ہے۔

موضوعیت پسندی اسی خرابی کو پروٹسٹنٹ مذہب اور اخلاقیات نے ایک اور طریقے سے فروغ دیا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ مذہب نے انسان کی توجہ خارجی دنیا اور اس کے ساتھ ہمارے معاملات سے ہٹا کر گناہ اور روح کی کیفیات کی طرف کر دی تھی۔ موضوعیت پسندی کی ان صورتوں میں سے کوئی بھی فردی زندگی کو انتشار اور تنہائی کی زد میں آنے سے نہیں روک سکتی۔ صرف معروضی اور خارجی مقاصد کی طرف رخ رکھنے والے غالب جذبوں سے جنم لینے والی زندگی تسلی بخش طور پر وحدت کی حامل ہو سکتی ہے اور دوسروں کی زندگیوں کے ساتھ قریبی طور پر متحد ہو سکتی ہے۔

مسرت کی جستجو اور نیکی کی جستجو دونوں یکساں طور پر موضوعیت پسندی کی ماری ہیں۔ نفس پرستی اور ضبط نفس دونوں میں ایک ساز ہر بجرا ہے۔ موضوعیت پسندی اس زندگی کا فطری نتیجہ ہے جس میں عمل کم اور غور و فکر زیادہ ہو۔ جب خارجی اشیاء کا حقیقی وجود ناپید ہو گیا ہے۔ اور وہ محض خواب و خیال کے روپ میں رہ گئی ہیں۔ ان کے وجود میں ہماری دلچسپی کم ہو جاتی ہے ہماری دلچسپی صرف ان احساسات تک محدود ہو جاتی ہے جو وہ اشیاء ہمارے ذہنوں میں پیدا کرتی ہیں۔

لگتا ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ موضوعیت پسندی کو فروغ ملتا جا رہا ہے۔ اس کا سبب موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے فروغ کے ساتھ ساتھ عمل کی ضرورت کم ہوتی جا رہی ہے اور سوچ بچار کے مواقع بڑھتے جا رہے ہیں۔ خیر، فکر اگر فعال ہوتا اور اس کا رُخ

کسی مقصد کو حاصل کرنے کی طرف ہوتا تو اور بات تھی تب اس میں یہ خرابی مضمر نہ ہوتی۔صرف مجہول فکر ہی موضوعیت پسندی کی طرف لے جاتا ہے۔ بہرحال اس ساری بحث کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں چاہیے کہ فکر کو جذبوں اور خواہشوں کے ساتھ قریبی طور پر منضبط رکھیں۔اس کو ایسی فعالیت بنائیں جو کوئی خارجی مقصد حاصل کرنے کے درپے ہو۔ یہ نکتہ پیش نظر نہ رکھا جائے تو فکر اور جذبہ ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔اس دشمن سے دونوں کو گہرا نقصان پہنچتا ہے۔

عام مردوں اور عورتوں کی زندگیوں کے انتشار کو کم کرنے ان میں وحدت پیدا کرنے اور ان کو تخلیقی جذبوں کی تکمیل کے زیادہ مواقع مہیا کرنے کی خاطر محض اس ہدف کو جاننا کافی نہیں جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنے مطلوبہ مقاصد کے گن گانے سے کام بنتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جذبے کی زندگی پر اداروں اور اعتقادات کے اثر کو اچھی طرح سمجھا جائے اور پھر اداروں میں تبدیلی کے ذریعے اس اثر کو بڑھانے کے طریقے ڈھونڈے جائیں۔اس ذہنی محنت کے بعد بھی ہمارا فکر اس وقت تک بنجر رہے گا جب تک ہم اس کو کسی طاقتور سیاسی قوت سے منضبط نہیں کرتے۔

مہذب دنیا کو زوال سے بچانے کے لیے بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔اس کا مطلب یہ ہے مہذب دنیا کے معاشی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ اس کے فلسفہ حیات میں بھی تبدیلی لائی جائے۔ہم میں سے جو لوگ تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں،ان کو مایوسی کے عالم میں ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔بات یہ ہے کہ اگر ہم چاہیں تو مستقبل کو گہرے طور پر متاثر کر سکتے ہیں۔ہم مطلوبہ تبدیلی کو دریافت کر سکتے ہیں۔اور اس کا چرچا کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ ایسی تبدیلی درکار ہے جو ہمارے زمانے کے حیاتی اعتقادات میں سے مثبت اعتقادات کو برقرار رکھتے ہوئے غیر ضروری اور منفی اعتقادات کو رد کر دے۔وہ ایک ایسی ترکیب تشکیل دے جس سے وہ سب کچھ ہم آہنگ ہو سکے جو محض رجعت پسندانہ نہیں ہے۔جب ایک بار یہ بات واضح ہو جائے کہ ہم کو کس قسم کی تبدیلی درکار ہے تو پھر اس کے اجزا کو زیادہ تفصیل کے ساتھ واضح کرنا ممکن ہو جائے گا۔کسی سیاسی نظریے نے دباؤ اور بحران کے زمانوں میں قائم رہنا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ واضح فکر کے پس پردہ کارفرما جذبوں کو پوری طرح پیش نظر رکھے۔وہ ان جذبوں کو اپیل کرے اور ان کو تخریبی بنانے کے بجائے زیادہ مفید بنانے کے طریقے دریافت کرے۔

زندگی کو بنانے یا مٹانے میں معاشی نظام بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ صنعتی نظام غلامی کے نظام سے قطع نظر انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ زندگی دشمن نظام

ہے۔ پھر بھی مشینوں اور بڑے پیمانے پر پیداوار سے نجات ممکن نہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو موجودہ تباہ کن نظام کی جگہ لینے والے کسی بہتر نظام کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔ غالباً صنعتی وفاقی جمہوریت اصلاحی کی بہترین سمت ہے۔

جب فلسفہ ہائے زندگی پر یقین رکھا جائے اور عام لوگ ان پر ایمان رکھتے ہوں تو وہ بھی سماج کی زندگی کی قوت کو گہرے طور پر متاثر کرتے ہیں۔ آج کے عہد کا مقبول عام فلسفہ حیات فرد کی آمدنی سے اس کی مسرتوں کا رشتہ جوڑتا ہے۔ گویا دولت کا حصول سب کچھ ہے۔ جس کے پاس زیادہ دولت ہوگی وہ زیادہ خوش بھی ہوگا۔ اس فلسفے میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ عمل کے بجائے نتیجے کو مقصد قرار دیتا ہے۔ ہر فرد کی انفرادیت کا تعین کرنے والے تخلیقی جذبے کے بجائے یہ فلسفہ مادی اشیاء سے لطف اندوزی پر اصرار کرتا ہے۔ اعلیٰ ترقسم کے فلسفے مستقبل کے بجائے ماضی پر اور موثر عمل کے بجائے صحیح کردار پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ان فلسفوں میں ہم وہ توانائی تلاش نہیں کر سکتے جو روایت اور ہر دم بڑھتے ہوئے علم کا بوجھ اٹھانے میں مدد دے سکے۔

دنیا کو ایک ایسے فلسفے، یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو زندگی کو ترقی دیتا ہو۔ تاہم زندگی کو ترقی دینے کے لیے محض زندگی کے سوا کسی اور شے کو قدر دینا ضروری ہے۔ زندگی اگر محض زندگی کے لیے وقف کردی جائے تو وہ حیوانی سطح پر اتر آتی ہے۔ کسی حقیقی انسانی قدر کے بغیر زندگی افسردگی اور بے معنویت کی شکار ہو جاتی ہے۔ زندگی کو بھرپور انسانی رنگ دینے کے لیے ضروری ہے کہ خود زندگی سے ماورا کوئی مقصد ہو جس کے حصول کے لیے اس کو وقف کر دیا جائے۔ یہ مقصد غیر شخصی ہونا چاہیے اور انسانیت سے ماورا بھی۔ خدا، حُسن اور سچائی اسی قسم کے نصب العین ہیں۔ زندگی کو بہترین ترقی دینے والے لوگ وہ ہیں کہ جو خود زندگی کو مقصد نہیں بناتے ہیں وہ تو یوں کہئے کہ کسی ابدی شے کو بتدریج وجود میں لاتے ہیں۔ یعنی کوئی ایسی شے جو وقت کی حدود و قیود سے ماورا اور کسی جنت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہے اس ابدی دنیا کے ساتھ تعلق۔ چاہے اس کا وجود محض ہمارے تخیل کا مرہون منت ہو۔ ہم کو ایسی قوت اور گہرا سکھ عطا کرتا ہے جس کو ہماری اس فانی زندگی کی جدوجہد اور ظاہری ناکامیاں تباہ نہیں کرسکتیں۔ ابدی اشیاء کے ایسے دلشاد گیان دھیان کو سپائی نوزا نے خدا کی عقلی محبت سے تعبیر کیا تھا۔ جن لوگوں کو بھی اس کا تجربہ ہوا ہے ان کے لیے یہ دانش کی کنجی ہے۔

عملی طور پر جو کچھ ہم نے کرنا ہے وہ ہم میں سے ہر ایک کی صلاحیتوں اور مواقع کے مطابق مختلف ہے۔لیکن اگر ہم اپنے باطن میں روح کی زندگی رکھتے ہیں تو پھر ہم پر یہ امر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ کیا کچھ ہم نے کرنا ہے اور کیا کچھ سے ہم نے گریزاں رہنا ہے۔

ابدی اشیاء کے ساتھ تعلق جوڑ کر اور ملکوتی دنیا کے کسی جزو کو اپنی اس دکھ بھری دنیا میں لے آنے سے ہم ظلم و بربریت اور نفرت سے بوجھل اس دنیا میں بھی اپنی زندگیوں کو تخلیقی بنا سکتے ہیں۔ ملکیتی جذبوں پر مبنی سماج میں انفرادی زندگی کو تخلیقی بنانا مستقبل کے کسی بہتر معاشرے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہے۔دنیا کی تعمیر نو کا عمل شروع کرنے والوں کو طرح طرح کے دکھ سہنے پڑیں گے۔ان کو تنہائی، مخالفت، غربت اور لوگوں کو لعن طعن برداشت کرنی پڑے گی۔ان لوگوں کو معقول اور نا قابل شکست امید کے ساتھ سچائی اور محبت کی زندگی گزارنی ہوگی۔ان کو دیانتدار، دانا اور نڈر بننا ہوگا۔اور ایک مسلسل مقصد سے رہنمائی پانی ہوگی۔اس عظیم الشان کام پر آمادہ ہونے والے مردوں اور عورتوں کو سب سے پہلے اپنی انفرادی زندگیوں کی مشکلات اور پریشانیوں پر غلبہ پانا ہو گا۔اس کے بعد وقت کے ساتھ یا شاید یوں کہیے کہ طویل مدت کی جدوجہد کے ذریعے بیرونی دنیا پر غالب آنا ہوگا۔ دنیا کو دانش اور امید کی ضرورت ہے۔ بے شک وہ ان دونوں کے خلاف برسر پیکار رہتی ہے لیکن آخر کار ان کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔

وحشی گاتھوں نے جب روم کو تاخت و تاراج کیا تھا تو سینٹ آگسٹائن نے ''خدا کی بستی'' لکھی تھی۔یوں اس نے تباہ و برباد کر دی جانے والی مادی حقیقت میں ایک روحانی امید بھر دی تھی۔روم تو خستہ و خراب جھونپڑیوں کا ایک گاؤں بن کر رہ گیا لیکن آنے والی صدیوں میں سینٹ آگسٹائن کی امید زندہ رہی اور زندگی عطا کرتی رہی۔ ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم ایک امید تخلیق کریں اور آج کی بربادی کی طرف لڑھکتی دنیا سے بہتر دنیا اپنے خیالوں کے ذریعے بنائیں۔ حالات چونکہ زیادہ ہی خراب ہیں اس لیے ہمیں عام حالات کے مقابلے میں زیادہ جدوجہد کرنی ہوگی۔فقط فکر و روح کی عظیم الشان آگ ہی آنے والی نسلوں کو اس موت سے بچا سکتی ہے جو اس نسل کو نگل چکی جس کو ہم جانتے تھے اور جس سے پیار کرتے تھے۔

خوش بختی سے مجھے استاد کے طور پر کئی مختلف قوموں کے نوجوانوں سے میل ملاپ کے مواقع ملے ہیں۔ان نوجوانوں میں امید کی آگ روشن تھی اور تخلیقی توانائی بھی موجود تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے خوابوں کے کچھ نہ کچھ حصے کو ضرور عملی روپ دے سکتے ہیں۔ان کو جنگ میں جھونک دیا

گیا ہے بعض ایک طرف ہیں اور بعض دوسری طرف۔ ان میں سے بعض اب بھی برسرِ پیکار ہیں جبکہ بعض زندگی بھر کے لیے اپاہج ہو گئے ہیں اور بعض موت کا لقمہ بن چکے ہیں۔ بچ جانے والوں کے بارے میں خدشہ ہے کہ ان میں سے بہت سے نوجوان روح کی زندگی سے محروم ہو جائیں گے اور ان کی امیدیں اور ان کے خواب دم توڑ دیں گے۔ توانائی ضائع ہو جائے گی اور ان کے آنے والے ماہ و سال محض قبر کی طرف اکتا دینے والا سفر ثابت ہوں گے۔

اس عظیم انسانی المیے سے اکثر استاد بے نیاز دکھائی دیتے ہیں۔ بے درد منطق کے ذریعے وہ ثابت کرتے ہیں کہ ان نوجوانوں نے کسی بے مہر اور بے حس تجریدی آدرش کے لیے طور پر جانوں کے نذرانے دیئے ہیں۔ ان پر کبھی احساس کا لمحاتی حملہ ہوتا بھی ہے تو وہ فوراً ان نوجوانوں کو شہید کا درجہ دے کر سنبھل جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی رُوح مر چکی ہے۔ ان کی رُوح زندہ ہوتی تو وہ ماں باپ جیسی محبت کی بے قراری کے ساتھ نکل کر ان نوجوانوں کی رُوح سے جا لپٹتی۔ من و تُو کے فاصلے مٹ جاتے۔ ان نوجوانوں کا المیہ اس بے قرار رُوح کا اپنا المیہ بن جاتا ہے۔ تب فضا میں کوئی چیخ اٹھتا...... ''نہیں...... یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سب کچھ جائز نہیں ہے...... شباب کی روشنیوں کو اس مکروہ طریقے سے بجھانا یا مدھم کرنا کسی طور جائز نہیں ہے۔ یہ ہم ہیں...... یہ ہم بزرگ ہیں جنہوں نے یہ گناہ کیا ہے۔ یہ ہم ہی ہیں جنہوں نے اپنے فاسق جذبوں، اپنی روحانی موت اور محبت کی زندگی گزارنے میں ناکامیوں کے سبب ان نوجوانوں کو میدانِ جنگ کی طرف دھکیلا تھا۔''

آیئے ہم اس موت سے باہر نکلیں، کیونکہ مردہ ہم ہیں نہ کہ وہ نوجوان جو ہمارے زندگی کے خوف کے سبب مارے گئے ہیں۔ ان کے بھوت ہم سے زیادہ زندگی کے حامل ہیں۔ انہوں نے آنے والے تمام وقتوں کے لیے ہم کو ندامت اور رُسوائی کا نشان بنا دیا ہے۔ ہم میں جان ڈالنے کے لیے ان کے مُردہ جسموں سے زندگی کی شعاعیں نکلنی چاہئیں۔



فکشن ہاؤس
کورشِ اعظم



ہیرلڈ لیم

انٹرویوز اور
تاثرات
ڈاکٹر مبارک علی

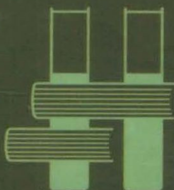
تاریخ کی آواز
ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ کی تلاش
ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس
شاہ عبداللطیف بھٹائی

سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ
ڈاکٹر مبارک علی





فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور